سلسلۂ عمومی دار المصنفین

(۱۴۷)

اردو زبان کی تمدنی اہمیت

اردو زبان میں ہندوستان کی تمدنی زندگی کے تمام شعبوں یعنی امور مملکت، زراعت، خورد و نوش، لباس، مکان، رسم و رواج، ان کے علاوہ اور تمام چیزوں میں جو الفاظ محاورات اور اسمار رائج ہیں، ان سب کی تفصیل اس میں پیش کی گئی ہے،

مؤلفہ

عبد الرزاق قریشی

رکن انجمن اسلام ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بمبئی

مطبع معارف دار المصنفین اعظم گڈھ طبع گردید

طبع بار اول — ۱۴۰۲ھ / ۱۹۸۲ء — کتبہ اقبال احمد

انتساب

بہ

اسم گرامی جناب شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم

سابق ناظم دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڈھ

پیش لفظ

جناب شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم سابق ناظم دارالمصنفین نے ہندوستانی اکیڈمی الٰہ آباد کی ایک کانفرنس میں "اردو زبان کی لسانی علمی اور تمدنی اہمیت" کے عنوان سے ایک مقالہ پڑھا تھا، جو کمیت کے لحاظ سے زیادہ طویل نہ تھا، لیکن اپنی کیفیت کی بنا پر مقبول ہوا، اور شوق سے پڑھا گیا، جناب عبدالرزاق قریشی مرحوم نے اس مقالہ سے پوری دلچسپی لی، اور انجمن اسلام بمبئی کی ملازمت کے زمانہ میں اس سے متاثر ہو کر علیحدہ علیحدہ ابواب قائم کر کے انجمن کے رسالہ نوائے ادب میں مضامین لکھنا شروع کئے، کچھ غیر مطبوعہ مسودہ ان کے پاس رہ گیا، اس کے کچھ اور ابواب لکھنا چاہتے تھے مگر لکھ نہ سکے، انجمن اسلام کی ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد دارالمصنفین میں رفیق کی حیثیت سے آنے کے لئے تیار ہو گئے تھے کہ یکایک جولائی ۱۹۷۷ء میں اللہ کو پیارے ہو گئے، مگر وصیت کر گئے کہ ان کے اور مسودوں کے ساتھ زیرِ نظر کتاب کا مسودہ بھی دارالمصنفین پہنچا دیا جائے جو نامکمل سہی لیکن یہ چھپ کر ناظرین کے ہاتھوں میں ہے۔

مصنف مرحوم کی پوری زندگی بمبئی میں گذری لیکن ہاتھ میں قلم پکڑ لیتے تو معلوم ہوتا کہ دارالمصنفین میں بیٹھ کر سب کچھ قلمبند کر رہے ہیں، ان کا طرزِ تحریر بالکل دبستانِ شبلی ہی کے رنگ کا ہے، اس لئے امید ہے کہ یہ کتاب بھی اسی دلچسپی سے پڑھی جائے گی جس طرح ان کی کتاب "مرزا مظہر جانجاناں اور ان کا کلام" پڑھی

گئی ہے جو دار المصنفین ہی سے پہلے شائع ہو چکی ہے،

اس کتاب کا ہر باب بظاہر خشک معلوم ہوگا، لیکن اس کے تحت جو دلچسپ اور مفید معلومات ہیں، ان کے مطالعہ سے اندازہ ہوگا کہ پوری کتاب میں وہ سب کچھ ہے جو پہلے سے معلوم تھا اور وہ بھی ہے جو معلوم نہ تھا، بعض اصطلاحات اور روزمرے تو ناظرین کو بالکل نئے معلوم ہونگے، اگر مصنف مرحوم سے بعض اصطلاحات کے سمجھنے میں تسامح ہو گیا ہو، تو اس سے ناظرین ضرور مطلع کریں، آیندہ اڈیشن میں اس کی تصحیح کر دی جائے گی،

اس کتاب کی تمام اصطلاحات کے مطالعہ سے اردو بولنے والوں خصوصاً مسلمانوں کی تمدنی اور تہذیبی زندگی کا نقشہ سامنے آجاتا ہے، بعض الفاظ کو ہم اب روزانہ استعمال کرتے ہیں، ان کی اصلیت معلوم کر کے حیرت ہوگی، مثلاً لفظ گھٹیا کا استعمال عام ہے، اس کتاب سے معلوم ہوا کہ گھٹیا سور کا بچہ کہلاتا ہے، اسی طرح یہ معلوم کر کے تعجب ہوا کہ بیوہ کے لئے ناس یا سہاگن، نہایت کامیاب کے لئے بخت آور، قمارخانہ یا قید خانہ کے لئے پنڈت خانہ، ولد الزنا کے لئے ثالث بالخیر، چور گرہ کٹ کے لئے صبح خیزی، طوائف اور ارباب نشاط کے لئے گل والا آموں کے بڑے باغ کے لئے امریا اور خربوزے کے بڑے کھیت کے لئے فالیز کی اصطلاحات ہیں، مگر ان کے حوالے نہیں دیئے گئے ہیں، کسی زمانہ میں یہ مستعمل رہی ہوں، مگر اب استعمال میں غالباً نہیں ہیں، اردو سے قریبی تعلق رکھنے والے شہروں اور محلوں کے نام میں مینا نگر، سیتا پور، پھول پور، سبزی منڈی، دال منڈی، اور مہا لکشمی وغیرہ جیسے نام نہ آنا چاہئے تھا، عرفہ کے متعلق لکھا گیا ہے کہ شب برات کے پہلے دن کو عرفہ کہتے ہیں، (ص ۲۰۲) لیکن بعض جگہوں پر مسلمانوں کے ہر تہوار خصوصاً بقر عید کے ایک روز پہلے کو عرفہ ہی کہا جاتا ہے، اس کی تائید فرہنگ آصفیہ سے بھی ہوگی،

لیتھو کی چھپائی میں طباعت کی کچھ نہ کچھ غلطیاں ضرور رہ جاتی ہیں، اس کتاب میں بھی کچھ

غلطیاں رہ گئی ہیں، ناظرین اپنے ذوق سے اُن کی تصحیح کرلیں، ایسی کچھ غلطیوں کی طرف اس وقت بھی توجہ دلانا مناسب ہوگا، ص ۹ ۳۴ کی سطر ، میں ہارون رشید کے بجائے مامون رشید، ص ۲۷۱ سطر ، میں لنگوٹی پر بھاگ کھیلنا کے بجائے لنگوٹی پر بھاگ کھیلنا، ص ۲۰۶ پر توہمات کی بنیا کے بجائے توہمات کی بنیاد ہونی چاہئے،

مصنف مرحوم کی وصیت کے مطابق اس کتاب کا انتساب جناب شاہ معین الدین احمد ندوی کے اسم گرامی سے کیا گیا ہے،

مُصنّف مرحوم اب وہاں ہیں جہاں ایک روز سب کو جانا ہے، وہ اس قابلِ قدر تصنیف میں اپنی محنت اور تحقیق کی داد تو نہیں سُن سکیں گے لیکن ناظرین اُن کی اس اچھی اور مفید علمی کاوش کے کسی حصہ کو پڑھ کر محظوظ ہوئے تو وہی اُن کی محنت کا اصلی صلہ ہوگا، جس کے بعد وہ اُن کے ایصالِ ثواب کی دعاؤں کے ضرور مستحق ہوں گے، اگر ناظرین کو ان کے حالات زندگی معلوم کرنے کا اشتیاق ہو تو ان کی کتاب "مظہر جانِ جاناں اور ان کا کلام" کے شروع کے اوراق میں مل جائیں گے،

ہیچمداں

سید صباح الدین عبدالرحمٰن

دارالمصنفین شبلی اکیڈمی،
اعظم گڈھ

۷ر ستمبر ۱۹۸۲ء

فہرست مضامین

اردو زبان کی تمدنی اہمیت

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

امور مملکت

مسلمان ہندوستان میں وارد ہوئے تو اپنے ساتھ ایک بلند تمدن اور اعلیٰ درجے کی تہذیب جسے عرب کی سادگی اور عجم کی نفاست کا مجموعہ کہا جا سکتا ہے، لے کر آئے، لیکن اس ملک میں بس جانے کے بعد انھوں نے ہندوستانی تہذیب و تمدن کا بھی اثر قبول کیا۔ مسلمانوں کے ہندوستان میں آباد ہو جانے اور اہل ہند سے ان کا میل جول ہونے کے بعد ایک نئی تہذیب وجود میں آئی، جسے ہندوستانی تہذیب کہنا غلط نہ ہوگا، اس تہذیب کو مسلمانوں نے اس حد تک اپنایا کہ زندگی کا کوئی شعبہ اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا، لباس میں، کھانے پینے میں ملنے جلنے میں تو فطری طور پر طرفین ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے اور ایک دوسرے کا اثر قبول کرتے ہیں، چنانچہ یہ اثر آج بھی دیکھا جا سکتا ہے، شادی بیاہ کے معاملے میں بھی اس نئی تہذیب کا اثر مسلمانوں پر بہت پڑا ہندوستان کے بعض علاقوں میں تو یہ حالت ہے کہ نکاح کے سوا اکثر و بیشتر رسمیں ہندوانہ ہیں، مغلیہ سلطنت کے زوال کے ساتھ ساتھ ہندوستان میں ایک نئی تہذیب وجود میں آ رہی تھی، جسے نوابان اودھ کے دربار میں خصوصاً عروج حاصل ہوا، انگریزوں کی ہندوستان میں آمد اور پھر حکومت قائم ہونے کے بعد ہماری ہندوستانی تہذیب پر مغربی تہذیب اثر انداز ہوئی، اور سرعت کے ساتھ ساتھ مستحکم طریقے پر اثر انداز

ہوئی، آئین کشور رانی بدلا، طرز معاشرت بدلی، نظام تعلیم بدلا، مختصر یہ کہ پورا نظام زندگی بدل گیا، انگریزوں کی حکومت اب ہندوستان میں نہیں رہی، لیکن انگریزی تہذیب و تمدن کے اثرات آج بھی باقی ہیں اور آئندہ بھی باقی رہیں گے، کیونکہ ہندوستانی تہذیب و تمدن نے انھیں اپنے اندر جذب کرلیا ہے، تہذیب و تمدن کے ان تمام مدارج کا عکس اردو زبان میں نمایاں طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔

اردو کا حقیقی نشو و نما اور اس کی ترقی کا زمانہ مغلوں کا دور انحطاط ہے، لیکن وہ سلاطین کے دور حکومت، عہد مغلیہ (زمانۂ عروج) اور قدیم ہندوستان کی تہذیب و تمدن کے عکس سے بھی خالی نہیں ہے، اس طرح سے عربی، فارسی، ترکی اور ہندی کے تمدنی الفاظ کا جس قدر ذخیرہ تیموریوں کے زمانے میں تھا، وہ سب اردو میں منتقل ہوگیا۔[1] آگے چل کر ہندوستان میں انگریزی حکومت کے قیام کے بعد اس ذخیرے میں انگریزی الفاظ کا اضافہ ہوا، اردو کے تمدنی الفاظ کے سلسلے میں مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی نے صحیح کہا ہے کہ

"روزانہ کی معاشرت، بول چال اور رسم و رواج کے بیشتر الفاظ ہندی ہیں، لیکن تمدنی الفاظ عربی اور فارسی کے زیادہ ہیں، جو بالکل قدرتی ہے، اس لئے کہ ہندوستان میں جو اسلامی تمدن آیا وہ صدیوں کا ترقی یافتہ اور بڑی عظیم الشان اور متمدن حکومتوں کا ساختہ پرداختہ تھا، اس لئے ہندوستانی تمدن کے مقابلے میں قدرتاً اس میں تمدنی الفاظ کا ذخیرہ زیادہ تھا، جس طرح آج مغربی تمدن کے سیکڑوں بلکہ ہزاروں انگریزی الفاظ و اصطلاحات جن کا بدل ہندوستانی زبان میں نہیں ہے، اس میں رائج ہوگئے ہیں۔"[2]

---

[1] اردو زبان کی لسانی، علمی اور تمدنی اہمیت، ادبی نقوش، ص ۳۳۵، [2] ایضاً ص ۳۶-۳۳۵، از مولانا شاہ معین الدین ندوی،

نظامِ حکومت:

نظامِ حکومت تمدنی زندگی کے ایوان کا اہم ترین ستون ہے، کیوں کہ اسی کی عمدگی اور استحکام پر دوسرے ستونوں کی عمدگی اور استحکام کا انحصار ہے، جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے، مسلمان ہندوستان میں آئے تو اپنے ساتھ ایک بلند تمدن لے کر آئے، جو ایران کے پختہ اور اسلام کے ترقی پسند تمدن سے مل کر بنا تھا، اس لئے وہ جامع اور ترقی یافتہ تھا، مسلمان بادشاہوں کے نظامِ حکومت میں دربار کو بڑی اہمیت حاصل تھی، اور چونکہ پورے نظام کا مرکز وہی تھا، اس لئے پہلے اسی کا ذکر کیا جاتا ہے

دربار:

اسلامی تمدن یا طرزِ حکومت میں دربار کو کوئی جگہ حاصل نہ تھی، خلفائے راشدینؓ کا جس طرح کوئی محل نہ تھا، اسی طرح کوئی دربار بھی نہ تھا، اکثر مسجدِ نبویؐ میں مجلسِ مشاورت ہوا کرتی تھی، لیکن جب خلافت کی جگہ ملوکیت نے لے لی، تو سادگی کی جگہ نمود و نمائش آگئی، ایران کے جمالیاتی ذوق نے اس میں رنگ رنگ کی گلکاریاں کیں، اور شوکت و حشمت کے ساتھ ساتھ دربار میں سازِ آرائش و آرائش بھی داخل ہو گئی، ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں کے دربار بھی شان و شوکت اور سطوت و حشمت میں ایران، بغداد وغیرہ کے درباروں سے کم نہ تھے، دربار کے تعلق سے جو الفاظ سلاطینِ دہلی اور شاہانِ مغلیہ کے عہد میں فارسی میں استعمال ہوتے تھے، ان میں سے اکثر اردو میں بھی استعمال ہونے لگے، ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے تمدنی جلوے کے مصنف نے دربار کا جو نقشہ کھینچا ہے، اس میں وہ تمام الفاظ آ گئے ہیں، اسے اختصار کے ساتھ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے،

سلطان تخت پر بیٹھتا، اس کے سر پر چتر ہوتا، چتر کے اوپر سایہ گستر لگا ہوتا، تخت کے

بغل میں دورباش رکھا رہتا، یہ گویا شاہی عصا تھا، تخت کے پیچھے سلاحدار، جاندار، سہم الحشم نائب سہم الحشم کھڑے رہتے، سلاحدار سے مراد ہتھیار بند محافظ ہیں، وہ سلطان کے اسلحے کے بھی نگراں ہوتے اور دربار میں اس کے پیچھے کھڑے رہتے یا جب سلطان کی سواری باہر نکلتی تو وہ ساتھ ساتھ ہوتے، ان کا نگراں سر سلاحدار کہلاتا، سلطان کی حفاظت کے لئے کچھ توانا و تندرست لشکری بھی ہوتے، انھیں جاندار کہا جاتا تھا، ان کا نگراں سر جاندار کہلاتا۔ جاندار گھوڑے پر سوار رہتے، پیدل محافظ سہم الحشم کہلاتے، دربار میں یہ سب بھی تخت کے پیچھے ہوتے، ان کے مددگار نائب سہم الحشم کہلاتے،

دربار کا سب سے اہم رکن امیر حاجب ہوتا۔ اسے باربک بھی کہا جاتا تھا، امراء کی جگہیں ان کے مراتب کے مطابق مقرر کرنا اس کے ذمے ہوتا، اس کی مدد کے لئے نائب امیر حاجب ہوتے، سلطان کسی درباری سے کچھ کہنا چاہتا تو امیر حاجب سے کہتا، سلطان کے سامنے درخواستیں امیر حاجب ہی کے ذریعے پیش ہوتیں، وہ ان کو بلند آواز سے پڑھ کر سناتا۔ سلطان کوئی فیصلہ دیتا تو اس کو قلمبند کر لیا جاتا، دوات دار کاغذ، قلم اور روشنائی لئے حاضر رہتا، اس فیصلے پر مہر دار شاہی مہر لگا دیتا، اس کے بعد درخواستیں دبیر خاص کے حوالے کر دی جاتیں،

شحنۂ بارگاہ دربار کی زینت و آرائش کا ذمے دار ہوتا، نقیب اور چاؤش جابجا کھڑے رہتے اور جب کسی کو سلطان کی خدمت میں پیش کیا جاتا، تو وہ بسم اللہ زور سے کہتا، جب کوئی دربار میں آتا تو سلطان کے تخت کے پاس آکر زمین پر سر رکھ کر تین بار زمین بوسی کرتا، اس کو تعظیم بجا لانا کہتے، علماء، صلحاء، اور مشائخ زمین بوسی سے مستثنیٰ ہوتے،

دروازے پر منقدی بیٹھے رہتے، پہلے آنے والے کا نام روزنامچہ میں لکھا جاتا، پھر وہ دربار میں جاتا[1]

---

[1] سید صباح الدین عبد الرحمٰن، ہندوستان کے سلمان حکمرانوں کے تمدنی جلوے، ص ۱۰۵

ہمایوں نے تنظیم کے سلسلے میں اپنے دربار میں ایک جدت کی، اس نے کورنش اور تسلیم کے رواج کی ابتدا کی جو نوابان اودھ کے عہد میں لکھنؤ کی تہذیب کا ایک اہم جز بن گئی۔ کورنش میں ہتھیلی کو پیشانی پر رکھ کر سر جھکاتے اور تسلیم میں دائیں ہاتھ کی پشت کو زمین پر رکھ کر آہستہ سے اس کو اٹھاتے اور سیدھے کھڑے ہو کر ہتھیلی کو سر پر رکھتے، اس کی ابتدا کے متعلق ابوالفضل نے خود اکبر کی زبانی لکھا ہے کہ ایک دن "جہانبانی جنت آشیانی نے مجھے تاج خاص عنایت کیا، میں نے اسے سر پر رکھا تو وہ کافی بڑا تھا، اس لئے میں نے اسے ہاتھوں سے پکڑ لیا اور سر جھکایا، بادشاہ کو یہ نیا انداز بہت پسند آیا اور انھوں نے کورنش و تسلیم کا یہی طریقہ مقرر کر دیا"[1]

وہ مقام جہاں کھڑے ہو کر بادشاہ کو سلام کیا جاتا، آداب گاہ کہلاتا تھا۔

اوپر لکھا جا چکا ہے کہ ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں کے دربار سطوت وحشمت میں ایک ممتاز حیثیت رکھتے تھے، اکبری مؤرخ نے شکوہ دربار کے لئے چار چیزوں کو ضروری قرار دیا ہے، اورنگ، چتر، سائبان اور کوکبہ[2]

مذکورہ بالا الفاظ میں سے اکثر نہ صرف اردو نثر میں بلکہ نظم میں بھی استعمال ہوتے رہتے ہیں۔ نیچے چند شعری مثالیں دی جاتی ہیں:-

وہ چتر کے زیر سایہ بیٹھے — افسر سب پایہ پایہ بیٹھے (دیا شنکر نسیم)
نقیبوں کو بلوا کے یہ کہہ دیا — کہ نقار خانے میں دو حکم، جا (میر حسن)
چاؤش یہ دیتے تھے صدا دمبدم آگے — سرباز و، بڑھے جاؤ، قدم با قدم آگے (دبیر)
پھیلے ہوئے دورباش ادب کی — طوبیٰ و بہشت، عرش و کرسی کا تحفہ کورنش (؟)

---

[1] آئین اکبری، آئین کورنش، ص ۱۰۰ [2] ایضاً، آئین شکوہ سلطنت، ص ۲۹۔

میں ہوں کیا خاک نشین موضعیت — کر دیا موت نے اورنگِ سلیماں خالی۔ (ناسخ)

مہرداروں میں ہے دربار کے گر نامِ عقیق — آبداروں میں ہے سرکار کے اونا گوہر (ذوق)

فقط اک جذبۂ قومی انھیں یاں کھینچ لایا ہے

جہاں زورِ حکومت ہے نہ حاجب ہیں نہ درباں ہیں (شبلی)

کیونکر ہو باغ جانا اس میرزا منش کا

واں سرو میں نہیں ہے آداب کورنش کا (سودا)

طرزِ نظامت:

ہندوستان ایک وسیع ملک ہے، مسلمانوں کی آمد سے پہلے یہ مختلف ٹکڑوں میں بٹا ہوا تھا، اور مختلف راجا ان پر راج کرتے تھے۔ مسلمانوں کی حکومت قائم ہوئی تو ملک کے اکثر حصے ایک ایک کر کے دہلی کے زیرِ نگیں آگئے، اکبر کے عہد میں ملک کا بیشتر حصہ سلطنت مغلیہ کی حدود میں شامل ہو گیا، نظامِ حکومت کی عمدگی اور استحکامِ سلطنت کے لئے، نیز رعایا کی فلاح و بہبودگی خاطر اسے مختلف حصوں میں اور پھر ہر حصے کو مزید چھوٹے چھوٹے حصوں میں تقسیم کیا گیا، اس راہ سے بہت سے الفاظ ہندوستان کی تمدنی زندگی میں داخل ہوئے، ان میں سے اکثر اردو میں بھی استعمال ہونے لگے اور آج تک ان کا سکہ چل رہا ہے، مثلاً صوبہ، ضلع، تحصیل، پرگنہ، تپہ، ناظم صوبہ، صوبہ دار، تحصیلدار، نائب تحصیلدار، حاکم پرگنہ، خزانہ، محافظ خزانہ، مال خانہ، جاگیر، ریاست، جاگیردار، سربراہ کار، ذیل دار، مدار المہام، دیوان وغیرہ۔

۱۸۵۷ء میں جب مغلیہ سلطنت کو زوال آگیا، اور ہندوستان میں انگریزوں کی حکومت قائم ہوئی، تو انگریزی تہذیب و تمدن کا نفوذ لازمی تھا، اس کے اثر سے زندگی کے ہر شعبے میں انگریزی اور دوسری مغربی زبانوں کے الفاظ کثرت سے داخل ہونے لگے، مثلاً

نظامِ حکومت کے سلسلے میں مندرجہ ذیل الفاظ اردو میں عام طور پر استعمال ہونے لگے اور ان کی جڑیں اتنی مضبوط ہو چکی ہیں کہ اب وہ اردو زبان کے الفاظ بن گئے ہیں،

گورنمنٹ، پارلیمنٹ، اسمبلی، لیجسلیٹو کاؤنسل، کانسٹی ٹیوشن، پالیسی، سیشن، بجٹ، وائسرائے، گورنر جنرل، گورنر، لفٹننٹ گورنر، اے ڈی کانگ (اے، ڈی، سی) رزیڈنٹ، رزیڈنسی، کمشنری، کمشنر، ڈپٹی کمشنر، کلکٹری، کلکٹر، ڈپٹی کلکٹر، سکریٹری، کمیشن، میمورنڈم وغیرہ۔

پارلیمنٹ اور اسمبلی کی مناسبت سے بھی بہت سے انگریزی الفاظ اردو میں داخل ہوئے، جیسے اسپیکر، ڈپٹی اسپیکر، مارشل، رولنگ، ممبر، الکشن، الکشن آفیسر، ووٹ، پروپگنڈہ، پول، پولنگ بوتھ، پارٹی، اپوزیشن، اپوزیشن پارٹی وغیرہ۔

۱۹۴۷ء میں ہندوستان انگریزوں کی غلامی سے آزاد ہو گیا اور ملک میں جمہوری حکومت کا قیام ہوا، ہندی ہندوستان کی قومی زبان قرار پائی، حالانکہ حقیقت میں اس اعزاز کی مستحق اردو تھی، کیونکہ وہی ملک میں سب سے زیادہ بولی اور سمجھی جانے والی زبان تھی، لیکن سیاسی عصبیت حقائق کو ٹھکرا دیا کرتی ہے، جب ہندی یہاں کی قومی زبان قرار پائی اور اس کا دخل حکومت میں ہو گیا تو نئے نئے ہندی الفاظ ہمارے خزانے میں جگہ پانے لگے، اردو نے ان میں سے متعدد لفظوں کو فراخدلی سے اپنے دامن میں جگہ دی، مثلاً، یہ الفاظ اردو کے لئے اجنبی نہیں رہے،

لوک سبھا، راجیہ سبھا، ودھان سبھا، منتری، مکھیہ منتری، پردھان منتری، راشٹرپتی، سبھاپتی، راج بھون، جنتا، نیتا وغیرہ،

انگریزوں کے خلاف اہلِ ہند نے جو جنگِ آزادی شروع کی اور جس میں بالآخر

وہ کامیاب ہوئے اس کی مناسبت سے بھی بہت سے الفاظ کا اردو میں اضافہ ہوا۔ "انقلاب زندہ باد" کا نعرہ اسی زمانے کی یادگار ہے، جسے آج بھی استعمال کیا جاتا ہے، حکومت خود اختیاری، عدم تعاون، ترک موالات، سودیشی تحریک، احرار، جمہوریت، اشتراکیت، سامراجیت وغیرہ اردو تحریر و تقریر میں برابر استعمال ہوتے تھے اور آج بھی مستعمل ہیں، چند انگریزی الفاظ بھی اسی حوصلہ آزما دور کی یادگار ہیں، مثلاً لیڈر، ریزولیوشن، پالیسی، ڈپلومیسی، بیورو، کریسی، ہوم رول، سلف گورنمنٹ، کمیشن، بائیکاٹ، نان کوآپریشن، لبرل، والنٹیئر، پالٹکس، پولٹیکل ایجیٹیشن، امپیریلزم، ڈکٹیٹر، ڈکٹیٹر شپ، فاشیزم، فاشسٹ، رفارم وغیرہ، ان لفظوں میں سے اکثر اردو زبان میں کچھ اس طرح جذب ہو گئے ہیں کہ اب اردو الفاظ معلوم ہوتے ہیں، تقریر کے علاوہ نثاروں اور شاعروں نے بھی ان الفاظ کو اپنی تحریروں اور شعروں میں استعمال کیا ہے، مثلاً

"بعض لوگوں کا یہ خیال کہ پولٹیکل ایجیٹیشن سے کوئی فائدہ نہیں، حقیقت سے بہت دور ہے۔" (حسرت)

"ہندوستانی خوب سمجھتے ہیں کہ تھوڑے دنوں سے بعض مدبرین سلطنت کی پالیسی پھر بدلی ہے۔" (مولانا شبلی)

"موجودہ گورنمنٹ محض ایک ناجائز بیوروکریسی ہے۔" (مولانا ابوالکلام آزاد)

"گورنمنٹ نے کراچی رزولیوشن کو جرم قرار دیا۔" (ایضاً)

"ڈائر کے جسم میں امپیریلزم (سامراج) کی روح تھی۔" (مولانا محمد علی)

"ہم کو انگریزی الفاظ سے بھی نان کوآپریشن کی حاجت نہیں ہے۔" (منشی دیانرائن نگم)

رنج لیڈر کو بہت ہیں مگر آرام کے ساتھ
قوم کے غم میں ڈنر کھاتے ہیں حکام کے ساتھ
(اکبر)

رزولیوشن کی شورش ہے مگر اس کا اثر غائب | پلیٹوں کی صدا سنتا ہوں اور کھانا نہیں آتا
تقلیل غذا میں ہو پیرمنٹ یہی ہے | گر ضبط ہوس، سلف گورنمنٹ یہی ہے (اکبر)
آپ لبرل جو نہیں ہیں تو بجا ہے نہ سہی | یاں کسی کو طلب افسری و رنگ نہیں (اکبر)
زمیں سے عرش تلک شور ہوم رول کا ہے | شباب قوم کا ہے، زور ہوم رول کا ہے (شبلی)

چکبست نے "وطن کا راگ" کے عنوان سے مسدس کی شکل میں ایک نظم لکھی تھی، جس میں ٹیپ کا شعر ہے:

طلب فضول ہے کانٹے کی پھول کے بدلے | نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رول کے بدلے (چکبست)

دفتر:

نظامِ حکومت کے سلسلے میں دفتر کی اہمیت مسلم ہے، اس کی عمدگی پر حکومت کا استحکام اور ملک اور رعایا کی فلاح اور بہبود کا بڑا انحصار ہے، سلاطینِ دہلی اور شہنشاہانِ مغل کے زمانے میں یگانۂ روزگار دبیر ہوتے تھے، صاحبِ فضل و کمال منشی ہوتے تھے، ماہر محاسب ہوتے تھے، بخشی اور میر بخشی ہوتے تھے، مُشرف ہوتے تھے، عرض بیگی ہوتے تھے، کام میں سہولت اور نظامِ حکومت میں عمدگی پیدا کرنے کے لئے مختلف شعبے اور محکمے بنائے گئے تھے، مثلاً، دفترِ (دیوان) وزارت، دفترِ خزانۂ مصارف، دفترِ دیوانی، دفترِ بیت الانشاء (دیوانِ انشاء) دفترِ بیت الاجراء، محکمۂ آبکاری، محکمۂ صدر امانت وغیرہ، جب انقلاب زمانہ سے انگریز ہندوستان کے حکمراں ہو گئے، تو دفتر کا نقشہ بھی بدل گیا، اب سکریٹریٹ قائم ہوا، جو مختلف شعبوں میں منقسم تھا، مثلاً شعبۂ مالیات، شعبۂ دفاع، شعبۂ تعلیم وغیرہ، اس سلسلے کے بہت سے انگریزی الفاظ اپنی اصلی شکل میں اردو میں استعمال ہونے لگے، جیسے ڈپارٹمنٹ، آفس کلرک، ہیڈ کلرک، اکاؤنٹنٹ، چیف اکاؤنٹنٹ، کیشیر، کاؤنٹر، ٹائپسٹ، سکریٹری،

پی، اے، پرسنل اسسٹنٹ، پیون وغیرہ، دفتر کی مناسبت سے فائل، پن، کلپ وغیرہ بھی اردو میں مستعمل ہیں،

خطابات:

ہر ملک اور ہر قوم میں برگزیدہ اور اہم شخصیتوں کی قدر دانی اور ہمت افزائی کی خاطر حکومت وقت کی طرف سے خطابات دینے کا رواج رہا ہے، مسلمانوں کے عہد میں مخصوص خطابات جیسے منعم خاں، طالع یار خاں، امین الملک، معین الدولہ، یمین السلطنت وغیرہ کے علاوہ عموماً میر، میرزا، خواجہ، بیگ، خان، خان بہادر، رائے، رائے بہادر، راجا، نواب وغیرہ خطابات دئے جاتے تھے، انگریزی عہد میں خان، خان بہادر، رائے، رائے بہادر برقرار رہے، ان کے علاوہ سر، لارڈ، شمس العلماء وغیرہ خطابات کا اضافہ ہوا، آزادی کے بعد بھارت رتن، پدم وبھوشن، پدم بھوشن، پدم شری وغیرہ خطابات سے اہم شخصیتوں کو نوازا جانے لگا، لیکن یہ خطابات نام کے ساتھ استعمال نہیں کئے جاسکتے، اردو میں مذکورہ بالا خطابات کا استعمال پایا جاتا ہے،

عدالت اور قانون:

عدالت اور قانون کے بغیر نہ کوئی انتظام مستحکم ہو سکتا ہے اور نہ تمدن مکمل کہلانے کا مستحق، ہندوستان تقریباً ہر دور میں تمدن کے اعلیٰ مراتب کا حامل رہا ہے، اس لئے عدالت اور قانون کو یہاں ہمیشہ اہمیت حاصل رہی ہے، سلاطین دہلی اور شہنشاہانِ مغلیہ کے زمانے میں جو عدالتی اور قانونی الفاظ استعمال ہوتے تھے اور پھر ان کے بعد انگریزوں کے زمانہ میں عربی اور فارسی کے اثر سے جو الفاظ رہے ان میں سے اکثر آج تک اردو میں مروج ہیں مثلاً مندرجہ ذیل الفاظ:

عدالت، عدالت عالیہ، کچہری، منصفی، دیوانی، فوجداری، منصف، پیشکار، دستاویز، قبالہ، تمسک، مسل، مسل خوان، محرر، منشی، منصرم، ناظر، مدعی، مدعی علیہ، عرضی، دعوی، استغاثہ، وکیل، مختار، گواہ، پیشی، بجستہ، جرح، جرمانہ، ہرجانہ، ہتلوانہ، جیل خانہ، بندی خانہ، حبس دوام، بیع، بیعنامہ، رہن، رہن نامہ، فک رہن، اقرار نامہ، صلحنامہ، شفع، مکفول، عذرداری، بے دخلی، دخل یابی، تعلیقہ، قرقی، قرق امین، مچلکہ وغیرہ۔

عدالت اور قانون کی تکمیل پولیس کے محکمے کے بغیر نہیں ہوسکتی، اس میں اردو میں جو الفاظ مستعمل ہیں، ان میں سے چند یہ ہیں،

تھانہ، تھانیدار، داروغہ، نائب داروغہ، دیوان، جمعدار، کوتوال، کوتوالی، روزنامچہ، حوالدار، دفعہ دار، حوالات، چوکیدار، روانگی وغیرہ،

عدالت اور قانون کے ذیل میں کافی انگریزی الفاظ بھی اردو میں داخل ہوئے جیسے کورٹ، سسٹن کورٹ، ہائی کورٹ، سپریم کورٹ، سٹی سول کورٹ، اسمال کاز کورٹ، جج، سشن جج، چیف جسٹس، مجسٹریٹ، پریسیڈنسی مجسٹریٹ، آنریری مجسٹریٹ، بیرسٹر، سالیسیٹر، سمن، وارنٹ، ڈگری، ۱۰۷ ۱۰۹ اپیل، جیل، جیلر وغیرہ،

عدالت و قانون اور محکمۂ پولیس کا چولی دامن کا ساتھ ہے، اس لئے تنائی اللہ کر کے بھی انگریزی الفاظ اردو میں بڑی تعداد میں مستعمل ہیں، مثلاً پولیس، کانسٹبل، پولیس اسٹیشن، پولیس انسپکٹر، سپرنٹنڈنٹ آف پولیس (ایس پی، ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ آف پولیس، ڈی ایس پی، پولیس کمشنر، ڈپٹی پولیس کمشنر، انسپکٹر جنرل آف پولیس (آئی جی) ڈپٹی انسپکٹر جنرل آف پولیس (ڈی آئی جی)، سی آئی ڈی، رپورٹ، ریمانڈ وغیرہ۔

شہری نظام:

شہری نظام حکومت کا ایک اہم اور مفید شعبہ ہے، جو انگریزی حکومت کے ساتھ ہندوستان میں آیا، اس راہ سے بھی متعدد انگریزی الفاظ اردو میں داخل ہوئے، اور اس کا جزبن گئے جیسے کارپوریشن، میونسپلٹی، ڈسٹرکٹ بورڈ، لوکل بورڈ، کارپوریٹر، میونسپل کمشنر، کمیٹی، اسٹینڈنگ کمیٹی، میٹنگ، گٹر، پائپ، فائر بریگیڈ، فلش، پارک، میوزیم، ہیلتھ آفیسر، انجینیر، ہائڈرولک انجینیر، سینٹری انسپکٹر، میڈیکل سینٹر، میڈیکل آفیسر، الکٹریسٹی، میٹر وغیرہ،

جنگ اور سامانِ جنگ:

سلاطین اور کشور کشاؤں میں نزاعِ باہمی اور ملک گیری کی ہوس ہمیشہ سے رہی ہے، حقیقت یہ ہے کہ فوج کشی اور جنگ و جدال کشور رانی کے لوازم میں داخل رہے ہیں، ہندوستان اس سے مستثنیٰ نہیں تھا، مہابھارت سے لے کر ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی تک سیکڑوں لڑائیاں لڑی گئیں، ہندوستان کے میدانِ جنگ میں جو آلاتِ حرب استعمال ہوتے تھے، اُن میں سے اردو نے، برچھا، برچھی، بھالا، بلم، کرچ، پھینٹی، ڈھال، تلوار (تروار) سروہی، کٹار، جمدھر، کربھل، پھلم، بانا، بان، گوپھیا، کوٹھی، بکتر، انگرکھا وغیرہ لے لئے، خود مسلمان اپنے ساتھ شمشیر، تیغ، خنجر، دشنہ، قرولی، پیش قبض، تیر، کمان، ترکش، نیزہ، سنان، طپنچہ (طمنچہ) بندوق، تفنگ، قرابین، توپ، رہکلہ، منجنیق، توپ دان، دمدمہ، خود، سپر، جوشن، زرہ، دستوانہ، چار آئینہ، اسلحہ خانہ وغیرہ لائے، سپاہ، لشکر، فوج، رسالہ، سپاہی، لشکری، برقنداز، فوجی، سپہ سالار، کمیدان، جمعدار، منصب دار، ہراول، لشکر گاہ، خیمہ وغیرہ بھی مسلمانوں کے ساتھ آئے، یہ الفاظ اردو میں ضم ہو گئے، یورپی اقوام کے ساتھ پلٹن، بریڈ، بارک، کمان، کمانڈر، لفٹنٹ، کرنل، کپتان، کیمپ، گارڈ، ملٹری گارڈ، اردلی، کورٹ

مارشل، مارشل لا، رائفل، پستول، مشین گن، کارتوس، میگزین وغیرہ آئے، سائنس کی ترقی اور نئی نئی ایجادوں کے ذریعے بم، (بم گولہ)، بمبار، ہائیڈروجن بم، کیمانلاج، ٹینک، سائرن وغیرہ وجود میں آئے، یہ تمام الفاظ اردو میں مستعمل ہیں۔

جنگ میں استعمال ہونے والے اسلحوں میں بندوق کا استعمال ہمیشہ زیادہ رہا ہے، اس لئے اس کی کئی قسمیں ہیں، مثلاً

بھرمار بندوق، بے دھری، یک ضربی بندوق، دو ضربی بندوق، توڑے دار بندوق، فلیتے دار بندوق، چقماقی بندوق وغیرہ

بندوق کی نسبت سے بہت سی اصطلاحیں بھی ہیں، جن میں بعض بہت دلچسپ ہیں، جیسے مندرجہ ذیل اصطلاحیں،

پالکی، کارتوس والی بندوق کی نال کو کندے سے جوڑے رکھنے والی پتی جو لبلبی کے نیچے لگی رہتی ہے،

تخت، بندوق کی نال کی بیٹھک جو کندے کے منہ پر کسی ہوتی ہے۔

سنگھاڑا، بندوق کا مثلثی شکل کا لبوترا کندہ،

بھید، بندوق کی نال کا سوراخ،

تیر، بندوق کی نال،

کوٹھی، بندوق کی نال میں گولی بھرنے کی جگہ۔

رتھ کل، توپ کھینچنے کی گاڑی، مجازاً چھوٹی توپ کو بھی کہتے ہیں،

رائے، بندوقچیوں کے سردار کا خطاب،[۳]

---

[۱] ظفر الرحمٰن دہلوی، فرہنگ اصطلاحات پیشہ وراں، ج ہشتم [۲] ایضاً،

جنگ میں آلاتِ حرب کے ساتھ ساتھ باجے کی بھی ہمیشہ اہمیت رہی ہے، ہندوستان میں، سنکھ، گھنٹا، ڈھول، ڈنکا، نفیری، ترہی، کرنا، سرنا، سینگ وغیرہ استعمال ہوتے تھے، جنھیں اردو نے اپنا لیا، مسلمانوں کے ساتھ نقارہ، طبل، دہل، دمامہ، بوق، کوس، چنگ، قرنا وغیرہ آئے، اور اردو الفاظ بن گئے، یورپ کی فوجیں اپنے ساتھ بینڈ اور بگل لے آئیں، ان پر بھی اردو کا جامہ چڑھ گیا۔

ہر ملک والے ہر قوم میں امتیاز کی خاطر جھنڈے کا رواج رہا ہے، اردو میں اس کے لئے جھنڈے کے علاوہ رایت، علم، پرچم، نشان وغیرہ کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں،

فوج کی ترتیب مسلمانوں کے عہد میں اس طرح ہوتی تھی، کہ پہلے ہراول دستہ ہوتا، دائیں طرف کے لشکریوں کو میمنہ اور بائیں جانب کے فوجیوں کو میسرہ کہا جاتا تھا، درمیان میں جو سپاہ ہوتی اسے قلب کہتے تھے۔ اردو میں یہ اصطلاحات بعینہ مستعمل ہیں۔

ہندوستان میں بحری جنگیں بہت کم ہوئیں، اس لئے اس ضمن کے الفاظ کا ذخیرہ بھی اردو میں معمولی ہے، جنگی کشتیوں کو نواڑا کہا جاتا تھا، جنگی جہاز کا سب سے بڑا افسر امیر البحر، کہلاتا تھا، اس کے علاوہ دوسرے عہدیدار اور ملازم، ناخدا، معلم، سندیل، خلاصی بھنڈاری وغیرہ تھے، یہ الفاظ اردو میں آج بھی کبھی کبھی استعمال ہوتے ہیں، انگریزی الفاظ نیوی، ایڈمیرل، وائس ایڈمیرل لفٹننٹ، کپتان، لائف بلٹ وغیرہ اردو میں ضم ہو چکے ہیں،

جنگ کے ضمن میں جو الفاظ اوپر نقل کئے گئے ہیں، ان میں سے بہت سے نظم میں بھی استعمال ہوئے ہیں، مثلاً،

یہ قبا کس کی ہے؟ بتلاؤ یہ کس کی دستار؟ | یہ زرہ کس کی ہے پہنے ہوں جو میں سینہ فگار؟
بر میں کس کا ہے یہ چار آئینۂ جوہردار؟ | کس کا رہوار ہے یہ آج میں جس پر ہوں سوار؟
کس کا یہ خود ہے؟ یہ تیغِ دو سر کس کی ہے؟ | کس جری کی یہ کماں ہے؟ یہ سپر کس کی ہے؟

(انیس)

لو سنو تیغ و سناں کی داستاں روایت و طبل و نشاں کی

بچے جن کی تفنگوں سے ننھے ننھے بچے بھی ہے گیا تہذیبِ مغرب کا انکے بارے میں؟ (شبلی)

یہ ٹمینک، توپ، یہ بمبار، آگ بند وقیں کہاں سے لائے ہو؟ کس کی طرف ہے رخ ان کا (ظفر علی خاں)

بوق و قرنا کا بار بار اک غل شور نقارہ و صدائے دہل (سردار جعفری)

توپیں جو داغتے تھے فتیلوں سے آن آن رنجک مثالِ برق بہ جھکتی تھی بار بار (تعشق)

مندرجۂ بالا سامانِ جنگ میں سے بعض چیزیں رزم گاہ سے نکل کر ہماری بزم میں بھی داخل (میر تقی میر)
ہو گئیں، ان کی بنیاد پر محاورے بھی بنے اور مثلیں بھی وجود میں آئیں، چند محاورے اور مثلیں نیچے
مثالاً دی جاتی ہیں۔

محاورے:

کڑی کمان کا تیر، تیغِ بے نیام ہونا، ڈھال بننا، سینہ سپر ہونا، ڈنکا بجنا، ڈنکے کی چوٹ
بات کہنا وغیرہ،

مثلیں:

ع، جو تیر کماں سے چھوٹ چکے وہ کس کے پھیرے پھرتے ہیں،

ع، جہاں بجتے ہیں نقارے وہیں ماتم بھی ہوتے ہیں،

ع، زبانِ خلق کو نقارۂ خدا سمجھو،

تلوار تو ٹوٹ پڑی، پنجہ کاٹ کر گیا، لگ جائے تو تیر نہیں تو تکا وغیرہ،

زراعت و تجارت

ہندوستان ایک زراعتی ملک ہے، اور دہقان اور دہقانیت کا نظام تمدن سے گہرا تعلق ہے، مغل بادشاہوں کے عہد میں اس سلسلے کے بہت سے الفاظ وجود میں آئے، ان کا استعمال اردو میں بھی ہونے لگا، انگریزی حکومت کے قیام کے بعد بہت سے نئے الفاظ عربی و فارسی کی مدد سے بنائے گئے، وہ بھی اردو میں مستعمل ہیں، نیچے اس قسم کے الفاظ کی چند مثالیں دی جاتی ہیں،

زمیندار، نمبردار، کاشتکار، اراضی کاشتکار، کاشت، خود کاشت، سیر، شکمی، تملیک نامہ، پٹا، پٹا دوامی، مزروعہ، غیر مزروعہ، ربیع، خریف، پیمایش، بندوبست، حاکم بند وبست، قانون گو، گرداور، امین، امین بٹوارا، پٹواری، ہنگامہ، لگان، محصول مالگذاری، نکاسی خام، تقاوی، سیاہہ، سیاہ نویس، واصل باقی، واصل باقی نویس وغیرہ،

زمین کی قسمیں،

ہندوستان میں کھیتی کی زمین چکنی مٹی اور ریت یا بالو سے مل کر بنی ہے، ان دونوں کی مقدار کے تناسب سے زمین کو چار درجوں میں تقسیم کیا گیا ہے،

بلوہی زمین، بھوڑ، دومٹ یا دورس، مٹیار[۱]

[۱] محمد عبد القیوم، ترقی زراعت، ص ۱۹،

زمین کی قسمیں اپنے وقوع، رنگ، کیفیت اور پیداوار کے لحاظ سے حسب ذیل ہیں:

کھادر، بابانگر، کچھار، ترائی، بنجر، ادسر، گوہان یا گوینڈ، منجھا، بالو، برہت، مورم یا مونگ مار، کابر، رانگڑ، پڑوا۔[1]

زمین کی چند اور قسمیں بتائی گئی ہیں، مثلاً

آبی، چاہی: وہ اراضی مزروعہ جس کی سینچائی تالاب، نہر یا کنوئیں کے پانی سے ہوتی ہے،

بارانی، خاکی: وہ قطعہ اراضی جس کی کاشت کا دار ومدار بارش پر ہو اور وہاں آبپاشی کا ذریعہ نہ ہو،

اوکھر، اوکھل: پرتی زمین جو قابلِ کاشت بنائی جاسکے،

ہار: چراگاہ،

چکا کیول: کالی مٹی کی زمین،

بالوچر: دریا کے کنارے کی ریتیلی زمین،[2]

آلاتِ زراعت:

آلاتِ زراعت زیادہ تر ہندوستانی ہیں، اس لئے ان کے نام بھی ہندوستانی ہیں اور یہی نام اردو میں بھی مستعمل ہیں، جیسے، ہل، ہینگا، لبوا، بھروٹی، راری (روری)، سہاگا، موسل، بھاوڑا، لگر (دگی)، کدال، درانتی، ہنیاد (ہیا)، کھرپا، کھرپی وغیرہ، ہل چونکہ زراعت کی بنیادی چیزوں میں سے ہے، اس لئے اس کی بہت سی قسمیں ہیں، مثلاً، پچار، (پچنگور ادنتیلا)، لوٹن پٹیلا، دبرا، دب ہری (دبہری)، وغیرہ،

انگریزوں نے ہندوستان کی زراعت کی طرف کم توجہ کی اس لئے زراعتی مشینیں اور اس

---

[1] محمد عبد القیوم، ترقی زراعت ص ۱۱-۱۰، [2] ظفر الرحمٰن دہلوی، کتاب مذکور، جلد ششم،

مشن کی دوسری چیزیں یہاں کم پہنچ سکیں، صرف چند قسم کے ہل اور کچھ دوسری چیزوں کے نام ملتے ہیں، جیسے، مانسون پلاؤ، پنجاب پلاؤ، ٹرن ریسٹ پلاؤ، مسٹن پلاؤ، واٹسن پلاؤ، کان پور کلٹیویٹر، لیور ہارو، ٹریکٹر وغیرہ، اردو میں بھی یہی نام مستعمل ہیں۔

آبپاشی:

آبپاشی یا سینچائی کی زراعت میں وہی اہمیت ہے، جو انسانی زندگی میں خوراک کی ہے، اس سلسلے میں جو آلات استعمال ہوتے ہیں، وہ زیادہ تر ہندوستانی ہیں، اس لئے ان کے نام بھی ہندوستانی ہیں، اردو نے بھی اسی شکل میں قبول کر لیا ہے، چند نام یہ ہیں:

بیڑی (دوگلابہ)، چیل، ڈھیکلی، پُر، چرس (چرسا)، رہٹ، چرخی، ارہٹ، رون، موٹ، ڈول وغیرہ،

آبپاشی کے چند جدید آلات بھی اب استعمال میں آنے لگے ہیں، ان کے نام اردو میں اپنی اصلی شکل میں مستعمل ہیں، جیسے، پمپ، چین، اسکرو واٹر لفٹ، ٹیوب ول وغیرہ،

آبپاشی کے ذرائع کئی ہیں، سب سے بڑا ذریعہ بارش ہے، پھر ندی، تال، تالاب، تلیا، پوکھر، ڈبر، نہر، کنواں وغیرہ ہیں، ان ذرائع سے کھیت کی نالیوں میں پہنچانے کے لئے جس گڑھے میں پانی جمع کیا جاتا ہے، اسے جل حوض، پن ہووا اور قلابہ کہتے ہیں،

آبپاشی کے لئے کھیت کو مختلف حصوں میں بانٹ دیا جاتا ہے، یہ حصے کیاری کہلاتے ہیں، کیاریوں کے بیچ میں پتلی پتلی نالیاں بنائی جاتی ہیں، جن میں پانی بھرا رہتا ہے، ان میں سے لکڑی کے بنے ہوئے ہاتھے کے ذریعہ کیاریوں میں پانی پہنچایا جاتا ہے، کسی شاعر نے کیاری اور آب رواں سے حسن تعلیل پیدا کی ہے،

ہر کیاری اعتکاف میں ہے   آب رواں طواف میں ہے

فصلیں اور پیداوار:

ہندوستان میں دو اہم فصلیں ہیں: فصل خریف، فصل ربیع، تیسری فصل زائد ہے، یہ تینوں نام عربی ہیں، لیکن اردو میں اس کثرت سے مستعمل ہیں کہ عالم، جاہل سب انھیں سمجھتے اور بولتے ہیں، مگر جو چیزیں یہاں پیدا ہوتی ہیں، ان کے نام ہندی ہیں اور وہی اردو میں بھی رائج ہیں، مثلاً

فصل خریف کی پیداوار:

دھان، مکہ، جوار، باجرا، ارہر، مونگ، اڑد، موٹھ، کودوں، ساواں، منڈوا، لوبیا وغیرہ،

غلے کے علاوہ بھی بہت سی چیزیں اس فصل میں پیدا ہوتی ہیں، ان سب کے نام بھی ہندی ہیں اور وہی اردو میں بھی بولے جاتے ہیں، جیسے گنا، سنئی، پٹ سن، کپاس، تل، مونگ پھلی، انڈی (اریندڑی)، نیل وغیرہ،

فصلِ ربیع کی پیداوار:

گیہوں، جو، چنا، مسور، مٹر وغیرہ،

غلے کے علاوہ بھی بعض چیز اس فصل کے پیدا ہوتی ہیں جیسے سرسوں، رائی، السی، پوستہ، تمباکو وغیرہ،

فصل زائد میں پیدا ہونے والی چیزیں:

تربوز، خربوزہ، ککڑی، کھیرا، پھوٹ وغیرہ،

اوّل الذکر دو کو فارسی بھی کہا جا سکتا ہے اور ہندی کے تراشے ہوئے لفظ بھی

سبزی اور ترکاری:

ہندوستان میں سبزی اور ترکاری کی کاشت کافی ہوتی ہے، اکثر و بیشتر ترکاریوں اور سبزیوں کے نام جو اردو میں مستعمل ہیں، ہندی سے لئے گئے ہیں، اور زیادہ تر اصلی شکل میں ہیں، صرف چند ناموں میں تراش خراش ہوئی ہے،

ترکاری: آلو، گاجر، مولی، بھنڈی، ترئی، بینگن، اروی، بنڈا، سیم، لوکی، پرول (پرواد) گوبھی، گانٹھ گوبھی (کرم کلا)، کریلا، ٹماٹر، لال کدو، (کوہڑا)، پیٹھا، کندرو، ٹینڈا وغیرہ،

سبزی یا ساگ: چولائی (چورائی)، پالک، سویا، میتھی، بتھوا، مرسا، کرموا، وغیرہ،

چند ترکاریوں کے نام فارسی بھی ہیں، جنھیں اردو نے اپنا لیا ہے، مثلاً شلغم یا شلجم، چقندر، کدو وغیرہ۔

زراعت سے متعلق چند دلچسپ اصطلاحات:

آبیانہ: نہر سے پانی لینے کا سرکاری محصول،

کچی زمین: پڑتی اراضی جو لگان پر نہ ہو، اور ضرورت مند کو عارضی طور پر کرائے پر دی جائے،

رام بٹائی: زمیندار اور کاشتکار کے درمیان پیداوار کی مساوی تقسیم،

بیراگ: وہ چندہ جو فصل پر کاشتکاروں سے مذہبی اغراض کے لئے جمع کیا جائے،

ہل بلوک: دوسرے کے کھیت پر زبردستی قبضہ کرنا،

راج کال: وہ منہگائی جو حکومت کے طرز عمل سے یا سرکاری ضروریات سے پیدا ہو،

ہفت گانہ: پٹواری کے کھتوں اور روزنامچوں کا مجموعہ،

موت نامہ: کاشتکار یا زمیندار کے مرنے کا اطلاع نامہ اس کے وارثوں کے نام۔[1]

---

[1] ظفر الرحمٰن دہلوی فرہنگ اصطلاحات پیشہ وراں، جلد ششم،

مویشی:

زراعت پاکستان کے لئے مویشی بھی ضروری ہیں۔ بیل کے بغیر وہ ہل نہیں جوت سکتا۔ گائے اور بھینس کے بغیر اس کے بچے توانا نہیں ہو سکتے۔ ان کا گوبر اس کی بے دام کی کھاد ہے۔ اسی لئے وہ اپنے مویشیوں کو بہت عزیز رکھتا ہے اور ان کی خوب نگرانی کرتا ہے۔ وہ اپنے بیلوں کی زینت و آرایش بھی کرتا ہے۔ ان کے گلے میں رنگین کوڑیوں یا کانچ کے موتیوں کی مالا ڈالتا ہے یا انھیں گھنگھرو پہناتا ہے۔ گلے میں گھنٹی یا گھنٹیاں پہنانا بھی عام ہے۔ ہل جوتنے یا گاڑی کھینچنے میں ان سے ہلکا سا ترنم پیدا ہوتا ہے۔ سینگوں کو خوبصورت بنانے کے لئے ان پر پیتل کے خول چڑھائے جاتے ہیں۔ ان کو سنگوٹیاں کہتے ہیں۔ جب بیل فرصت سے بیٹھتے ہیں، تو ان کی پیٹھ پر ایک کپڑا ڈال دیا جاتا ہے، جو عموماً سرخ رنگ کا ہوتا ہے۔ اسے جھول کہتے ہیں۔

مویشیوں کو آرام سے رکھنے کے لئے ایک خاص مکان بنایا جاتا ہے، جسے بردوری، سار، نوہرا، باڑا، باکھر، آکھر، اِلوار وغیرہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ مٹی کے جس برتن میں وہ چارا کھاتے ہیں اسے ناند کہتے ہیں۔ اس خیال سے کہ وہ کہیں چلے نہ جائیں انھیں کھونٹے میں باندھ دیا جاتا ہے۔ جس رسی سے انھیں باندھا جاتا ہے، وہ پگہا کہلاتی ہے۔ بیل کو قابو میں رکھنے کے لئے اس کی ناک چھید دیتے ہیں اور اس میں پتلی سی رسی ڈال دیتے ہیں۔ اسے ناتھ کہتے ہیں۔ یہ ناتھ ایک دوسری رسی سے بندھی ہوتی ہے، جو گرنٹھا کہلاتی ہے۔ آگے ناتھ نہ پیچھے پگہا ایک مشہور مثل ہے، جو اسی سے بنی ہے اور ایسے آدمی کے لئے بولی جاتی ہے، جس کے آگے پیچھے کوئی عزیز نہ ہو۔ بھگوڑے بیل کے گلے میں لکڑی یا بانس کا ایک ڈنڈا لٹکا دیتے ہیں، جو بھاگتے وقت اس کی ٹانگوں کے بیچ میں اٹک جاتا ہے اور اسے بھاگنے نہیں دیتا۔ اس ڈنڈے کو لنگر، اڑگوڑا، ٹھکن وغیرہ کہتے ہیں[1]

---

[1] ظفر الرحمٰن دہلوی، فرہنگ اصطلاحات پیشہ وراں، جلد پنجم۔

آدمی کی طرح مویشی بھی کھلی فضا کے دلدادہ ہوتے ہیں، اس لئے انھیں گانوں کے باہر خالی چھوٹے ہوئے ہرے بھرے میدان یا دامن کوہ میں چرنے کے لئے بھیجا جاتا ہے، اس میدان یا دامن کوہ کو عموماً چراگاہ کہا جاتا ہے، اسے بیتول یا بیرو بھی کہتے ہیں، چراگاہ میں مویشیوں کو پانی پلانے کی جگہ بنی ہوتی ہے، جو اتنک یا اڑتنک کہلاتی ہے[۱]، یہ مویشی گانوں کے مختلف زمینداروں اور کاشتکاروں کے ہوتے ہیں اور بڑی تعداد میں ہوتے ہیں، انھیں گلہ یا ریوڑ کہتے ہیں، جو چند لوگ ان ریوڑوں یا گلوں کی نگہبانی کے لئے مقرر ہوتے ہیں، ان کو چرواہا، چرپا، بردہا، گلہ بان، چوپان وغیرہ الفاظ سے یاد کیا جاتا ہے، چرواہے کو جو اجرت دی جاتی ہے وہ چرائی، یا چروائی کہلاتی ہے، اسے بردہی بھی کہتے ہیں، مویشیوں کو دانہ یا چارا کھلانے کا برتن چرنی یا چرہی کہلاتا ہے[۲]۔

مویشیوں کے علاوہ بعض دوسرے جانور بھی کسان کے لئے مفید ہیں، گھوڑا، خچر، ٹٹو، گدھا، اونٹ وغیرہ بار برداری کے کام آتے ہیں، گھوڑا سواری کے بھی کام آتا ہے، اس کے بارے میں تفصیل سے سواری کے باب میں لکھا جائے گا، اونٹ سے ہل بھی جوتتے ہیں، وفادار کتے اور مسکین بلی کی اہمیت کسان کے یہاں کچھ کم نہیں ہے، کتا اس کے گھر کی نگہبانی کرتا ہے، اور بلی اس کے اناج کے ذخیرے کو چوہوں کی غارتگری سے بچاتی ہے، ان جانوروں نے ہماری مجلسوں میں بھی اپنی جگہ بنالی ہے، مندرجہ ذیل محاورے اور مثلیں عام ہیں:

بھیگی بلی بننا یا بنانا، شتر غمزے دکھانا، بھیڑ چال، ہاتھی کے منہ سے گنا چھیننا، ہاتھی مرے پہ بھی سوا لاکھ، اونٹ رے اونٹ تیری کونسی کل سیدھی، دودھاری گائے کی دولات بھلی۔

چرند:

مویشیوں کے علاوہ آدمی کو دوسرے بہت سے جانوروں سے بھی انسیت ہے، بکری

---

[۱] شفقت رضوی و دیگر: فرہنگ اصطلاحات پیشہ وراں، جلد ہفتم۔ [۲] ایضاً۔

وہ خصوصاً پالتا ہے، مینڈھا پالنے کا بھی اسے شوق ہے، ہرن (آہو)، غزال، بارہ سنگھا، چیتل،
خرگوش وغیرہ ہر خاص و عام کے پسندیدہ جانور ہیں، ہرن، نیل گائے وغیرہ کا وہ شکار بھی
کرتا ہے، غزال اور آہو کو شعر و ادب میں بھی جگہ ملی ہے، غزالی آنکھیں سب کو پسند ہیں اور
ہرن کی طرح چوکڑیاں بھرنا بھی سب کے لئے دل خوش کن ہے۔ شاخِ آہو، خرامِ آہو، رمِ آہو،
سے ہر صاحبِ ذوق مسرت حاصل کرتا ہے۔

پرند :

پرندوں سے بھی انسان کو بڑی انسیت ہے، وہ ان کو محبت سے پالتا ہے، بلبل، مینا،
کوئل، پپیہے، وغیرہ کی نغمہ سرائی کا وہ دلدادہ ہے، توتا اپنی طوطا چشمی کے باوجود اسے عزیز ہے،
باز، عقاب اور شاہین شکاری پرندے قدیم زمانے میں بادشاہوں کے دوش کی زینت
بنتے تھے، زاغ و زغن اپنی کثافت پسندی اور وحشت کے باوجود شعر و ادب کی بارگاہ
میں داخل ہیں، ہما مبارک ہونے کے باعث اور عنقا اپنی نایابی کی بنا پر اہم اور آدمی کو
عزیز ہونے کے علاوہ شعر و شاعری کے دربار میں بھی اہمیت رکھتے ہیں، سرخاب کے جوڑے کی
محبت ضرب المثل ہے، اور شاعروں کے لئے ایک اچھی تشبیہ، اسی طرح دوسرے بہت سے پرندے
ہیں، جو آدمی کو کسی نہ کسی وجہ سے پسند ہیں، نیچے چند مشہور پرندوں کے نام دئے جاتے ہیں۔
بلبل، ابابیل، توتا، مینا، فاختہ، کوئل، پپیہا، چنڈول، قمری، بیا، مرغابی، سرخاب، ہنس،
ہریل، بگلا، سارس، قاز، گوریا (کنجشک)، باز، عقاب، شاہین، شکرا، زاغ، زغن، چیل، تیتر،
بٹیر، ہما، عنقا، کبوتر، بدی، کاگا (کوا)، شتر مرغ، مور وغیرہ،

ان پرندوں کا ہماری تمدنی زندگی سے تعلق اس قدر ہے کہ شعرا نے ان میں سے بہتوں
کو موضوعِ سخن بنایا ہے اور ان کی بنیاد پر محاورے اور کہاوتیں بن گئی ہیں، مثلاً:

محاورے :

طوطا چشم ہونا، طوطے کی طرح رٹنا، طوطی بولنا، آدھا تیتر آدھا بٹیر، عنقا ہونا، روغن قاز ملنا، بگلا بھگت بننا، سرخاب کے پر لگنا، پر تولنا وغیرہ

کہاوتیں :

" وہ دن گئے جب خلیل خاں فاختہ اڑاتے تھے۔

چیل کے گھونسلے میں ماس کہاں!

کوا چلا ہنس کی چال، اپنی چال بھی گیا بھول،

جنگل میں مور ناچا کس نے دیکھا،

کیا پدی کیا پدی کا شوربا،

درند :

درندہ آدمی کا دشمن ہے، لیکن چند درندوں کا اس کی تمدنی زندگی سے بہرحال تعلق ہے، زراعت کی مناسبت سے گیدڑ کا نام خصوصیت سے لیا جا سکتا ہے، فصل کو اس سے بچانے کے لئے کسان کو طرح طرح کے جتن کرنے پڑتے ہیں، گیدڑ بھبکی کا مشہور محاورہ اسی جانور کی بھبکیوں سے وجود میں آیا۔ ہاتھی امیروں اور رئیسوں کے دروازے کی زینت بنتے ہیں، اور ان کی امارت کی شان ظاہر کرتے ہیں، کبھی کبھی ان سے پاسبانی کا بھی کام لیا جاتا ہے، ہاتھی کے بارے میں تفصیل سے سواری کے باب میں لکھا جائے گا، شیر کا بچہ بھی پالا جاتا ہے، شیر کو کٹہرے کے علاوہ شعر و ادب کے دربار میں بھی مقام حاصل ہے، تشبیہ اور استعارے کے طور پر خصوصاً اس کا استعمال ہوتا ہے، بھیڑیا، لومڑی، ریچھ وغیرہ بھی کسی نہ کسی حیثیت سے ہماری تمدنی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں۔

تجارت :

ایوانِ تمدن کا ایک اہم ستون تجارت بھی ہے۔ اس کے فروغ سے زندگی کے مختلف شعبے ترقی پاتے ہیں، اس کی بدولت شہروں کی رونق ہے۔ اس کے ذریعے ملک میں تعلیم کا چرچا ہے، اسی کے زور سے علم و فن کی ترقی ہوتی ہے، ہندوستان میں قدیم زمانے سے تجارت کا چلن تھا، اس لئے ایسے الفاظ خود بخود وجود میں آنے لگے، جو تجارتی معاملات کو سمجھائیں، اردو نے ان میں سے اکثر کو اپنا لیا،

تجارت کے لئے بنیادی چیز رقم ہے، رقم سکوں سے بنتی ہے، اور سکے مختلف معیار اور قیمت کے ہوتے ہیں، ہندوستان میں مسلمانوں کے عہد میں جو سکے عموماً رائج تھے، وہ مندرجہ ذیل تھے،

اشرفی، آفتابی، مہر، جلالی مہر، دینار، آتما (چھوٹی اشرفی) درہم، روپیہ، اٹھنی، چونی، پاؤلی یا باؤلی، دونی، اکنی یا آنہ، پیسہ، دھیلا، ادھنا، ادھنی، پائی، کوڑی۔[1]

ان کے علاوہ چیتل، دام، چھدام، کوڑی، منصوری پیسے کا بھی ہندوستان میں رواج تھا،[2] دکن میں مسلمانوں کے عہد میں سونے کا ایک سکہ چلتا تھا، جو ہن کہلاتا تھا،[3] اس سے ہن برسنا محاورہ بنا ہے، جو عام ہے،

روپئے سے پائی تک کے سکے انگریزوں کے عہد تک ہندوستان میں رائج تھے اس لئے اردو میں ان کا استعمال عام تھا، روپئے اور پیسے کا سکہ آج بھی چلتا ہے، باقی سکے متروک ہو چکے ہیں، انگریزوں کے عہد میں کاغذ کے نوٹ جاری ہوئے، جنھیں ہماری حکومت نے بھی

---

[1] صراحت کے لئے دیکھئے، ظفر الرحمن دہلوی، فرہنگ اصطلاحات پیشہ وراں، جلد پنجم، [2] ایضاً،

[3] ظفر الرحمن دہلوی، کتاب مذکور، جلد پنجم،

اپنا لیا ہے۔ اس کاغذی سکے کا چلن اردو میں بھی عام ہے، انگریزی پاؤنڈ، شلنگ اور پنس سے بھی اردو کا دامن خالی نہیں ہے، امریکن ڈالر بھی اردو کے خزانے میں پایا جاتا ہے۔

جس جگہ میں سکے بنتے ہیں اسے ٹکسال کہتے ہیں، اس سے ٹکسالی پیسا یعنی کھرا پیسا محاورہ بنا ہے، مسلمانوں کے عہد میں اسے جلالہ کہتے تھے۔ ٹکسالی پیسے کی طرح ٹکسالی زبان بھی کہتے ہیں یعنی مستند زبان۔

قدیم زمانے میں روپیوں کو حفاظت سے رکھنے کے لئے لمبی نلی کی شکل کی تھیلی ہوتی تھی، جو کمر سے باندھ لی جاتی تھی، اسے ہنولی کہا جاتا تھا، اس کی جگہ خوبصورت انگریزی پرس نے لے لی ہے، اسے بٹوا بھی کہتے ہیں۔

تجارت بڑے پیمانے پر ہوتی ہے اور چھوٹے پیمانے پر بھی۔ بڑے پیمانے پر تجارت کرنیوالا تاجر، سوداگر یا بیوپاری خاصی شہرت رکھتا ہے، دکان رکھنے والے دوکاندار سے بھی ہر شخص واقف ہے، دکان کے ساتھ انگریزی کا اسٹال بھی اب اردو میں عام ہو چکا ہے، بڑی مقدار میں مال مہیا کرنے یا فروخت کرنے والے تھوک فروش اور چھوٹی یا کم مقدار میں بیچنے والے پھٹکر فروش کو بھی ہم پہچانتے ہیں، غریب خوانچے والا اور پھیری والا بھی ہمارے لئے کچھ کم اہم نہیں ہیں۔ بڑے کاروبار میں کچھ درمیانی لوگوں کی مدد کی ضرورت پڑتی ہے، انھیں دلال کہتے ہیں اور ان کی محنت کے عوض میں جو کچھ انھیں ملتا ہے اسے دستوری کہا جاتا ہے۔

ہر قسم کا مال بازار میں بکتا ہے، انگریزی کا مارکیٹ بھی اب اردو کے لئے اجنبی نہیں ہے، ان کے علاوہ منڈی، ہاٹ، صرافہ، بزازہ، نخاسی (نخاس) وغیرہ مخصوص قسم کے یا مخصوص چیزوں کے بازار ہیں جن سے اردو کی رونق ہے۔

۱؎ ظفر الرحمن دہلوی۔ فرہنگ اصطلاحات پیشہ وراں، جلد ہفتم، ص ایضاً۔

بہت سی چیزیں ایسی ہیں، جن کے لئے ترازو استعمال کی جاتی ہے، اسے بٹ کھرا بھی کہتے ہیں، پلا، پلڑا، پلڑا، ڈنڈی، پاسنگ، شاہین وغیرہ ترازو کے متعلقات ہیں، پاسنگ سے پاسنگ نہ ہونا محاورہ بنا ہے، جواہرات تولنے کی ترازو کو کانٹا کہتے ہیں، اس کے ساتھ دھرم کانٹا کو بھی یاد کر لینا چاہئے جو چاندی سونا تولنے کی ساہوکارے کی ترازو ہے اور چاندی اور سونا پرکھنے کی کسوٹی۔

چیزوں کو تولنے کے لئے ہندوستان میں مندرجۂ ذیل اوزان مستعمل تھے:

من، سیر، تولہ، ماشہ، رتی (رجہ)، مثقال،

انگریزوں کے دور میں پاؤنڈ کا اضافہ ہوا، آزادی نے سب کو ختم کر کے کلوگرام، کیلو اور گرام کو رواج دیا۔ مذکورہ بالا تمام الفاظ اردو میں پائے جاتے ہیں،

زمین کو ناپنے کے بھی پیمانے تھے، جریب اور گز بڑے پیمانے تھے، ہاتھ، بالشت، مٹھی انگل بھی عوام میں پیمانے کے طور پر استعمال ہوتے ہیں، اس لئے اردو میں ان کا استعمال پایا جاتا ہے، انگریزی کے فٹ اور انچ گویا اردو الفاظ ہیں۔

حساب کتاب رکھنے کے لئے ہندوستان میں مندرجۂ ذیل گنتیاں استعمال ہوتی ہیں:

دہائی، سیکڑہ، ہزار، لاکھ، کروڑ، ارب، کھرب، نیل، پدم، سنکھ، مہاسنکھ،

اردو میں یہی گنتیاں مستعمل ہیں،

حساب کتاب سے کھاتا بھی کہتے ہیں، رکھنے کے لئے ایک خاص کتاب ہوتی ہے جسے بہی یا بہی کھاتہ کہا جاتا ہے، جس بہی میں کچا کھاتہ لکھتے ہیں، وہ ٹیپ کہلاتی ہے۔ اس کے علاوہ بہی کی مندرجۂ ذیل قسمیں ہیں۔

روکڑ بہی، جاکڑ بہی، اجھا بہی، لیکھا بہی، بیمک بہی، ابدھ بہی، اناجی بہا، بڑا کھاتا۔

تجارت میں ہنڈی کی بڑی اہمیت رہی ہے، اس کی بھی مختلف قسمیں ہوتی ہیں، مثلاً، پیٹھ ہنڈی، پر پیٹھ ہنڈی، بھرتی ہنڈی، درشنی ہنڈی، شاہ جوگ ہنڈی، لینے جوگ ہنڈی، نام جوگ ہنڈی، میعادی ہنڈی۔

انگریزی حکومت میں ہنڈی کی جگہ ڈرافٹ (DRAFT) نے لے لی، اس کے علاوہ کراس چیک، آرڈر چیک، چیک بک، پاس بک، وغیرہ بھی اسی سلسلے کے الفاظ ہیں، جو عام طور سے استعمال ہوتے ہیں، ان کے ساتھ ساتھ بینک، منیجر، کیشیر، اکاونٹنٹ وغیرہ بھی اردو الفاظ بن چکے ہیں،

مندرجہ بالا لفظوں کے علاوہ تجارت کے ذریعے اور بھی بہت سے الفاظ اردو میں داخل ہوئے جیسے بھرپائی، بھگتان، اٹھوارا، چھوڑ چھٹی، ہاتھ چٹھی، فارغ خطی، ہاتھ ادھار، جوکھوں، (امانتی چیز)، توڑا، آڑھت (آڑتی)، باردانہ، رونا منیم وغیرہ،

چند محاورے بھی اس راستے سے ہماری زبان میں داخل ہوئے، مثلاً۔

کانٹے کی تول، سونے کی تول، سونے کے مول (بھاؤ) بھانجی مارنا، رتی چکنا، کسر دینا، کسر کھانا، باون تولے پاؤ رتی وغیرہ۔

پل میں تولا پل میں ماشا، سیر کو سوا سیر موجود ہے، بنیا دینا ہی نہیں، کمہ پورا تولی مشہور کہاوتیں ہیں، جو اس راہ سے اردو میں آئی ہیں۔

باغبانی

باغبانی افادیت کی غرض سے بھی کی جاتی ہے اور دلچسپی کی خاطر بھی، اس میں پھل، پھول اور مختلف اقسام کے درخت شامل ہیں، باغ سے مراد پھولوں اور پھلوں کے پودوں اور درختوں کی جگہ ہے، جس چیز کا باغ ہوتا ہے، اس کی مناسبت سے اس کا نام لیا جاتا ہے، جیسے آم کا باغ، امرود کا باغ، پھولوں کا باغ وغیرہ، آموں کے باغ کو امریاں بھی کہتے ہیں، باغ بارہ دری اور جگہ ہے جس میں پھول اور ترکاری کے پودے لگائے جاتے ہیں، پھولوں کے باغ کو پھلواڑی، چمن، چمنستان، گلستان، بوستان، گلشن، گلزار وغیرہ بھی کہا جاتا ہے، اسی طرح بعض اور چیزوں کے باغوں کے لئے مخصوص الفاظ ہیں، مثلاً نخلستان، بیریاں وغیرہ۔ باغ کی نگہبانی کرنے والا باغبان نہ صرف صاحب باغ ہی کو عزیز نہیں بلکہ مختلف شعر میں بھی اسے جگہ حاصل ہے جس سے ہر صاحب ذوق واقف ہے۔

پھول:

تمدنی زندگی میں پھول کی مقبولیت اور اہمیت مسلّم ہے، اس کا استعمال متنوع ہے اس سے محفل سجائی جاتی ہے، دولہے کے لئے سہرا بنتا ہے، دلہن کو آراستہ کیا جاتا ہے، دیواروں اور دروازوں کو زینت دی جاتی ہے، مہمان کے لئے گلدستہ تیار ہوتا ہے، لڑکیاں اور نوجوان عورتیں بڑے شوق سے ان کا گجرا پہنتی ہیں، قدیم زمانے میں اس سے طرح طرح کی زینت

بنائے جاتے تھے، ان میں سے کنگن، بدھی وغیرہ کا بعض جگہ آج بھی چلن ہے، مزاروں پر پھول یا پھول کی چادر چڑھانے کا عام رواج ہے، پھول والوں کی سیر دہلی کا ایک مشہور میلا ہے جس میں پھول والوں کی طرف سے خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے مزار پر پنکھے چڑھائے جاتے ہیں، تل کو پھول میں بسا کر اس کا تیل نکالتے ہیں، پھول سے عطر تیار ہوتا ہے، ہندوستان میں پھولوں کی کثرت ہے اور اکثر پھول رنگت اور خوشبو دونوں لحاظ سے بہت اچھے ہیں، شہنشاہ جہانگیر کی رائے میں ہندوستان کے خوشبودار پھولوں کو ان کی فرحت بخش خوشبو کی وجہ سے دنیا کے تمام پھولوں پر ترجیح دی جاسکتی ہے، کچھ پھول ایسے ہیں جو دنیا میں اور کہیں نہیں پائے جاتے،[1] ان پھولوں کے ہندی نام اردو میں اپنی اصلی شکل میں پائے جاتے ہیں، اور نثر اور نظم دونوں میں استعمال ہوتے ہیں، یہ نام ہر اردو داں کی زبان پر ہیں۔

چنبیلی، مالتی، سیوتی، بیلا، موتیا، موگرا، رات کی رانی، جوہی، لاجونتی، چھوئی موئی، چمپا، گیندا، کنول، سورج مکھی، ڈھاک، رائے بیل، مدن، بان، کسم، کدم کیتلی، مولسری، ٹیسو، کیوڑا، ہارسنگار، چاندنی، نواڑی وغیرہ۔

شیر علی افسوس نے ہندوستانی پھولوں کی تعریف نثر میں کرنے کے بعد اشعار میں بھی ان کے اوصاف بیان کئے ہیں، نیچے چند منتخب اشعار نقل کئے جاتے ہیں۔

جو لکھنے کے قابل ہو مو کا قلم	نزاکت ہو کچھ سیوتی کی رقم
سپیدہ سحر کا جو حل ہو کے آئے	صباحت ذرا اس کی تب لکھی جائے
کروں وصف کیا موگرے کا بیان	کہ ایک ایک کلی اس کی ہے عطرداں
معطر ہے شدت سے بیلے کی باس	یہ آتی نہیں حیف عاشق کو راس
جو سوتے میں آجائے اس کی لپٹ	پھڑک جائے دل، نیند جائے اچٹ

[1] تزک جہانگیری، ص ۴۴،

مدن بان کی ادھ کھلی ہر کلی | بڑھاتی ہے عشاق کی بے کلی
خوشا بند ہے نکہت رائے بیل | رہے بزم میں اس کی نت ریل پیل
چنبیلی کی بو ہے نزاکت بھری | پھلکتی ہوئی اس کو سونگھے پری
یہ ہیں خوشنما جائی، جوہی کے پھول | کہ دیکھ ان کو بس سرت جاتی ہے بھول
صفائی کا عالم کہوں ان کی کیا | کہ پائے نظر یاں پہ پھسل ہی پڑا
بہت موتیا کی پیاری ہے بو | ہر ایک گل سے اس کی نیاری ہے بو
نواڑی کی از بس کہ میٹھی ہے بو | دلوں کو وہ مقبول کیوں کر نہ ہو
جدا سب سے دوپہریا کا ہے روپ | کہاں اس کی رنگت کو لگتی ہے دھوپ
گلوں نے نرالا ہے گل چاندنی | چمن کا اجالا ہے گل چاندنی
یہ چمپا کے پھولوں میں ہے کی مہک | لپٹ ان کی جاتی ہے گردوں تلک
یہ رنگت میں تشبیہ دوں اس سے کیا | کہ بن باس جو ہر ہے پکھراج کا
ہر ایک گل کا ہر رنگ و عالم جدا | نہیں لطف سے خالی کوئی ذرا[1]

ہندوستان ایرانی تہذیب و تمدن سے بہت متاثر ہوا ہے، وہاں کے پھول بھی ہندوستان پہنچے اور اہل ہند کی محفلوں کی زینت بنے، اس طرح ہندوستان میں پھولوں کی کثرت میں اضافہ بھی ہو گیا، اور ان میں تنوع بھی زیادہ ہو گیا، ایرانی پھولوں کے فارسی اور عربی نام اردو زبان نے اپنے اندر اس طرح جذب کر لئے کہ وہ اس کی اور خصوصاً شعر و سخن کی زینت و آرائش کا سامان بن گئے، مثلاً چند نام نیچے دیئے جاتے ہیں:

سنبل، سوسن، یاسمین، نسرین، نسترن، نیلوفر، حنا، لالہ، ریحان، نافرمان، نرگس،

---

[1] آرائش محفل، ص ۲۳۔

شہلا، شبو، شب کوش، ارغوان، بنفشہ، اشرفی، آفتاب، عباسی، رعنا، زیبا، جعفری، شقائق، عنبری، داؤدی، ہزارہ، طرہ، گلنار، سیر غم، نازبو، بستان افروز، تاج فردوس وغیرہ،

مسلمانوں نے بعض ہندوستانی پھولوں کے نام فارسی کر دیے ہیں، مثلاً گیندا کو گل صد برگ، چنبیلی کو یاسمن، لال، سفید اور زرد گلاب کو گل سرخ، گل سفید اور گل زرد، یہی نام اردو میں بھی استعمال ہوتے ہیں۔

گل کی ترکیب سے ساتھ چند نام تمہید کے اصول پر بنائے گئے ہیں، جیسے گلاب، گل اورنگ، گل بکاؤلی، گل پیادہ، گل ہندی، گل خیرو وغیرہ،

زعفران کا شمار بھی پھولوں میں ہوتا ہے، تمدنی زندگی میں اس کی بڑی اہمیت ہے، یہ اعلیٰ قسم کے کھانوں میں مختلف طریقوں سے مستعمل ہونے کے علاوہ طبی طریقے سے تیار کی ہوئی دواؤں میں بھی بہت استعمال ہوتی ہے، اس کی پیداوار ہندوستان میں سب سے زیادہ کشمیر میں ہوتی ہے، جب زعفران میں پھول آتے ہیں تو اس وقت کھیتوں کا نظارہ بڑا دلکش ہوتا ہے، ایک بار جہانگیر کشمیر گیا تو چونکہ زعفران کے پھول کھلے ہوئے تھے، اس لئے اس نے سواد شہر سے کوچ کا حکم دیا اور "در زعفران زار بزم پیالہ ترتیب یافت،" اس کے بعد وہ کہتا ہے کہ "چمن چمن و صحرا صحرا چندانکہ نظر کار کند شگفتہ بود، نشیمن در انجا دماغ ہارا معطر ساختے"[1]

زعفران کے متعلق یہ مشہور ہے کہ اس کے کھیت کو دیکھ کر آدمی ہنسنے لگتا ہے، یہ عوام کی بات ہے، لیکن یہ کہ اسے کھانے سے ہنسی آتی ہے، طبی کتابوں میں بھی لکھا ہے، جہانگیر نے ایک بار اس کی آزمائش کی تھی، اور یہ غلط ثابت ہوئی، میرزا محمد ہادی کا بیان ہے کہ،

"چونکہ اکثر طبی کتب، خصوصاً ذخیرۂ خوارزم شاہی، میں لکھا ہوا ہے کہ زعفران کے

[1] سید صباح الدین عبد الرحمٰن، ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے تمدنی جلوے، ص ۳۳۲، تزک جہانگیری ص ۴۳۲

کھانے سے ہنسی آتی ہے اور زیادہ کھانے کی صورت میں ہنستے ہنستے ہلاک ہو جانے کا خطرہ ہے، اس لئے حضرت شاہنشاہی نے اس بات کی آزمائش کے لئے ایک ایسے قیدی کو جسے سزائے قتل ملنے والی تھی، قید خانے سے اپنے حضور میں طلب کیا اور اسے ایک پاؤ یعنی چالیس تولے (کذا) زعفران کھلائی گئی، لیکن اس پر قطعاً کوئی اثر نہیں ہوا، دوسرے دن اسے دوگنی مقدار میں یعنی اسّی تولے زعفران کھلائی گئی، مگر ہنستے ہنستے مرجانا تو دور کی بات رہی، اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تک نہ آئی۔[1]

ان پھولوں کی چونکہ تمدنی زندگی میں اہمیت ہے اور عوام و خواص دونوں میں انھیں مقبولیت حاصل ہے، اس لئے ادب میں بھی ان کا دخل ہوا اور ان کی وجہ سے شعر و سخن کی محفل میں رنگینی اور لطافت پیدا ہوئی، ان کے ذکر اور اوصاف سے دنیا کا کوئی ادب خالی نہیں، اردو میں بھی مختلف پھولوں کو عنوان بنا کر بڑی تعداد میں نظمیں لکھی گئی ہیں، اور آج بھی لکھی جاتی ہیں اور جب تک پھولوں میں خوشبو، رنگت اور شگفتگی ہے یہ سلسلہ جاری رہے گا۔

انشاء اللہ خاں انشا نے ایک قصیدے میں جو انھوں نے انگریز بادشاہ جارج سوم کی سالگرہ کے موقع پر اس کی مدح میں کہا تھا، جشن کی مناسبت سے تشبیب کے ابتدائی اشعار میں پھول، چمن، ابر بہاری وغیرہ کا استعمال عمدگی سے کیا ہے، تشبیب کے وہ اشعار نیچے نقل کئے جاتے ہیں، تاکہ پھولوں کی تمدنی اہمیت اور پھر اردو میں اس کی جگہ کا اندازہ ہو سکے۔

گھیاں نور کی تیار کرے بوئے سمن ۔۔۔ کہ ہوا کھانے کو نکلیں گے خوانانِ چمن

---

[1] توزک جہانگیری، ص ۔ ۴۶

عالمِ اطفالِ نباتات پہ ہوگا کچھ اور — گورے کالے سبھی بیٹھیں گے نئے کپڑے پہن
کوئی شبنم سے چھڑک بالوں پہ اپنے پوڈر — بیٹھ کر جلوے کی کرسی پہ دکھاوے گا پھبن
شاخِ نازک سے کوئی ہاتھ میں لیکر اک بیت — ہو الگ سب سے نکالے گا نرالا جوبن
نسترن بھی نئی صورت کا دکھاوے گا رنگ — کوچ پر ناز کے جب پانو رکھے گا بن ٹھن
اپنے گیلاس شگوفے بھی کریں گے حاضر — غنچۂ گل بھی وہاں کھولیں گے بوتل کے دہن
اہلِ نظارہ کے آنکھوں میں نظر آوے گی — باغ میں نرگسِ اٹھلاتی ہوئی چتون
اور ہی جلوے نگاہوں کو لگے گی دینے — اوری بانات کی کرتی ہیں شکوہ سوسن
پتے ہل ہل کے بجادیں گے فرنگی طنبور — لالہ لاوے گا سلامی کو بنا کر پلٹن
کھینچ کر تارِ رگِ ابرِ بہاری سے کئی — خود نسیمِ سحر آوے گی بجانے ارگن[1]

ان پھولوں کے علاوہ جو بالذات پھول ہیں، چند اور چیزوں کے بھی پھول ہیں، جو اپنے حسن، رنگت اور دلکشی کے لحاظ سے تمدنی زندگی میں اہمیت رکھتے ہیں، مثلاً بادام کے پھول، شفتالو کے پھول، سرسوں کے پھول، انار کے پھول، مٹر کے پھول وغیرہ، آخری دو[2] خالص ہندوستانی ہیں اور اس لحاظ سے اہم ہیں، سرسوں کے کھلے ہوئے زرد پھول کو بسنت کہتے ہیں؛ اس موسم کو بھی بسنت کہتے ہیں، جس میں سرسوں پھولتی ہے، اس وقت کھیتوں میں زرد ہی ہی زردی نظر آتی ہے، بسنت پھولنے کی خوشی میں میلا لگتا ہے، جس میں بزرگوں کے مزاروں اور دیوی دیوتاؤں کے استھانوں پر سرسوں کے پھول چڑھائے جاتے ہیں، اس میلے کو بھی بسنت کہتے ہیں۔" اس میلے میں میلانی زرد زرد پوشاکیں پہن کر جاتے ہیں تو عجب بہار اور کیفیت نظر آتی ہے، بادشاہی زمانے میں تو عمارتوں اور سواری کی رتھوں، گھوڑوں اور

---

[1] سید احمد دہلوی، فرہنگ آصفیہ لاہور جلد اول ۱۹۰۸ء جلد دوم ۱۹۰۸

پالکیوں تک کا یہی عالم ہوتا ہے۔[1] بسنتی جوڑا، بسنتی پوشاک وغیرہ اسی رنگین موسم کی پیداوار ہیں۔ بسنت درحقیقت ہندوستان میں بہار کا زمانہ ہے، ایسا کیف آگیں موسم ہر حساس طبع اور زندہ دل آدمی کو متاثر کرتا ہے، اردو شاعری بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی، شعراء نے بسنت کو عنوان بنا کر نظمیں لکھیں اور اپنی امنگوں اور خوشیوں کا اظہار کیا، اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر سلطان محمد قلی قطب شاہ کے یہاں اس عنوان کے تحت ۳ نظمیں ملتی ہیں، اس کے علاوہ اس نے بسنت کی تعریف میں ایک مختصر قصیدہ بھی کہا ہے، جس میں بسنت کی رنگینیاں اور رعنائیاں دکھائی ہیں، یہاں مثالاً ایک نظم کے چند منتخب اشعار نقل کئے جاتے ہیں:

شاہ کے مندر سعادت کا خبر لیایا بسنت
نین پتلیاں کے چمن میں پھول پھل لیایا بسنت

سبز سارے نور تن کسوت کئے ہیں رنگ رنگ
سرو مینا میں سو شبنم کا سرا پایا بسنت
خراب

سارے پھولاں تئیں بسنت کا پھول مہمانی کیا
گل پیالہ ہو کے خدمت تائیں شراب جت للایا بسنت
کرنے

جوت مانگ سوں بسنت کے کھل کھلے عالم بنے
پھول بسنت تعجب فلک پر لال رنگ چھایا بسنت

سورکا رنج میں بسنت کا رنگ جھلکتا نور سوں میں
ہور حیدر کے حوض میں سا چندن سوں مہکایا بسنت

---

[1] سید احمد دہلوی، فرہنگ آصفیہ، جلد اول۔

ترنیاں چڑکے تز نگ نکلیاں بسنت کے ڈھنگ سوں
پھول ہر اک کھل کے اب باساں ستیں گایا بسنت

چڑکیاں کے نیر بند تھے سب فلک پکڑیا ہر رنگ
اس گھر ابراں کے رنگ تھے موتی برسایا بسنت

موتیاں یاقوت گھر گھریوں دھمک انبار ابھرے
ہر گدا مکین کوں خاقاں ہم کا دکھلایا بسنت

نظیر اکبر آبادی نے اپنے معمول کے مطابق زندہ دلانہ انداز میں بسنت پر ایک مخمس لکھا ہے، جس کا ٹیپ کا مصرع ہے،

سب کی تو بسنتیں ہیں پہ یاروں کا بسنتا

انھوں نے ایک اور نظم لکھی ہے جو محاکاتی انداز میں ہے، یہ نظم بڑی دلکش اور بسنت ہی کی طرح رنگین، رعنا اور سرور کن ہے، اسے نیچے نقل کیا جاتا ہے،

مل کر صنم سے اپنے ہنگام دل کشائی — ہنس کر کہا یہ ہم نے اے جاں بسنت آئی
سنتے ہی اس پری نے گل گل شگفتہ ہو کر — پوشاک زرفشانی اپنی وہیں رنگائی
جب رنگ کے آئی اس کی پوشاک پر نزاکت — سرسوں کی شاخ پر گل پھر جلد اک منگائی
ایک پنکھڑی اٹھا کر نازک سی انگلیوں میں — رنگت پھر اس کی اپنی پوشاک سے ملائی
جس دم کیا مقابل کسوت سے اپنے اس کو — دیکھا تو اس کی رنگت اس پر ہوئی سوائی
پھر تو بصد مسرت اور سو نزاکتوں سے — نازک بدن پر اپنے پوشاک وہ کھپائی
چمپے کا عطر مل کر موتی سے پھر خوشی ہو — سیمیں کلائیوں میں ڈالے کڑے طلائی
بن ٹھن کے اس طرح سے پھر راہ لی چمن کی — دیکھی بہار گلشن بہر طرب فزائی

جس جس روش کے اوپر جا کر ہوا نمایاں — کس کس روش سے اپنی آن و ادا دکھائی

کیا کیا بیاں ہو جیسے جھمکی چمن چمن . . میں — وہ زرد پوشی اس کی وہ طرز دلربائی

صد برگ نے صفت کی، نرگس نے بے تامل — لکھنے کو وصف اس کا اپنی قلم اٹھائی

پھر صحن میں چمن کے آیا بحسن و خوبی — اور طرفہ تر بسنتی اک انجمن بنائی

اس انجمن میں بیٹھا جب ناز و تمکنت سے — گلدستہ اس کے آگے، ہنس ہنس بسنت لائی

کی مطربوں نے خوش خوش آغازِ نغمہ سازی — ساقی نے جامِ زریں بھر بھر کے مے پلائی

دیکھ اس کو اور محفل اس کی نظیرؔ ہر دم
کیا کیا بسنت آ کر اس وقت جگمگائی

قدیم اردو شعرا سے لے کر موجودہ زمانے تک کے شعرا نے اس پُر انبساط و کیف آگیں موسم کو موضوعِ سخن بنایا ہے۔ طوالت کے خوف سے صرف ایک مثال اور دی جاتی ہے:

دشت بنے ہیں گلستاں — کھیت ہیں کشتِ زعفراں

اٹھتی ہے آنکھ جس طرف — خلد نگاہ ہے سماں

آج ہوئی ہے کائنات — فیضِ بہار سے جواں

گل ہے کھلاتی کیا بسنت
زر ہے لٹاتی کیا بسنت

پھول ہیں ساغرِ شراب — غنچہ ہے غمزۂ حجاب

روئے زمیں پہ ہر کہیں — لنڈھتی ہے حسن کی شراب

حسن ہے اور فروغِ حسن — کون و مکاں پہ ہے شباب

مایۂ ناز ہے بسنت
حسن نواز ہے بسنت

دامنِ دشت گو ہمار — حسن سے بھر گئی بہار
کیوں نہ دلوں کو چھین لے — شاہد گل کا یہ نکھار
مہر ہے ذرہ ذرہ آج — قطرہ ہے نافۂ تتار

طرۂ حور ہے بسنت
روکشِ طور ہے بسنت

(پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی)

غزل گو شعرا نے غزلوں میں اس کا ذکر کیا ہے، اسے تشبیہ کے طور پر استعمال کیا، بعض شعرا نے بسنت کی ردیف میں غزلیں لکھیں، مثالاً انشا کی دو غزلوں کے چند منتخب اشعار نیچے نقل کئے جاتے ہیں:

تو نے لگائی آکے یہ کیا آگ اے بسنت — جس سے کہ دل کی آگ اٹھی جاگ اے بسنت
کیفیت بہار کی اس کو تو دے خبر — موجِ نسیم کی طرح اڑ لاگ اے بسنت
ہر شاخ زرد و سرخ و سیہ ہجر یار میں — ڈستے ہیں دل کو آن کے جوں ناگ اے بسنت
صد برگ گہ دکھائے کہ ارغواں بسنت — لاوے ہے ایک تازہ شگوفہ میاں بسنت
پھر بھر کے گلستاں میں مے عیش و جشن سے — دیتی ہے ہر گھڑی مجھے رطلِ گراں بسنت
آتے نظر ہیں دشت و جبل زرد ہر طرف — ہے اب کے سال ایسی ہی اے دوستاں بسنت
گر شاخِ زعفراں اسے کہئے تو ہے روا — ہے فرح بخش واقعی اس حد کو ہاں بسنت

گل سے مرکب بہت سے الفاظ اور محاورے ہیں جو روزمرہ کی بول چال میں بھی استعمال ہوتے ہیں اور ادب میں بھی، اور جن سے ہماری تہذیبی شائستگی کا اندازہ ہوتا ہے، ذیل میں چند مثالیں دی جاتی ہیں:

گلگشت (سیر)، گل پیرہن (معشوق)، گل و لالہ (ارباب نشاط)، گل خندہ (قہقہہ)
گل ریز (پھلجھڑی)، گلبانگ (چہچہہ، آواز، مژدہ، بلبل کی نغمہ سرائی) گلگونہ (غازہ) گلدار
(داغدار) گل زمین (زمین کا عمدہ قطعہ) گلخن (تنور، مجازاً گوڑا کرکٹ) گلفشاں، (چھوٹی
شیشی جس میں گلاب و شراب رکھتے ہیں)، گل کھلنا، گل پھولنا، (کوئی نئی یا انوکھی بات ہونا)،
گل کھلانا (فتنہ انگیزی کرنا)، گل لگانا، گل دینا (جسم میں داغ لگانا) وغیرہ،

ہندوستان میں پھولوں میں گلاب کو خاص اہمیت حاصل ہے اور ہماری تمدنی زندگی
میں اسے زیادہ دخل ہے، اس لیے اس کے ساتھ خصوصاً مرکب الفاظ بنائے گئے ہیں، جیسے
گلاب کے پھول (کنایۃً نازک اور خوبصورت بچے) گلاب پاش، گلاب افشاں، گلاب
جامن، گلابی (ساغر)، گلابی آنکھیں (شربتی آنکھیں)، گلابی جاڑا (ہلکا جاڑا) وغیرہ،

گل لالہ لکھنؤ میں کنایۃً ہندوؤں کے مرگھٹ کو کہتے ہیں[1]

جس طرح گل سے مرکب الفاظ، ترکیبیں اور محاورے بنائے گئے ہیں، اسی طرح پھول
سے بھی مرکب الفاظ بنائے گئے ہیں، جن کا استعمال غیر شستہ کو شستہ اور غیر مہذب کو مہذب بناتا ہے،
یہ الفاظ اور محاورے بول چال میں بھی مستعمل ہیں اور ادب میں بھی، نیچے چند مثالیں
دی جاتی ہیں:

پھول پان (سر انجام کار، برائی بھلائی) پھول کے دن (حسین کا زمانہ)، پھول آنا
(حسین آنا، پھول کھلنا دیا جانا) پھول اٹھنا، پھول ہونا (فاتحہ سوم کا ادا ہونا)، پھول
پڑنا (آگ لگنا، بد دعا) پھول چننا (ہندوؤں کی ایک رسم تیجے کے دن مردے کی ہڈیاں
جن کو پھول کہتے ہیں، مرگھٹ میں سے چن کر گنگا جی بھیجتے ہیں[2]) ہوا سونگھ کے رہنا (بہت

---

[1] سید احمد دہلوی، فرہنگ آصفیہ جلد اول [2] نور الحسن نیر، نور اللغات، جلد چہارم،

کم کھانا، عورتوں کی زبان) پھول نہیں پنکھڑی سہی (بہت نہیں تھوڑا ہی سہی)، پھول پینا (شراب پینا) پھولوں میں تلنا (نازک چیز) پھول ڈالنا (آگ کی چنگاری ڈالنا) وغیرہ،

بعض درخت بھی ہماری تمدنی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں، سرو، شمشاد، صنوبر، چنار، آبنوس، فراش، ریحان، انار وغیرہ کا ہمارے اعلیٰ ذوق اور ادب سے گہرا تعلق ہے، ہندوستان میں برگد کے درخت کی اس کے سائے کی وجہ سے اہمیت ہے، پیپل اور تلسی کو ہندو متبرک سمجھ کر پوجتے ہیں، ان کے علاوہ آم، املی، املتاس، نیم، بان، کیکر، پاکڑ، ببول وغیرہ کے درخت بھی ہماری تمدنی زندگی میں مختلف حیثیتوں سے اہمیت رکھتے ہیں، اردو ادب ان کے تذکرے سے خالی نہیں، بعض درختوں پر مستقل نظمیں ملتی ہیں، قصیدہ گو شعرا نے بہاریہ قصائد میں پھولوں اور پھلوں اور پودوں کے ساتھ درختوں کا بھی ذکر کیا ہے اور زمین قرطاس پر دلفریب بہار کا سماں دکھایا ہے:

پھل اور خشک میوے:

ہندوستان کی زمین ان نعمتوں کے لئے کچھ زیادہ موزوں نہیں ہے، پھر بھی خاصی تعداد میں یہاں پھل ہوتے ہیں، ان میں سے اکثر کے ہندوستانی نام اردو میں داخل ہو کر اردو الفاظ بن گئے ہیں، مثلاً

آم، جامن، چیکو، کیلا، کنولا، کرنا، سنترہ، نارنگی، موسمی، لیچی، گوندنی، رس بھری، کٹھل، بڑھل، کھرنی، سیتا پھل، سدا پھل، امرت پھل، بیر، آڑو، بھولسری، کروندا، پپیتا (پیپیا)، سنگھاڑا، وغیرہ،

ہندوستان کا بہترین اور مقبول ترین پھل آم ہے، یہاں کی زمین اور موسم اس کی پیداوار کے لیے بہت موزوں ہیں، اس کی پیداوار بھی زیادہ ہوتی ہے، اور قسمیں بھی بہت

ہیں، امیر خسرو نے اس کی تعریف میں قصیدہ لکھا تھا، اور اسے ہندوستان کا سب سے افضل پھل اور فخرِ گلشن کہا تھا، ان آموں کے نام جو اردو میں مستعمل ہیں، ان میں سے اکثر بڑے شستہ ہیں، اور ان سے اس زبان کے بولنے والوں کی شائستگی کا اظہار ہوتا ہے، مندرجۂ ذیل ناموں میں آم ہی کی سی لطافت و نفاست پائی جاتی ہے،

ثمر بہشت، ثمر طوبیٰ، شرف الثمر، سلطان الثمر، محمود الثمر، تاج الاثمار، دل فریب، شاہ انگبیں، ماہ بوستانی، حسن آرا، فردوس، نشاطی، زعفران، زرد آلو، خداداد، نازک بدن، آب حیات، شیرۂ حیات، شہد لوزہ، بتاشا، گلاب جامن، گلاب خاص، خاص الخاص، الماس، نیلم، ابر نیساں، شیام برن، دسہری، سپیدی، سبز پری وغیرہ،

آم کا جو عام استعمال ہے، اس کے علاوہ یہ بعض اور طریقوں پر بھی استعمال ہوتا ہے، اس کا اچار بنتا ہے، مربہ بنتا ہے، کھٹائی بنتی ہے، چٹنی بنتی ہے، سالن اور خصوصاً دال میں اس کے قتلے ڈالے جاتے ہیں، جو سالن یا دال کو لذیذ تر بنا دیتے ہیں، اس کے رس سے روٹیاں تیار ہوتی ہیں، جسے اماوٹ کہتے ہیں،

پھولوں کی طرح ایرانی پھلوں کی بھی قلمیں ہندوستان لائی گئیں، اکبر کے عہدِ حکومت میں ولایت کے بیشتر پھل جو ہندوستان میں نہیں تھے، بہم پہنچائے گئے[1]، درختوں میں پیوند لگانے کا رواج بھی اکبری عہد میں عام ہوا[2]، ایرانی پھلوں کے نام فارسی اور بعض عربی نام اپنی اصلی شکل میں اردو میں داخل ہو گئے، مثلاً، انار، انگور، انجیر، سیب، ناشپاتی، بہی، خوبانی، شفتالو، زرد آلو، شاہ آلو، آلوچہ، گلابی، عناب، خربزہ، تربوز، شہتوت، فالسہ وغیرہ۔

ملا نعرتی کی مثنوی "علی نامہ" میں پھلوں کا باغ اس طرح لہلہاتا نظر آتا ہے:

---

[1] جہانگیر، مرزا احمد ہادی، توزک جہانگیری، ص ۴، [2] ایضاً، ص ۲۵۴،

سیہ ابر ہو نور برسیا سو تند | ہوئے سیب اس صاف پانی کی بند
جو داکان کے خوش رنگیلے دسیں | منور قندیلاں کے جبیلے دسیں
ہوا حقۂ لعل ہر یک انار | دسیں جامنیاں عقد نیلم کے سار
بھریا کوزہ ہر آنب کا نیر سات | جموئے ہیں بن بھاکہ آب حیات
لبالب دسے جام میں خوش گلاب | ٹپکتا ہے انجیر سوں شہد ناب
ہوئے شالواں شربتی کم کمی | لبان نرم کھرائی تے فرنی جمی
پھنس طرفہ صندوق بے دانہ دار | بھریا میوہ ہر خانہ بھتر دل بہار
کلیاں پر دکھیں انھی انفاں سوں پیوند | ہر یک نارنگی کے بھبیلیاں تے گیند
ہر یک موز کی چھاک پیچے پر سوڑ | دکھیں دلبراں اپنی انگلیاں مروڑ

خشک میوے امرا کے دستر خواں کی زینت بھی بنتے ہیں اور دوا کے طور پر بھی استعمال ہوتے ہیں، تمدنی زندگی میں ان کی اہمیت فواکہات سے بھی زیادہ ہے، خشک میوؤں کے اکثر نام عربی یا فارسی سے اردو میں آئے ہیں، مثلاً کشمش، منقا، بادام، پستہ، چلغوزہ، خرما، انجیر وغیرہ،

خشک میوؤں کے چند ہندی نام جنھیں اردو نے اپنے اندر جذب کر لیا ہے، اخروٹ، چرونجی، گری، چھوہارا وغیرہ ہیں۔

باغ:

پھول پھل اور درخت کے ساتھ باغ اور چمن کا تصور خود بخود ذہن میں ابھرتا ہے۔ ہندوستان مجموعی طور پر ایک سرسبز و شاداب ملک ہے، اس لئے یہاں قدرتی سبزہ زار کی کمی نہیں، البتہ اہل ہند کو باغبانی کا شوق کم تھا، جب وسط ایشیا کے مسلمان ہندوستان

داخل ہوئے اور یہاں آباد ہو گئے تو انھوں نے اس کمی کو پورا کر دیا۔ تیموریوں کو خصوصاً باغ و چمن سے دلچسپی تھی اور انھوں نے ملک کے اکثر حصوں کو چمن زار بنا دیا۔ ابوالفضل کے بیان کے مطابق پہلے باغوں میں پھولوں کے نصب کرنے میں بے ترتیبی ہوتی تھی۔ لیکن جب حضرت فردوس مکانی (بابر) نے ہندوستان کو عزت بخشی تو خیابان بندی اور طرح آرائی نمودار ہوئی اور عمارتہای دلکشا، و آبشار ہای سامعہ افروز، نے اہل عالم کو حیرت زدہ کر دیا[1]۔ تیموری شہنشاہوں کے ذوق کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ہمایوں کے باغبانوں نے کشتی پر باغ لگا رکھا تھا اور یہ باغ دریا میں چلتا پھرتا نظر آتا تھا[2]۔ کشمیر کو اس کے قدرتی حسن اور شادابی کے علاوہ فردوس زمین بنانے والے دراصل مغل شہنشاہ ہیں۔ دہلی، آگرہ، کشمیر، لاہور وغیرہ میں ان شہنشاہوں کے لگوائے ہوئے باغات میں سے متعدد باغ آج بھی انکے مذاق باغبانی، جمالیاتی ذوق اور لطافت پسندی کا ثبوت دے رہے ہیں۔ ان کے لگوائے ہوئے باغات میں سے چند کے نام یہ ہیں:

انگوری باغ، چمن مریم، باغ نیلوفر، باغ دلکشا، باغ گل افشاں، باغ نور افزا، باغ دل آمیز، باغ نولکھا، آرام باغ، خسرو باغ، باغ نشاط، باغ نسیم، باغ مراد، باغ شالامار، باغ بیگم (جہاں آرا)، باغ روشن آرا، باغ سرہندی، قدسیہ باغ، مہتاب باغ، باغ حیات بخش وغیرہ،

یہ تمام نام اردو میں بھی استعمال ہوتے ہیں اور اسی قسم کے اور نام بنائے گئے ہیں، ان باغوں کے شادابی و دلفریبی میں اضافہ کرنے کے لئے اکثر و بیشتر باغوں میں

---

[1] آئین اکبری، آئین پیدائش خوشبو، ص ۶۵، [2] سید صباح الدین عبد الرحمن، ہندوستان کے سلاطین حکمرانوں کے عہد کے تمدنی کارنامے، ص ۱۰۰، بحوالہ قانون ہمایونی، ص ۶۰-۵۰۔

نہریں اور وسط میں وسیع و عریض خوبصورت حوض بنوائے جاتے تھے، مثلاً انگوری باغ میں "عجیب و غریب صورت کا ایک حوض بھی بنا ہوا تھا..... وسط حوض میں فوارے تھے، اس حوض میں پانی کے بجائے گلاب اور کیوڑے کا عرق بھرا رہتا تھا[1]۔ باغ حیات بخش میں ساٹھ گز لمبا اور ساٹھ گز چوڑا حوض تھا، اس کے بیچ میں چاندی کے انچاس[۴۹] فوارے لگے ہوئے تھے، جو دن رات چھوٹتے تھے، اس کے کناروں پر چاروں طرف بارہ[۱۲] فوارے چاندی کے تھے، وہ بھی نہر کے سبب دن رات چھوٹا کرتے تھے، حوض کے چاروں طرف سنگ سرخ کی نہر چھ گز کے عرض کی بہتی تھی اور ہر ہر نہر میں تیس تیس فوارے چاندی کے ہر وقت چھوٹتے رہتے تھے[2]، باغ حیات بخش کے مغرب میں ایک دوسرا باغ مہتاب باغ تھا" جس کے چپے چپے پر نہریں بھی تھیں اور حوض بھی[3]۔ باغ شالامار میں" بہت خوبصورتی سے نہریں اور حوض اور مکانات بنے ہوئے تھے[4]،

نوابانِ اودھ نے بھی لکھنؤ کو باغات کا مرکز بنا دیا تھا، عالم باغ، وزیر باغ، سکندر باغ، موسیٰ باغ، بادشاہ باغ، عیش باغ، نشاط باغ، بدریا باغ، ولایتی باغ[5]، حضور باغ وغیرہ میں سے اکثر کا وجود اب نہیں رہا، لیکن ان کے نام اس عہد کی اور مابعد کی تصنیفات میں محفوظ ہیں، اور اس دور کی تمدنی زندگی کی یاد دلاتے ہیں۔

شہنشاہان دہلی اور نوابان اودھ کے اس ذوق باغبانی اور شوق چمن آرائی کا اثر امرا و اعیان سلطنت پر بھی پڑا، اور ملک میں باغات کی کثرت ہو گئی، ان کی تفصیل زیر بحث

---

[1] سید صباح الدین عبد الرحمٰن، کتاب مذکور، ص ۱۰۶ - ۱۰۷۔ [2] سرسید احمد خاں، آثار الصنادید، دوسرا باب ص ۴۶۔ [3] سید صباح الدین عبد الرحمٰن، کتاب مذکور، ص ۱۰۶ - ۱۰۷۔ [4] سرسید احمد خاں، کتاب مذکور، تیسرا باب، ص ۷۰ - ۷۱۔ [5] اس باغ میں اکثر درخت ولایتی تھے۔

موضوع سے خارج ہے، اس لئے مثالاً صرف ایک باغ کا ذکر کیا جاتا ہے، نواب مقرب خاں نے جو جہانگیر کے معتمد خاص تھے کیرانہ (ضلع مظفر نگر) میں جو ان کی جاگیر میں تھا، ایک باغ لگوایا تھا جس کا رقبہ ایک سو چالیس بیگھا تھا، باغ کے وسط میں ایک حوض تھا جس کا طول ۲۲۰ گز تھا اور عرض ۲۰۰ گز، حوض کے بیچ میں صفۂ ماہتابی بائیس مربع گز تھا، کوئی گرم یا سرد میوہ ایسا نہ تھا جس کے درخت اس باغ میں نہ ہوں، یہاں تک کہ نہال پستہ بھی موجود تھا، سرو کے درخت تین سو کی تعداد میں تھے، اور ایسے خوبصورت کہ جہانگیر کے الفاظ میں "تا حال بایں خوبی و لطافت سرو بنظر در نیامدہ باشد"[1]

ان باغوں کے وجود سے اہل علم و ادب کے جمالیاتی ذوق نے تسکین پائی اور باغ و راغ، گل و سبزہ وغیرہ نے شعر و ادب میں بھی جگہ حاصل کر لی، ان کی مناسبت سے لفظوں ترکیبوں اور محاوروں کی کثرت نے اردو کے چمن کو باغ و بہار بنا دیا، خود باغ کے لئے متعدد الفاظ استعمال ہونے لگے، مثلاً گلشن، گلستاں، بوستاں، گلکدہ، گلبن، گل و گلزار، باغ و راغ، چمن، چمنستان، بہارستان وغیرہ، باغ ہی کے تعلق سے باغبان، خیابان، روش، جدول، تختۂ گل وغیرہ جیسے شگفتہ الفاظ اردو کے چمن میں داخل ہوئے،

باغ نے ہماری تمدنی زندگی میں اس حد تک دخل پایا ہے، کہ لغوی معنی سے ہٹ کر بھی اس کے مختلف معنی ہو گئے ہیں، مثلاً،

باغ دُول (اولاد، بال بچے)، باغ باڑی (آرایش، برات کے ساتھ کاغذی باغ کی ٹٹیاں بنا کرلے جاتے ہیں جو عروس کے مکان کے قریب اڑائی جاتی ہیں)، باغ و بہار (آراستہ، بارونق)، باغ قدس (بہشت)، باغ قالی (وہ پھول بوٹے جو قالین پر بنے ہوتے ہیں)،

---

[1] توزک جہانگیری، ص ۲۸۶۔

باغ کامرانی (خوش نصیبی)، باغ شیر میں (دربار بدکا چوتھا شعر)، باغ لگانا (مضامین رنگین جمع کرنا، رونق دینا)، باغ میں سناٹا ہونا (گھر میں بے رونقی ہونا)، باغبان ازل (خدائے تعالیٰ)، ۔

سبزہ:

سبزے کا ذکر بھی یہاں ضروری ہے، یہ بھی ہماری تمدنی زندگی میں اہمیت رکھتا ہے، اردو نے فارسی سے سبزہ زار، مرغزار وغیرہ لئے جو آدمی اور چرند پرند سب کے لئے یکساں اہم ہیں، سبزۂ بیگانہ، سبزۂ خوابیدہ، پنجۂ مریم شعر و ادب کو تازگی بخشتے ہیں، دوب بھی اپنے اندر ایک کشش رکھتی ہے، اس قسم کی لیکن اس سے کمزور بےکس ہے[1]، پتھر چٹا، بلی لوٹن، بن چری، دھامنی، ہرن کھری، بھیل بھیلی وغیرہ گھاس یا سبزے کی مختلف قسمیں ہیں، بوٹی اور بیل کی بھی کچھ کم اہمیت نہیں ہے، چھوئی موئی، سکہ درشن، ناگ پھنی، امر بیل، اکاس بیل، عشق پیچاں وغیرہ کتنے شستہ نام ہیں جو اردو میں مستعمل ہیں،

باغ، پھول، سبزہ وغیرہ ہماری تمدنی زندگی میں علامتی طور پر بھی استعمال ہوتے ہیں، شعر و سخن میں تو یہ چیزیں اس حد تک دخیل ہو گئی ہیں کہ ان کے بغیر لطف سخن کا تصور نہیں ہو سکتا، یہ اتنی ہی اہم ہیں جتنے بادہ و ساغر، یہ چیزیں شاعر کے خیالات میں حسن، جذبات میں نیرنگی اور کلام میں تازگی کا باعث ہوتی ہیں، تشبیہ، استعارہ، علامت وغیرہ کے طور پر ان کا استعمال کثرت سے ہوتا ہے، نیچے چند مثالیں دی جاتی ہیں؛

کہا میں نے کتنا ہے گل کا ثبات — کلی نے یہ سن کر تبسم کیا (میر)

گل پھینکے ہے غیروں کی طرف بلکہ ثمر بھی
اے خانہ برانداز چمن کچھ تو ادھر بھی (سودا)

---

[1] ظفر الرحمٰن دہلوی، کتاب مذکور، ج ۵ ۔

سب نے دیکھا چمن دہر کو، پر اہلِ نظر — ہیں وہی لوگ جنھوں نے چمن آرا دیکھا
(داغ)

کبک و قمری میں ہے جھگڑا کہ چمن کس کا ہے — کل بتا دے گی خزاں یہ کہ وطن کس کا ہے۔
(حالی)

اٹھتے ہی ہائے یار کے باغ کا باغ اجڑ گیا — پھول بھی ہیں تباہ سے، سبزہ بھی پائمال سا
(جگر مراد آبادی)

کھل کے گل کچھ تو بہار اپنی صبا دکھلا گئے — حسرت اُن غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے
(ذوق)

رخصت ہو باغباں کہ ذرا دیکھ لیں یہ چمن — جاتے ہیں واں جہاں سے پھر آیا نہ جائے گا
(سودا)

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا — ورنہ گلشن میں علاجِ تنگیِ داماں بھی ہے
(اقبال)

یہ حسرت رہ گئی کیا کیا مزوں سے زندگی کرتے — اگر ہوتا چمن اپنا، گل اپنا، باغباں اپنا
(مہتاب مظفر)

جھپٹی ہیں مآلِ گل مگر کیا زورِ فطرت ہے — سحر ہوتے ہی کلیوں پر تبسم آ ہی جاتا ہے
(جوش ملیح آبادی)

سودا کا مندرجہ ذیل قطعہ گلشن و بہار اور گل و بلبل کی علامتی شاعری کا ایک اچھا نمونہ کہا جا سکتا ہے،

باغ دلی میں جو اک روز ہوا میرا گزر — نہ وہ گل ہی نظر آئے، نہ وہ گلشن نہ بہار
نخل گھیے بار پڑے، سوکھی پڑی ہیں روشیں — خاک اڑتی ہے، ہر ایک طرف پڑے ہیں خس و خار
مسکرا تا تھا جہاں غنچہ و گل ہنستا تھا — اشک شبنم کے بھی قطرے کے نہیں واں آثار
جس جگہ جلوہ نما رہتے تھے سرو و شمشاد — مشت پر قمری کے اس جا نظر آئے اک بار
دیکھتا کیا ہوں مگر سوکھی سی اک شاخ و پر — عندلیب ایک ہے بے بال و پر و دل افگار
بدم سرد و بصد حسرت و صد سوز جگر — دیکھ کر سوئے چمن کہتی ہے با نالۂ زار
حیف! در چشم زدن صحبت یار آخر شد — روئے گل سیر ندیدیم و بہار آخر شد

پھول زینت و آرایش اور خوشبو دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے اس کی خوشبو سے بزم مہکنے کے علاوہ اس سے تیل، عطر اور عرق بھی تیار ہوتے ہیں؛ جو نجی زندگی سے لیکر مجلسی

زندگی کی تقریباً ہر منزل میں فرحت اور شادمانی کا باعث بنتے ہیں، چنبیلی، بیلا، گلاب، موتیا، موگرا، سیوتی، چمپا وغیرہ میں بسائے ہوئے تیل عام طور پر بازار میں ملتے ہیں، چنبیلی، گلاب (گل روغن)، بیلا اور موگرے کے تیل زیادہ مقبول ہیں، عطر گلاب میں گلاب، چنبیلی، کیوڑہ، گل حنا، چمپا، ہارسنگھار وغیرہ کے عطر مشہور و مقبول ہیں، عطر گلاب جو ملکہ نور جہاں کی والدہ کی ایجاد ہے خصوصاً زیادہ پسند کیا جاتا ہے، جہانگیر نے اس کا ذکر شاعرانہ انداز میں کیا ہے، وہ کہتا ہے کہ اس میں اس قدر خوشبو اور عطریت ہے، کہ اگر اس کا ایک قطرہ ہتھیلی پر مل لیا جائے تو پوری محفل معطر ہو جاتی ہے، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گلاب کی بہت سی کلیاں دفعتہً کھل اٹھتی ہیں، اس کی خوشبو سے نڈھال جی کو سکون ملتا ہے اور پژمردہ طبیعت شگفتہ ہو جاتی ہے[1]، جہانگیر نے ایجاد کنندہ کو اس کے صلے میں موتیوں کا ایک ہار عنایت کیا تھا اور سلیمہ سلطان بیگم (جہانگیر کی سوتیلی ماں)، نے اس عطر کا نام عطر جہانگیری رکھا تھا[2]، لیکن یہ چل نہ سکا، گلاب اور کیوڑے کے پھولوں سے عرق بھی کھینچتے ہیں، نارنج اور ترنج کے پھولوں سے بھی عرق کھینچا جاتا ہے، اسے عرق بہار کہتے ہیں،

ہندوستان میں خوشبویات اور عطریات کا استعمال مسلمان بادشاہوں کے عہد میں خصوصاً زیادہ ہوا، دربار میں کوئی بھی اجتماع ہوتا تو گلاب کے عرق حاضرین پر برابر چھڑکے جاتے اور دربار کی فضا معطر رکھی جاتی[3]، یہ طریقہ ہندوستان کی مجلسوں میں آج تک جاری ہے، شادی بیاہ کے موقع پر تو عام آدمی کے یہاں بھی گلاب یا کیوڑے کا عرق حاضرین مجلس پر چھڑکا جاتا ہے، قدیم زمانے میں امرا اور رؤسا کے پینے کے پانی میں بھی گلاب یا کیوڑے کا عرق ملایا جاتا، اس پر سے شربت کا قیاس کیا جا سکتا ہے، بعض کھانوں، مثلاً پلاؤ، زردہ، مزعفر، فرینی وغیرہ پر کیوڑے کا

---

[1] تزک جہانگیری، ص ۱۴۲، [2] ایضاً، [3] سید صباح الدین عبدالرحمٰن، کتاب مذکور، ص ۳۰-۲۲۹۔

عرق چھڑکنے کا رواج متوسط طبقے کے لوگوں تک کے یہاں پایا جاتا ہے،

پھول مختلف ادویہ کی تیاری میں بھی کام آتے ہیں، یہاں خوشبو کی شرط نہیں، عرق گلاب گلقند وغیرہ تو عام آدمی کی زبان پر بھی ہیں۔ نیلوفر، چاندنی، سیوتی، بنفشہ، کسم، ٹیسو، گاؤ زبان، گل انار، گل حنا وغیرہ دواؤں میں استعمال ہوتے ہیں، بوٹیوں سے بھی مفید دوائیں تیار ہوتی ہیں، مثلاً فرید بوٹی، بابونہ، برم ڈنڈی، بکائن وغیرہ،

مذکورۂ بالا تمام چیزوں کا تہذیب و تمدن سے گہرا تعلق ہے۔ اس لئے اردو زبان نے ان کا اثر قبول کیا، ان چیزوں کو نثر کے علاوہ شعر و سخن کی بزم میں بھی بار ملا، مثلاً

یہی ہیں وہ شمیم انگیزیاں عطرِ محبت کی ۔۔۔ کہ جن سے بوستانِ ہند برسوں تک معطر تھا
(شبلی)

ہے مجھے گریبانِ گلِ صبح معطر ۔۔۔ میں عطرِ نسیمِ چمن باد صبا ہوں
(مصحفی)

حسنِ علی کو دیکھ کے ایسا اڑا ہے رنگ ۔۔۔ گویا عرق کھنچا ہے گلِ آفتاب کا
(ناسخ)

عطرِ عنبر کا نکالا جو کبھی کنگھی کی ۔۔۔ کیڑے بدلے جو کسی روز کیوڑا کھینچا
(رشک)

بہادر شاہ ظفر زمانۂ شاہزادگی میں ایک بار بیمار ہوئے، جب انھوں نے شفا پائی تو بادشاہ نے جشنِ غسلِ صحت منعقد کیا، اس موقع پر ذوق نے ایک قصیدۂ تہنیت پیش کیا جس کی تشبیب میں بیماری کی مناسبت سے انھوں نے مختلف اشیا کے نام لئے ہیں، جو دوا کے طور پر استعمال ہوتی ہیں، ابتدائی اشعار میں پھولوں کے نام آئے ہیں،

واہ وا کیا معتدل ہے باغِ عالم کی ہوا
مثلِ نبضِ صاحبِ صحت ہے ہر موجِ صبا

بھرتی ہے کیا کیا مسیحائی کا دم بادِ بہار
بن گیا گلزار عالم رشکِ صد دار الشفا

ہے گلوں کے حق میں شبنم مرہم زخم جگر
شاخ بشکستہ کو ہے باراں کا قطرہ مومیا
ہو گیا موقوف یہ سودا کا بالکل احتراق
لالۂ بے داغ سیہ پانے لگا نشو و نما
ہو گیا زائل مزاج دہر سے یاں تک جنوں
بید مجنوں کا بھی صحرا میں نہیں باقی پتا
ہوتا ہے لطف ہوا سے اس قدر پیدا لہو
برگ میں ہر نخل کے سرخی ہے جوں برگ حنا
پائی یہ اطلاع صفرا نے کہ دنیا میں کہیں
زرد چشم اب دیکھنے کو بھی نہیں ہے کہربا
ہر مزاج بلغمی میں ہوتی ہے تولید خوں
چاندنی کا پھول ہو گر ارغوانی ہے بجا

۴

آدابِ معاشرت

ہندوستانی معاشرت میں بڑی نیرنگی ہے اور اس میں بہت اتار چڑھاؤ آئے ہیں، اجمالی طور پر اس کی پانچ قسمیں کی جاسکتی ہیں، (۱) ہندوانہ معاشرت، (۲) مسلم معاشرت، (۳) ہندو مسلم اتحاد کے بعد کی معاشرت (۴) انگریزی تہذیب سے متأثر معاشرت، (۵) انگریزی معاشرت، ان پانچوں قسموں کی معاشرتوں کے عکس اردو زبان میں دیکھے جاسکتے ہیں۔

سلام و دعا اور آدابِ گفتگو:

مسلمان اپنے ساتھ سلام مسنون (السلام علیک یا السلام علیکم)، مصافحہ، معانقہ اور مشایعت لائے تھے، ہندو مسلم میل جول اور اتحاد کے نتیجے میں آداب، بندگی، تسلیم، تسلیمات، کورنش، کورنشات وغیرہ بھی استعمال ہونے لگے، جواب میں برابر والے وہی الفاظ (آداب، تسلیم، کورنش وغیرہ) دہراتے ہیں، لیکن بڑے چھوٹوں کو دعا دیتے ہیں، مثلاً جیتے رہو، خوش رہو، صاحب اقبال ہو وغیرہ، سلام و دعا کے بعد مزاج پرسی ہوتی ہے، اس کے لئے اردو میں عموماً یہ الفاظ استعمال ہوتے ہیں: مزاج شریف، مزاج مبارک، مزاج عالی، مزاج گرامی، مزاج اقدس، مزاج والا، مزاج معلّٰی وغیرہ، جواب میں عموماً الحمد للہ کہا جاتا ہے۔ مگر ہندوستانی تہذیب نے چند اور جواب ایجاد کئے، مثلاً، جناب کی دعا ہے، لطف و کرم

کرم گستری، دعا کرتا ہوں وغیرہ، اگر نام پوچھنے کی ضرورت پیش آتی ہے تو یوں پوچھتے ہیں،
اسم شریف؟ اسم گرامی؟ اسم مبارک؟ جناب کا اسم مبارک؟ نام نامی؟ وغیرہ، جس جگہ سے
آدمی آیا ہے یا وطن پوچھنے کی ضرورت ہو تو پوچھتے ہیں: دولت خانہ، جناب کا دولت خانہ؟
وطن مالوف؟ وغیرہ،

مخاطبت میں اردو نے عجم کے ذوقِ نفاست سے کام لیا، جان کا لفظ ایران میں محبت
وشفقت کے اظہار کے لئے استعمال کیا جاتا ہے، ہندوستان کے مہذب گھرانوں میں یہ لفظ
مخاطبت میں عام طور سے استعمال ہونے لگا، جیسے، ابا جان، اماں جان، خالو جان، خالہ جان
آپا جان وغیرہ، لکھنؤ اور اس کے اطراف میں ابا جانی، اما جانی وغیرہ بھی کہتے ہیں، ہندی کا
"جی" بھی جو احترام کے لئے مستعمل ہے، اردو نے قبول کر لیا، چنانچہ ہندوستان کے بعض علاقوں
میں ابا جی، اماں جی وغیرہ بولنے کا رواج ہے، اماں اور ابا کو امی یا امی حضور، اور ابا حضور سے
بھی مخاطب کرتے ہیں، بڑی بہن کو آپا یا آپا جان کے علاوہ باجی بھی کہا جاتا ہے، آپا اور باجی
دونوں ترکی لفظ ہیں اور مسلمان مہذب گھرانوں میں عام طور پر بولے جاتے ہیں، خادمائیں
گھر کے بزرگوں کو میاں، حضور، سرکار وغیرہ اور بڑی عورتوں کو بی بی، بیگم، بیگم صاحبہ وغیرہ الفاظ
سے مخاطب کرتی ہیں، بہو کو بہو بیگم کہہ کر مخاطب کیا جاتا ہے، ہندوستانی الفاظ میں سے اردو نے
اکثر کو تراش خراش کے بعد استعمال کیا، مثلاً چاچا کو چچا (چچا جان)، چاچی کو چچی (چچی جان)، ماما کو
ماموں (ماموں جان) بھیا کو بھائی (بھائی جان) بنا دیا، چچا کو تایا بھی کہتے ہیں، ہندوستان کے
بعض علاقوں میں بڑے چچا کو بڑے ابا کہنے کا رواج ہے، بڑے بھائی کو آکا یا آکا بھائی بھی
کہتے ہیں، جو ترکی زبان کا لفظ ہے، قدیم اردو میں بڑے بھائی کے لئے بیرن کا لفظ ملتا ہے، جو
ہندی ہے اور استعمال کے لحاظ سے عورتوں سے مخصوص تھا۔

اگر بڑوں کا ادب اور احترام ملحوظ رکھا گیا، تو چھوٹوں سے شفقت کا اظہار کیا گیا، انھیں اردو میں اس طرح مخاطب کیا جاتا ہے، بابو، بیٹا، بیٹے، بھتیجے، میاں لڑکے، صاحبزادے، میاں صاحبزادے، ننھے، ننھے میاں، بیٹی، بٹیا، بٹیا رانی، صاحبزادی، بی بی، اچھی بی بی، ننھی، منّی وغیرہ، یہاں اردو نے ہندی یا ہندوستانی الفاظ زیادہ قبول کئے، بھیا کا لفظ پیار اور محبت سے برابر والوں اور چھوٹوں کے لئے بھی مستعمل ہے، مثلاً عورتیں بچوں کو بہلانے کے لئے کہتی ہیں، کچی کچی کوا کھائے، دودھ ملیدہ بھیا کھائے۔

ہندوستان نے انگریزی تہذیب کا بہت کافی اثر قبول کیا، بہت سے ہندوستانی تو انگریزیت میں ڈوب گئے، لیکن سلام ودعا اور طرز مخاطبت میں اردو بہت کم متاثر ہوئی گنتی کے چند الفاظ اس نے قبول کئے، مثلاً ممی، بے بی وغیرہ۔

اوپر کے تمام الفاظ اپنوں کے لئے یا گھر کی چہار دیواری کے اندر مستعمل ہیں، گھر سے باہر بڑوں کے لئے مخاطبت میں یہ انداز اختیار کیا گیا، جناب، عالیجناب، جناب عالی، جناب والا، حضور، سرکار، حضرت گرامی، قبلہ، قبلہ و کعبہ، بندہ نواز وغیرہ، افسران عالی کے لئے پہلے عموماً یہ الفاظ استعمال ہوتے تھے، حضور، حضور والا، سرکار، سرکار والا، بندگان عالی، بندہ پرور، خداوند نعمت وغیرہ، بادشاہ کو بادشاہ سلامت، خداوند نعمت صاحب عالم وغیرہ الفاظ سے مخاطب کرتے تھے، لیکن اب اس قسم کے الفاظ کا استعمال بہت کم بلکہ شاذونادر ہوتا ہے۔

مذکورۂ بالا الفاظ سے ادب، احترام اور حفظ مراتب کا اظہار ہوتا ہے، اس کے برعکس خاکساری اور نیازمندی کے اظہار کے لئے اس قسم کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں: خاکسار، نیازمند، نیازکیش، نیاز آگیں، فدوی، بندہ، غلام، خادم، خدمت گار، خانہ زاد، حقیر،

فقیر، ہیچمداں، ہیچ میرز، نمکخوار، حلقہ بگوش، کمترین، بندہ زادہ، بندہ زادی، بندی، لونڈی، کنیز، وغیرہ،

اردو میں ضمیر مخاطب کا استعمال اور زبانوں سے مختلف ہے، عربی میں بڑے سے بڑے آدمی کے لئے "انت" استعمال ہوتا ہے، انگریزی میں چھوٹے بڑے سب کے لئے You مستعمل ہے، فارسی میں بھی تقریباً یہی حال ہے، بے تکلفی سے قطع نظر چھوٹے بڑے سب کے لئے "شما" استعمال کیا جاتا ہے، لیکن اردو میں چھوٹے بڑے یا فرق مراتب کا اظہار تم اور آپ کے استعمال سے کیا جاتا ہے، ہمسنوں اور بے تکلف دوستوں کو "تم" سے مخاطب کیا جاسکتا ہے، مگر اپنے سے بڑی عمر والے کو یا جس سے بے تکلفی نہ ہو اس کو "تم" کہنا بقول مولانا عبدالحلیم شررؔ لکھنوی "اردو میں خصوصاً اہل لکھنؤ میں اخلاقی و ادبی جرم ہے"[1]

اردو میں افعال کے ذریعہ بھی فرقِ مراتب کا خیال رکھا جاتا ہے، مثلاً:

بیٹھو،	بیٹھیے،
کہو،	کہیے،
کھاؤ،	کھائیے،
لکھو،	لکھیے،
دیکھو،	دیکھیے،
لو،	لیجیے،

تعلیم یافتہ طبقے میں اظہار خیال میں اور شستگی اور تہذیب برتی جاتی ہے، مذکورۂ بالا افعال کو یوں ادا کیا جاتا ہے،

بیٹھیے،	تشریف رکھیے،

---

[1] گزشتہ لکھنؤ، ص ۲۶۹

کہئے،	فرمایئے،
کھایئے،	نوش فرمایئے،
لکھئے،	تحریر فرمایئے،
دیکھئے،	ملاحظہ فرمایئے،
لیجئے،	قبول فرمایئے،

بات چیت میں جواب میں چھوٹے بڑے دونوں، چھوٹے مخصوصاً، ہاں، یا، نہیں، کہنے کے بدلے جی، جی ہاں یا جی نہیں کہتے ہیں، چھوٹے کا صرف ہاں، یا، نہیں، کہنا بد تہذیبی سمجھا جاتا ہے، کبھی کبھی جی ہاں کے علاوہ جناب، جی جناب بھی کہتے ہیں،

معاشرتی زندگی میں رشتے ناتے بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ اردو میں ان کے لئے جو الفاظ استعمال ہوتے ہیں، ان میں سے بیشتر ہندی یا ہندوستانی ہیں، مثلاً ماں، باپ، بھائی، بہن، بیٹا، بیٹی، دادا، دادی، نانا، نانی، پوتا، پوتی، نواسی، نتنی، چچا، چچی، پھوپھا، پھوپھی، ماموں، ممانی، بھانجا، بھانجی، نند، بھاوج، بھابھی، دیور، جیٹھ، دیورانی، جٹھانی، سالا، سالی، سرہج، سلہج، ساڑھو، سمدھی، سمدھن، ساس، سسر، سسرال، میکا، نہیر، ددھیال، ننھیال وغیرہ، کچھ الفاظ فارسی کے بھی مستعمل ہیں، مثلاً، خسر، خوشدامن، ہم زلف برادر نسبتی، نواسہ، نواسی وغیرہ، اس موقع پر تبنیٰ، لے پالک، رضاعی بھائی اور کوکہ کو بھی بھولنا نہیں چاہئے،

ابتدا میں لکھا جا چکا ہے کہ مسلمان ہندوستان میں داخل ہوئے تو اپنے ساتھ ایک پختہ اور بلند معیار کا تمدن لے کر آئے، مغلوں کے عہد میں ایرانی اثرات نے اس میں اور

---

[1] گذشتہ لکھنؤ، ص ۳۲۹،

نفاست اور لطافت پیدا کی اور اس کے معیار کو بلند تر کیا، اس تمدن کے اثرات اہل ہند کی تہذیبی و معاشرتی زندگی کے ہر پہلو سے نمایاں ہیں، ہندوستان کے شاہی دربار کے اثرات بھی انھوں نے قبول کیے جو آج بھی اعلا اور متوسط گھرانوں میں دیکھے جا سکتے ہیں، پذیرائی، تعظیم و تکریم، حفظ مراتب، خاطر تواضع غرض آداب مجلس کے ہر قدم پر ان کے یہاں سلیقہ، شائستگی اور سنجیدگی پائی جاتی ہے، مثلاً مہمان کا استقبال، مزاج پرسی، خاطر مدارات وغیرہ اردو میں اس انداز سے کی جاتی ہے: تشریف لائیے، تشریف رکھیے، مزاج اقدس؟ کیسے زحمت فرمائی؟ شربت نوش جان فرمائیے، چائے حاضر ہے، حقہ حاضر ہے، حقے سے شوق فرمائیے، ماحضر تناول فرمائیے وغیرہ، رخصت اس طرح کرتے ہیں: خدا حافظ، فی امان اللہ، بڑی عزت افزائی فرمائی آپ نے، پھر تشریف لائیے گا وغیرہ، پذیرائی، خاطر مدارات قدر افزائی وغیرہ کے جواب میں شکریہ اس شستہ طریقے سے ادا کیا جاتا ہے: شکریہ، شکریہ جناب کا، بڑی عنایت فرمائی آپ نے، نوازش، کرم، عزت افزائی، بندہ نوازی، ذرہ نوازی، کرم گستری وغیرہ،

ممنونیت کے مواقع آدمی کو اکثر آتے رہتے ہیں، اردو میں اس کا اظہار یوں کیا جاتا ہے: شکریہ یا جناب کا شکریہ، یا شکریہ جناب کا، شکر گزار ہوں، ممنون ہوں، احسان مند ہوں، وغیرہ، کوئی چیز دی جاتی ہے تو لینے والا کہتا ہے: شکریہ، آداب، آداب عرض، تسلیم، تسلیمات بجا لاتا ہوں وغیرہ،

آداب مجلس کے چند اور اردو الفاظ اور فقرے جن سے بلند مذاق اور اعلیٰ تہذیب کا اظہار ہوتا ہے، کہنے کے بجائے فرمائیے، ارشاد، ارشاد گرامی، دیکھنے کے بجائے ملاحظہ فرمائیے، سننے کے بدلے سماعت فرمائیے، دینے کی جگہ مرحمت فرمائیے، لیجیے کے بجائے قبول فرمائیے وغیرہ،

زبان کی شستگی، طرز بیان کی دلکشی اور لب و لہجہ کی متانت کے نمونے اردو میں معاشرتی زندگی کے سلسلے میں قدم قدم پر ملتے ہیں، اوپر جو چند نمونے گذر چکے وہ زیادہ تر بول چال میں استعمال ہوتے ہیں، خط میں بھی جسے نصف ملاقات کہا جاتا ہے، اس قسم کے شستہ الفاظ، فقرے وغیرہ استعمال میں لائے جاتے ہیں، مثلاً چھوٹوں کو دعا اس طرح دی جاتی ہے:

جیتے رہو، خوش رہو، اقبال مند ہو، سلامت رہو، طال عمرہ، سلمہٗ، سلمہ اللہ وغیرہ،

چھوٹے اپنے بزرگوں کے لئے اس قسم کے دعائیہ الفاظ استعمال کرتے ہیں،

مدظلہٗ، دام ظلہٗ، دام اقبالہٗ، زاد لطفہٗ، زاد لطفکم، دامت برکاتہٗ، دامت عنایتکم، زاد مجدکم وغیرہ،

خود خط کے لئے اس قسم کے متعدد شستہ اور مہذب الفاظ مستعمل ہیں:

والا نامہ، گرامی نامہ، نوازش نامہ، کرم نامہ، محبت نامہ، عریضہ، عرضی وغیرہ،

"خط ملا" کے بدلے اس قسم کے الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں:

صادر ہوا، عزت افزائی کا باعث ہوا، سرفرازی کا باعث ہوا، مسرت کا موجب ہوا، وغیرہ،

شکریہ اس انداز سے ادا کیا جاتا ہے:

یاد فرمائی کا شکریہ، یاد آوری کے لئے ممنون ہوں، کرم فرمائی کے لئے سپاس گزار ہوں وغیرہ،

۵

خورد و نوش

انسانی زندگی کی سب سے پہلی اور سب سے اہم چیز کھانا ہے، اسی ضرورت نے انسان کو محنت و مشقت اور جد و جہد پر آمادہ کیا، ابتداءً کھانا صرف پیٹ بھرنے کے لئے تھا، لیکن معاشرے کی ترقی کے ساتھ ساتھ یہ کام و دہن کی لذت کا بھی سامان بن گیا، اور انسانی ذہن اور شوق نے اس میں ایسی ایسی جدتیں اور اختراعات کیں کہ باید و شاید، مسلمان ہندوستان میں آئے تو اپنا کھانا اپنے ساتھ لائے، جو ہندوستان کے کھانے سے قطعی مختلف تھا، یہاں آباد ہو جانے کے بعد انھوں نے ہندوستانی کھانوں کا بھی اثر قبول کیا۔ امتداد وقت کے ساتھ ان کے کھانوں میں غیر معمولی تنوع پیدا ہو گیا، اس تنوع کا بڑا سبب یہ تھا کہ ہندوستان میں باہر سے جو مسلمان آئے وہ کسی ایک جگہ کے نہ تھے، بلکہ مختلف ممالک (افغانستان، خراسان، تاتار، بخارا وغیرہ) سے آئے تھے۔ ان مختلف ممالک کے رہنے والوں کے مختلف ذوق کی آمیزش نے طرح طرح کے کھانوں کی ایجاد کی، ہندوستانی گرم مسالوں اور سبز اور سرخ مرچوں کے استعمال نے ان کھانوں میں ایک نئی لذت پیدا کی جسے چٹخارا پن کہا جا سکتا ہے،

اوپر لکھا جا چکا ہے کہ ہندوستان میں مختلف جنسوں کی پیداوار ہوتی ہے، ان میں چاول کی پیداوار نسبتہً زیادہ ہوتی ہے۔ اسی لئے ہندوستان کی خاص غذا چاول ہے، مسلمان جو باہر سے یہاں آئے ان کی اصل غذا روٹی تھی، لیکن وہ چاول بھی کھاتے تھے، اس ملک میں

آباد ہو جانے کے بعد انھیں چاول سے اور رغبت ہو گئی، چونکہ چاول ہندوستان کی خاص غذا ہے، اس لیے پہلے اسی سے تیار شدہ کھانوں کا ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے،

چاول عموماً ابال کر پکایا جاتا ہے جو بھات کہلاتا ہے، اور جو آج بھی عام ہندوستانی کی غذا ہے، بھوکا بنگالی بھات ہی بھات پکارے، بڑی مشہور کہاوت ہے، بھات برادری کے مفہوم میں بھی مستعمل ہے، اس سے اس کی عمومیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے، یہی بھات آگے چل کر مسلمانوں کے اثر سے خشکہ بن گیا، خشکے کی پانچ قسمیں ہیں، جو اس کے کثرت استعمال یا مقبولیت کی دلیل ہیں (۱) پچ پچا خشکہ (۲) بھربھرا خشکہ (۳) کنی دار خشکہ (۴) کھرا خشکہ، (۵) گلگتھی،[1] گلگتھی کو بن بھتا بھی کہتے ہیں، بھات یا خشکے کو چاول بھی کہا جاتا ہے، بلکہ اب ہندوستان کے بیشتر علاقوں میں اسی لفظ کا چلن ہے، چاول کو گھی اور پیاز میں بھون کر اور گرم مسالے ڈال کر بھی پکاتے ہیں، اسے پلاؤ کہتے ہیں جو فارسی لفظ ہے، اسے بگھرے یا بگھارے چاول بھی کہا جاتا ہے، ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنانا کی طرح ڈیڑھ چاول الگ بگھارنا بھی محاورہ ہے، جو اسی سے بنا ہے، چاول پکانے کی ایک دوسری شکل یہ ہے کہ اس میں دال ملا دیتے ہیں، جسے کھچڑی کا نام دیا گیا ہے، اسے ابالی کھچڑی بھی کہتے ہیں، سر یا داڑھی کے بال کھچڑی ہونا، محاورے کی بنیاد یہی ہے، اہل استطاعت کھچڑی میں اوپر سے گھی ڈال لیا کرتے ہیں، اس سے مثل بنی گھی کہاں گرا؟ کھچڑی میں، دال اور چاول کو گھی میں بھون کر بھی پکاتے ہیں، اسے بھونی کھچڑی کہتے ہیں، جو پہلے کی بہ نسبت زیادہ لذیذ ہوتی ہے، ایک تیسری شکل یہ ہے کہ چاول میں آلو یا لوکی یا بری یا آلو بری دونوں ملا کر پکاتے ہیں، مسلمانوں نے اپنے مذاق کے مطابق اس میں گوشت کا اضافہ کیا، اسے تہری کہتے ہیں، یہ

---

[1] ظفر الرحمن دہلوی، فرہنگ اصطلاحات پیشہ وراں، ج سوم، ص ۵۲ - ۱۵۱،

دراصل ہندی لفظ تاہری کی بدلی ہوئی شکل ہے، اسی سلسلے میں کھچڑے کا نام بھی لیا جاسکتا ہے۔ جو سات اناج یا کئی اناجوں اور گوشت کو ملا کر پکایا جاتا ہے، اسے ستنجا یا ستناجا[1] (ست اناجا کا مخفف) بھی کہتے ہیں، نذر و نیاز کے موقعوں پر یہ خصوصاً پکایا جاتا ہے، چاول میں گھی اور شکر ملا کر بھی کھانے کا رواج ہے، اسے شکرانہ کہتے ہیں، گھر میں کبھی کبھار کھانے کے علاوہ اس قسم کا کھانا شمالی ہند میں ہندوؤں کی اچھوت ذاتوں میں شادی بیاہ کے موقع پر دیا جاتا ہے[2]، یہ بھی کہا جاتا ہے کہ "برادری میں نام ہونے کے لیے شکرے میں گھی اور کھانڈ کی مقدار زیادہ سے زیادہ ڈالنے پر فخر کیا جاتا ہے[3]"

وسط ایشیا کے مسلمان چاول پکانے کے بہت سے طریقے اپنے ساتھ لائے تھے، اور پھر ہندوستان میں آباد ہو جانے کے بعد انھوں نے اس میں بڑی بڑی جدتیں کیں، شاہی دسترخوان پر میٹھے اور نمکین چاول کے بہتر ستر اقسام ہوتے[4]، یہ حالت نوابانِ اودھ کے زمانے تک رہی، آخری نواب واجد علی شاہ کے زمانے میں "ایک رئیس نے ایک شادی کے موقع پر بمدھی ملاپ کی دعوت کی تھی، جس میں خود فرماں روائے وقت واجد علی شاہ بھی شریک تھے، اس دسترخوان پر نمکین اور میٹھے کل ستر قسم کے چاول تھے[5]، اب ان کھانوں میں سے اکثر کے صرف نام کتابوں کے اوراق میں محفوظ ہیں، نہ اب ویسے کھانے والے رہے اور نہ ویسے پکانے والے اور نہ وہ دنیا اسراف کا زمانہ ہی رہا، لیکن کھانے کا شوق انسان کو بہر حال ہے، اس لئے ان میں سے کچھ کھانے آج بھی نہ صرف اونچے گھرانوں میں بلکہ اوسط درجے کے

---

[1] ظفر الرحمٰن دہلوی، فرہنگ اصطلاحات پیشہ وراں، جلد سوم ص ۱۵۷ [2] ایضاً، ص ۱۵۸ [3] ایضاً، [4] سید صباح الدین عبد الرحمٰن، ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی جلوے، ص ۳۵۴ [5] (مولانا) عبد الحلیم شرر لکھنوی گذشتہ لکھنؤ، ص ۲۴۲

گھرانوں میں بھی پکتے ہیں، ان کھانوں میں سے چند کے نام نیچے دیے جاتے ہیں، جیسے یہ کھانے لذیذ ہیں، ویسے ہی ان کے نام بھی دلچسپ ہیں اور ان سے تہذیبی شائستگی اور جمالیاتی ذوق کا اظہار ہوتا ہے، اردو نے بہت سے فارسی نام بجنسہ اپنے اندر جذب کر لیے ہیں اور بہت سے نام خود اردو کی پیداوار ہیں:

پلاؤ، پریانی، قبولی، شلہ (شولہ)، گلدار، خشکہ، حلیم، ہریسہ، متنجن، زردہ، سفیدہ، دسپیدہ، مزعفر وغیرہ،

پلاؤ کی بیسیوں قسمیں ہیں، ان میں سے چند یہ ہیں:

یخنی پلاؤ، مرغ پلاؤ، کبابی مرغ پلاؤ، نورتن، گلزار پلاؤ، نور محلی پلاؤ، کوکو پلاؤ، موتی پلاؤ، چنبیلی پلاؤ، ایرانی پلاؤ، کشمیری پلاؤ، قورمہ پلاؤ، قلیہ پلاؤ، کوفتہ پلاؤ، پسندہ پلاؤ، دوگوشتہ وغیرہ،

گوشت کے علاوہ بعض دوسری چیزوں کے بھی پلاؤ تیار ہونے لگے، مثلاً سبزی پلاؤ، ماہی پلاؤ، بیضہ پلاؤ، مسور پلاؤ، مٹر پلاؤ، بوٹ پلاؤ وغیرہ، بعض میووں اور پھلوں کے بھی پلاؤ پکائے جانے لگے، جیسے آم کا پلاؤ، اناناس کا پلاؤ، نارنج پلاؤ، سیب پلاؤ، کشمش پلاؤ، گری پلاؤ، خرمہ پلاؤ وغیرہ،

ان لذیذ، مرغن اور خوشبودار کھانوں کے چند اور دلچسپ نام نیچے دیے جاتے ہیں:

نکتی پلاؤ[۱]، آبی پلاؤ، فالسائی پلاؤ، سنہری پلاؤ، روپہلی پلاؤ، نرگسی پلاؤ، زمردی پلاؤ، لال پلاؤ، زعفرانی پلاؤ، لہسنیہ پلاؤ، یخنی لوزینی یا لانہ[۲]، شبنم پلاؤ، حسینی پلاؤ، بیلا پلاؤ، نجمی پلاؤ، عروسی پلاؤ، یاقوتہ[۳] وغیرہ،

۱ے خالد احمدی دہلوی: میرے زمانے کی دلی، نقش ثانی، ص ۵۵، ۷۰۔ ۲ے رشید مسعود رضوی: شاہی دسترخوان کے کھانے، نوائے ادب، بمبئی، ج ۲۳، شمارہ ۲، ص ۸۱۔ ۳ے نور الحسن نیر: نور اللغات، جلد چہارم

بریانی کی چند قسمیں:

زیر بریانی، بالا بریانی، بریانی خام (کچی بریانی)[1]

قبولی کی چند قسمیں:

قبولی ہندی، قبولی ولایتی، قبولی مغلی، قبولی ٹیمی،[2]

لذیذ بریانی کے ساتھ بورانی اور رائتے کو بھی یاد کر لینا چاہیے،

ہندوستان میں چاول کے بعد سب سے زیادہ پیداوار گیہوں اور جو کی ہوتی ہے، جو غریبوں کی خوراک ہے، گیہوں امرا اور اوسط درجے کے لوگوں کے یہاں استعمال ہوتا ہے، اس کے آٹے سے طرح طرح کی چیزیں تیار ہوتی ہیں، چپاتی روزمرہ کا کھانا ہے، سہالی، پوری، کچوری، بڑہی، آلو پوری، مٹر پوری، شکر قند پوری، مال پوا، گلگلا وغیرہ اسی سے بنتے ہیں، اردو نے یہ نام اپنائے ہیں، مسلمانوں نے روٹی کی شکل میں بہت سی نئی چیزیں ملک کو دیں، خود چپاتی کو بہت بہتر بنا دیا پھلکا چپاتی ہی کی ایک قسم ہے، دوستی چپاتی کی ایک اعلیٰ قسم ہے، تنکی ایک دوسری اعلیٰ قسم ہے، اسے مانڈا (مانڈھا) بھی کہتے ہیں، جو عموماً حلوے کے ساتھ کھائی جاتی ہے، اپنے حلوے مانڈے سے کام، کھنا مشہور مثل ہے، پراٹھا بھی مسلمانوں ہی کی ایجاد ہے، اس کی کئی قسمیں ہیں، اور جیسے یہ کھانے میں اچھے ہیں ویسے ہی ان کے نام بھی اچھے ہیں، مثلاً زعفرانی، ورقی، بیگماتی، مغلئی، حیدرآبادی، بہاری وغیرہ، ورقی پراٹھے میں چونکہ کئی پرت ہوتے ہیں، اس لئے اس کا دوسرا نام پرت دار پراٹھا ہے پرت آپس میں بل کھائے ہوئے معلوم ہوتے ہیں، اس لئے اسے بلدار پراٹھا بھی کہتے ہیں[3]، میٹھے پراٹھے بھی بنتے ہیں، ان کے نام بھی شیریں ہیں، جیسے محبوبی، نان، جلیبی، خمیری

---

[1] سید محمد حسن رضوی، شاہی دستر خوان کے کھانے، ص ۶۱ [2] ایضاً، [3] ظفر الرحمٰن دہلوی، فرہنگ اصطلاحات پیشہ وراں، جلد سوم، ص ۱۲۳،

وسط ایشیا کے مسلمان جو ہندوستان میں آباد ہوئے، اپنے ساتھ روٹی لے کر آئے تھے، جیسے آبی (آبی نان) کہا جاتا ہے، اور جو آج بھی عام طور سے بکتی ہے۔ اس نے بھی چپاتی کی طرح ترقی کی مختلف منزلیں طے کیں، آبی سے روغنی ہوئی، پھر ایک لمبی جست لگا کر شیریں اور لذیذ باقرخانی میں تبدیل ہوئی، اور ترقی کی تو شیرمال بن کر کام و دہن کی لذت کا سامان بنی، گاؤدیدہ اور گاؤزبان بھی شیرمال ہی کی قسمیں ہیں یا اس کے دو الگ الگ نام، اول الذکر گول ہوتی ہے اور ثانی الذکر لمبوتری، بعض مقامات پر گول شکل کی روٹی غم کی اور لمبوتری شکل کی خوشی کی تقریب کے لئے مخصوص سمجھی جاتی ہے، اس طرح گول روٹی کے لئے گاؤدیدہ اور لمبوتری کے لئے گاؤزبان عرف بن گئے تھے، جو اب متروک ہوتے جا رہے ہیں، کلچا[1] اور تافتان بھی عمدہ قسم کی تنوری روٹیاں ہیں،

روٹی کے چند مزید دلچسپ نام نیچے دئے جاتے ہیں،

نان اسد خانی، نان نعمت، نان سنگی، نان دریائی، نان پنبیا، نان پنیری، نان بادام، نان پستہ وغیرہ،[2]

روٹیوں کے سلسلے میں چوکا یا چونگا کا ذکر بھی ضروری ہے، یہ نذر و نیاز کے لئے لنگوٹے دار چوپرت پکائی ہوئی میٹھی روٹی ہے۔۔ اور عام طور سے عشرۂ محرم کی نیاز کے لئے پکائی جاتی ہے، جس میں کنایۃً چاروں خلفائے راشدینؓ سے اظہار عقیدت مقصود ہوتا ہے[3]۔ اس روٹی کا چلن جنوبی ہند میں زیادہ ہے۔

یورپ سے پاو آیا جو ہمارے یہاں نان پاؤ بن گیا، پاؤ پرتگالی لفظ ہے، اہل ہند

---

[1] ظفر الرحمٰن دہلوی، کتاب مزبور، ص ۱۳۱ [2] سید مسعود حسن رضوی، تحفہ مزبور ص ۶۱

[3] ظفر الرحمٰن دہلوی کتاب مزبور، ص ۱۳۱۔

اسے ڈبل روٹی بھی کہتے ہیں، جو اہل یورپ کے باورچیوں کا ایجاد کردہ نام ہے، دکن میں خصوصًا یہی نام رائج ہے،[1]

مسلمان گوشت کا دلدادہ ہے، یہاں آباد ہو جانے کے بعد اس نے سبزی اور ترکاری کو بھی اپنا لیا، لیکن اس کی پسندیدہ غذا گوشت ہی رہی، اس لئے اس کے پکانے میں جدتیں بھی خوب ہوئیں، پلاؤ کی طرح گوشت کے سالنوں کے نام بھی دلچسپ اور دل خوش کن ہیں اور ان سے شائستگی اور اعلیٰ مذاق کا اظہار ہوتا ہے، نیچے چند نام دئے جاتے ہیں، جو اردو میں عمومًا استعمال ہوتے ہیں:

قورمہ، قلیہ، دوپیازہ، قیمہ، کباب، کوفتہ، پسندے، پائے، آش، نہاری، روغن جوش، شب دیگ، دم پخت، سبزی گوشت، ہلغوبہ، مرغ مسلّم، مرغ بریاں، من وسلویٰ وغیرہ،

قورمہ اور قلیہ تقریبًا ہر دستر خوان پر اور ہر روز استعمال ہوتے ہیں، اس لئے ان کی کئی قسمیں بنیں، مثلًا

قورمہ، قورمہ مرزائی، قورمہ سلونا، شاہی قورمہ، دم دار قورمہ، عجمی، نکتی قورمہ، قورمۂ نخود گوشتی، وغیرہ،[2]

قلیہ، قلیہ کندنی، قلیہ حسینی، قلیہ لقرہ، قلیہ بتاشا، شاہی قلیہ، نیم قلیہ وغیرہ،[3]

کباب ہر خاص وعام کی پسندیدہ چیز ہے، اس لئے اس کی قسمیں بہت ہیں، جن میں سے چند یہ ہیں:

شامی کباب، سیخ کباب، نرگسی کباب، نکتی کباب، کباب حسینی، کباب دارائی، مرغ کباب، مرغ مثمن، پسندے کے کباب، پارچے کے کباب، خطائی کباب، کباب اسد خانی، کباب دم پخت وغیرہ[4]

---

[1] ظفر الرحمٰن دہلوی، کتاب مزبور، ص ۱۳۲ [2] سید مسعود حسن رضوی، حوالہ کتاب مزبور، ص ۴۲ [3] الغنا [4] الغنا

کباب کی مقبولیت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے، کہ اس کی بنیاد پر محاورے بن گئے ہیں، مثلاً کباب ہونا، کباب کرنا وغیرہ، کباب کنایۃً جلے ہوئے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے،

کباب کا آنسو وہ پانی ہے جو سیخ کے کباب میں سے پکتے وقت نکلتا ہے،

گوشت کے علاوہ بعض دوسری چیزوں کے بھی کباب بننے لگے، جیسے مچھلی (ماہی) کباب، کباب بیضۂ مرغ، گولر کے کباب، اروی کے کباب، دہی کے کباب، ناریل کے شیریں کباب وغیرہ،

قیمہ پکانے میں بھی رکابداروں نے تنوع سے کام لیا، ان کے نام بھی لطیف اور دلچسپ ہیں، مثلاً زعفرانی، نرگسی، سلیمانی، خمیری، گاؤزبان، آبی، ترنجی، ہندوستانی، ایرانی وغیرہ[۱]،

مچھلی:

مچھلی بھی ایک لذیذ غذا ہے، اس لئے اسکے پکانے میں بھی اہتمام کیا جاتا ہے، لیکن جہاں تک اس کے پکوانوں کے ناموں کا تعلق ہے، وہ تقریباً وہی ہیں جو گوشت کے پکوانوں کے ہیں، یعنی مچھلی کا قورمہ، مچھلی کا کوفتہ، مچھلی پلاؤ، مچھلی کباب، مچھلی کے سیخ کباب وغیرہ، ان کے علاوہ تلی ہوئی مچھلی، مچھلی کی لوز وغیرہ بھی چند نام ہیں، البتہ خود مچھلیوں کے ناموں میں کافی تنوع ہے، کیونکہ ان کی قسمیں بہت ہیں، مثلاً ارا، تیغ ماہی، جھینگا، چھمنا، نین، خراقی (خراشی)، بڑھن، رہو، (روہو)، سالمن، بام سنگھاڑا، بینگنی، سنول، موہ، چھلکار، مراتی وغیرہ،

انڈا:

انڈا بھی ابن آدم کی مرغوب غذا ہے، اردو کے دسترخوان پر خاگینہ، خریزہ، چلہ، نیم برشت وغیرہ عموماً موجود رہتے ہیں، پتاخے کا انڈا ایک دلچسپ پکوان ہے، یہ بغیر پھینٹا ہوا انڈا ہے، جسکی زردی اور سفیدی کے بیچ میں تارے معلوم ہوں[۲]، انڈے کا شوربے دار سالن بھی پکتا ہے، کباب

---

[۱] سید صباح الدین عبدالرحمٰن، ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی جلوے، ص ۳۶۲، [۲] ظفر الرحمٰن دہلوی، کتاب مذکور، ص ۳۲، ۲۴۱

کا ذکر اوپر آچکا ہے، اس کا حلوہ بھی بنتا ہے، اور بعض دوسری مٹھائیاں بھی، حکیم صاحب اس کی
معجون تیار کرتے ہیں، جو مفید ہونے کے ساتھ ساتھ لذیذ بھی ہوتا ہے،

سبزی ترکاری:

اہل ہند کی خاص غذا تھی، لیکن مسلمان ہندوستان میں آباد ہوئے تو وہ بھی سبزی ترکاری
شوق سے کھانے لگے اور مسلم رکابداروں نے ترکاریوں کے پکانے میں بھی اپنے ہنر دکھائے، صرف
ایک مثال کافی ہوگی، (مولانا) عبدالحلیم شرر لکھنوی کے بیان کے مطابق لکھنؤ کے بعض رکابدار
مسلم کریلے ایسی نفاست اور صفائی سے پکاتے کہ دیکھئے تو معلوم ہوتا ہے کہ انھیں بھاپ بھی نہیں لگی
ہے، ویسے ہی ہرے اور کچے رکھے ہیں، مگر کاٹ کر کھائیے تو نہایت پُر لطف اور لذیذ ہوتے[1]
لیکن ترکاریوں کے پکانے میں گوشت کا سا تنوع پیدا نہیں کیا گیا، البتہ آلو کو کئی طرح سے پکایا
جاتا ہے، مثلاً آلو کے قتلے، بھجیا، ٹکیاں، بھرتا، قورمہ، کھیر، حلوہ وغیرہ بناتے ہیں، اوپر ذکر آچکا ہے
کہ آلو کی تہری پکتی ہے، آلو کو دوسری ترکاریوں کے ساتھ بھی ملا کر پکاتے ہیں، جیسے آلو گوبھی، آلو مٹر
آلو ٹماٹر وغیرہ، ساگوں میں چولائی، پالک، سویا، میتھی، کرموا وغیرہ عام ہیں، ان کے علاوہ سرسوں
کا ساگ، مٹر کا ساگ، چنے کا ساگ، سرخ چولائی، بتھوا وغیرہ بھی لذیذ ہوتے ہیں، اور شوق سے
کھائے جاتے ہیں، کئی ساگوں اور ترکاریوں کو ملا کر بھی پکاتے ہیں، اس پکوان کا نام دو رنگی
ہنڈیا یا دیوانی ہنڈیا (دہاندڑی) ہے، اسے نورتن بھی کہتے ہیں[2]، بعض ترکاریوں (ٹماٹر، کریلا،
پرول وغیرہ) میں قیمہ یا مسالا بھر کر پکاتے ہیں، قیمہ بھری ہوئی کو اولما اور مسالہ بھری ہوئی کو
دلمہ کہتے ہیں، اولما ترکی لفظ یولمہ کا اردو تلفظ ہے[3]، وسط ہند، دکن اور مغربی ہند میں ساگ کو
بھاجی کہتے ہیں، اسے بھی اردو نے اپنا لیا ہے،

---

[1] مولانا عبدالحلیم شرر لکھنوی، گذشتہ لکھنؤ، ص ۲۸۵ [2] ظفر الرحمٰن دہلوی، کتاب مذکور، ص ۱۵۴، [3] الفاً
ص ۱۵۳،

دال:

دال ہندوستان کی عام غذا ہے، اسی سے یہ محاورہ بنا ہے: فلاں شخص دال روٹی سے آسودہ ہے، دوسرا مشہور محاورہ ہے: آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہونا، ان محاوروں سے قدیم ہندوستان میں دال اور روٹی کی اہمیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ دال کی مختلف قسمیں ہیں، سب سے عام قسم ارہر ہے، دوسری قسمیں چنا، مسور، ماش، مونگ، اڑد وغیرہ ہیں، مختلف دالوں کو ملا کر بھی پکاتے ہیں، اسے کیوٹی یا پنچ میل دال کہتے ہیں، جو بہت لذیذ ہوتی ہے، رکابداروں نے دال کے پکانے میں بھی اپنے جوہر دکھائے، معمولی دال کو گوشت کا ہم پلہ بنا دیا، مسور کی دال سے متعلق یہ مثل مشہور ہے: یہ منہ اور مسور کی دال، اس سے اس کے پکانے کے اہتمام اور خوش ذائقہ ہونے کا اندازہ کیا جا سکتا ہے، لکھنؤ کا ایک رکابدار ایک نہایت قیمتی اور لذیذ ارہر کی دال پکایا کرتا، جو اگلے فرماں روایان لکھنؤ کے باورچی خانوں میں پکا کرتی تھی، اور سلطانی دال کے نام سے مشہور تھی[1]، ہندوستان کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر کے باورچی خانے میں مونگ کی دال پکتی تھی، جو شاہ پسند کہلاتی تھی[2]، آگے چل کر معمول سے زیادہ پر تکلف امرا کے کھانے کے لائق پکائی ہوئی دال کو کہنے لگے[3]۔ دال اسد خانی، دال مشہدی، دال ہفت قسم بھی لذیذ دالوں کے نام ہیں[4]، دال کو لذیذ تر بنانے کے لئے کبھی کبھی اس میں گوشت یا پالک کا ساگ ملا دیتے ہیں، پہلی صورت میں اسے دالچہ کہا جاتا ہے، اور دوسری شکل میں سگپیتا۔

میٹھے کھانے:

آدمی جہاں مرغن اور لذیذ نمکین کھانوں کا دلدادہ ہے، وہیں، اسے میٹھے کھانے بھی

---

[1] مولانا عبد الحلیم شرر لکھنوی گذشتہ لکھنؤ، ص ۲۵۸، [2] سید صباح الدین عبد الرحمٰن کتاب مذکور، ص ۲۰۱، [3] ظفر الرحمٰن دہلوی، کتاب مذکور، ص ۱۵۸، [4] سید مسعود حسن رضوی، حوالہ مذکور، ص ۴۲،

مرغوب ہیں، اس لئے میٹھے کھانوں میں بھی تنوع پیدا کیا گیا اور ان کے پکانے میں رکابداروں نے اپنے کمال دکھلائے، اوپر زردہ، سپیدہ، مزعفر، متنجن وغیرہ کا ذکر آچکا ہے، شیر برنج، کھیر، فیرنی، مالیدہ (ملیدہ)، پیا و بڑے، شاہی ٹکڑے وغیرہ عام ہیں، ان کے علاوہ مزعفر گوشتی، متنجن، پنیری، عنابی پلاؤ، باولہ پلاؤ، نعمت خشکہ، لطافت خشکہ، گلزار خشکہ، موتی خشکہ[۱] وغیرہ جیسے لطیف، شیریں پکوان دسترخوان کی زینت بنتے ہیں، جودت پسند رکابداروں نے چاول کے آٹے کے علاوہ بعض پھلوں سے بھی زردہ، فیرنی اور کھیر تیار کی، مثلاً بادام کی کھیر، کدو کی کھیر، گاجر کی کھیر وغیرہ، مونگ کی دال کی بھی فیرنی بنتی ہے، اسے یاقوتی کہا جاتا ہے[۲]، رس کی کھیر جسے عموماً رساول کہا جاتا ہے، ہر ہندوستانی کی مرغوب چیز ہے، آم کے رس میں ملائی اور قند ملا کر خشکے کے اندر تہ بہ تہ جماتے اور اسے دم پخت کرتے ہیں، اور تکلفاً اسے من وسلویٰ کے نام سے موسوم کرتے ہیں[۳]، سویاں عموماً ہر گھر میں پکتی ہیں اور قسم قسم کی پکتی ہیں، جیسے قوامی سویاں، شیر خرما، سیویوں کے قتلے، سیویوں کا پلاؤ، سیویوں کا زردہ، سیویوں کا مزعفر وغیرہ، مسلمانوں کے یہاں عید کے دن اور ہندوؤں کے یہاں سلونوں کے دن خصوصاً سیویاں پکائی جاتی ہیں، اس سے شغل بنی ہے، سیویاں بن عید کیسے، بادامی قاش، گل فردوس، خشت عدن، شاخ مرجاں، امرت پھل[۴]، چند اور لطیف شیریں چیزیں ہیں جو ہمارے کام ودہن کو لذت بخشتی ہیں[۵]

ان شیریں اور لذیذ چیزوں کے ساتھ بالائی (ملائی)، کو بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا، جو ہر چھوٹے بڑے کو مرغوب ہے، بالائی کے ٹکڑے[۶]، ایک نفیس اور لذیذ شیریں چیز ہے، ملائی کو بالائی نواب آصف الدولہ نے بنایا اور لکھنؤ میں اس لفظ کو قبول عام حاصل ہوا اور پھر

---

[۱] سید مسعود حسن رضوی، جواہر مزبود، ص ۶۲ [۲] سید صباح الدین عبد الرحمٰن، کتاب مذکور ص ۲۴۷ [۳] ظفر الرحمٰن دہلوی، کتاب مذکور ص ۱۶۹ [۴] آمنہ نازلی دم ربنہ، عصمتی دسترخوان ص ۴۰، ۱۸۳، ۲۰۹، ۲۱۳ [۵] ایضاً ص ۱۰۸

لکھنؤ کے باہر بھی اس کا چلن ہو گیا۔ لیکن ملائی کا لفظ بھی تقریباً اتنا ہی عام ہے۔

انگریزی کھانے:

انگریزی تہذیب کے نفوذ کے بعد جو کھانے ہمارے دستر خوان پر آئے ان میں سے اکثر کے نام اصلی شکل میں اردو میں جذب ہو گئے، مثلاً سوپ، روسٹ، چاپ، اسٹو، کٹلٹ، پیٹیں، آملیٹ وغیرہ۔

ہلکی پھلکی غذا:

ان لذیذ، مرغن اور پر تکلف کھانوں کے علاوہ جن کا اوپر ذکر ہوا اردو کے دستر خوان پر ہلکی پھلکی چیزیں بھی سہ پہر کے ناشتے کے لئے یا مہمان کے سامنے چائے، کافی، شربت وغیرہ کے ساتھ پیش کرنے کے لئے موجود رہتی ہیں، مثلاً آلو پارے (آلو کے قتلے)، بھرج پارے، کچوری، پکوڑی، پھلکی، پھول بتاشا، بڑے، دہی بڑے، قلمی بڑے، سہال، سموسہ، ورقی یا غلافی سموسہ، لقمی، الائچی دانہ، نقل وغیرہ۔ مسلمانوں نے میٹھی اور نمکین کھجوریں بنائیں، وہ بھی چائے کے ساتھ دستر خوان کی زینت ہوتی ہیں۔ ان کھجوروں کی مختلف قسمیں ہیں اور ان کے نام بڑے شستہ اور دلچسپ ہیں، مثلاً ورقی، تنکی، جالی، کشتی، بادامی، نمک پارے وغیرہ۔[1] یورپ سے آئے ہوئے کیک، بسکٹ، سینڈوچ (Sandwitch) ویفر (wafer)، ٹوسٹ، جام، جیلی، چاکلیٹ وغیرہ بھی موجود ہوتے ہیں۔ انگریزی کے یہ الفاظ کثرت استعمال سے اب اردو کے الفاظ بن چکے ہیں۔

اچار، چٹنی، مربہ:

اچار، چٹنی اور مربہ بھی کھانے کے لوازم میں داخل ہیں۔ اچار اور چٹنی ہندوستان کے لوگوں کو خصوصاً بہت پسند ہیں۔ ان کے ہندی ناموں کے علاوہ (آم کا اچار، مرچوں کا اچار وغیرہ)

---

[1] سید صباح الدین عبد الرحمٰن، ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی جلوے، ص ۲۶۲

فارسی ناموں کو بھی اردو نے اپنا کر اپنے دسترخوان کو لذیذ تر بنا دیا ہے، مثلاً اچار لیموں، اچار شلغم، اچار کشمش، اچار منقّی، اچار سیب، اچار بہی، اچار بیستاں، اچار شفتالو وغیرہ، چٹنیوں کی بھی متعدد قسمیں ہیں، عام طور پر جو چٹنیاں گھروں میں بنتی ہیں، (پودینے کی چٹنی، کوتھمیر کی چٹنی وغیرہ)، ان کے علاوہ چند دوسری چٹنیوں کے نام جو عموماً بنتی یا بازار میں ملتی ہیں، یہ ہیں، نورانی چٹنی، چٹنی عرق نعناع، چٹنی نورتن، شاہ جہانی چٹنی وغیرہ،" ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی جلوے،" کے مصنف نے ایک نام راحت جان بھی دیا ہے[1] مربے بھی مختلف چیزوں کے بنتے ہیں، مثلاً مربہ سیب، مربہ بہی، مربہ بادام، مربہ پستہ، مربہ فالسا، مربہ نارنج، مربہ ثعلب مصری، وغیرہ، گڑمبا ہندوستان کی خاص چیز ہے، یہ صرف گھروں میں بنتا ہے، اس میں اور نفاست پیدا کر کے شکرمبا بنایا گیا،

شربت :

امراء کے دسترخوان پر قسم قسم کے شربت بھی ہوتے ہیں، ان میں سے بہت سے متوسط درجے کے لوگوں کے بھی استعمال میں آتے ہیں، ان کے فارسی نام اردو نے بجنسہٖ اپنا لئے ہیں، جیسے شربت قند، شربت انار، شربت انگور، شربت فالسا، شربت عناب، شربت گلاب، شربت نارنج، شربت زعفران، شربت شہتوت، شربت بنفشہ، شربت نیلوفر، شربت بادام وغیرہ،

شربت کے ساتھ ساتھ فالودہ، ننگے اور نمش (نمشک) کا بھی نام لینا ضروری ہے، یہ چیزیں بھی عموماً استعمال ہوتی ہیں اور اردو میں ان کے یہی نام ہیں، نمش دودھ کے جھاگ میں مصری ملا کر تیار کرتے ہیں، پھیری والے سودا فروش "جاٹ دولت" کی آواز لگا کر بیچتے ہیں[2] یہ چیزیں مسلمان اپنے ساتھ لائے تھے، ہندوستان کے مشروبات میں مٹھا، چھاچھ، لسّی وغیرہ ہیں،

---

[1] سید صباح الدین عبدالرحمن، کتاب مذکور، ص ۷۰، [2] ظفرالرحمن دہلوی، کتاب مذکور، ص ۲۱۶،

یہ بھی اردو کے دستر خوان پر نظر آتے ہیں،

مذکورۂ بالا خوشبودار اور خوش ذائقہ مشروبات کے ساتھ ساتھ اردو نے انگریزوں کے لائے ہوئے "ٹھنڈے مشروبات"، کو بھی قبول کر لیا، سوڈا، لیمن (Lemonade)، جنجر، کوکا کولا، گولڈ اسپاٹ وغیرہ اردو الفاظ بن چکے ہیں،

مٹھائی:

ہندوستان میں ہمیشہ سے اچھی مٹھائیاں بنتی ہیں، ان کے نام بھی اچھے اور دلچسپ ہیں، جیسے امرتی، کھاجا، رس گلا، رس ملائی، چم چم، موہن بھوگ، پیڑا، گنگا، لڈو، بادام لچھا، بڑھیا کا کاتا وغیرہ، اردو نے ان ناموں کو اپنا لیا، مسلمانوں نے ان مٹھائیوں میں کافی اضافے کئے اور ان کے نام دلچسپ اور شیریں رکھے، مثلاً بالو شاہی، برفی، گلاب جامن، یاقوتی، قلاقند، دز بہشت، شاخ بادام، پستہ مغزی، نان خطائی، موتی پاک (موتی چور) خرمہ، نکتی، لوز، نقل وغیرہ، حلوے کی تیاری میں حلوائیوں نے تنوع پیدا کیا، بادام کا حلوہ، پستے کا حلوہ، ملائی کا حلوہ، رنگترے کا حلوہ، حبشی حلوہ، حلوہ سوہن، حلوۂ مغزی، افلاطون وغیرہ حلوؤں کے چند نام ہیں، مٹھائیوں، حلوؤں اور مربوں میں ملذت کام و دہن کے ساتھ کیوڑے، زعفران، چاندی کے ورق اور پستے کی ہوائی سے حسن و لطافت اور رنگ و رائحہ کا انتظام کیا گیا[۱]،

جیسے کہ اوپر کہا جا چکا ہے، ہندوستان میں مٹھائی کا رواج ہمیشہ سے رہا ہے، لیکن مٹھائی بنانے والے کے لئے اب جو لفظ مستعمل ہے یعنی حلوائی، وہ اردو ہے، جو عربی سے لیا گیا ہے، اردو داں، ہندی داں تعلیم یافتہ غیر تعلیم یافتہ ہندو مسلمان سب حلوائی ہی بولتے ہیں، مؤنث حلوائن ہے،

انگریزی کھانوں کے ساتھ جو میٹھے کھانے (Sweet Dishes) ہمارے دستر خوان پر

---

[۱] (مولانا) شاہ معین الدین احمد ندوی، "اردو زبان کی لسانی، علمی اور تمدنی اہمیت"، ص ۳۳-۸

آئے، ان کے نام اپنی اصلی شکل میں اردو میں مستعمل ہیں، جیسے کسٹرڈ، پڈنگ، جیلی، جیلی پڈنگ، آئسکریم وغیرہ۔

ماہر رکابداروں کی استادی اور مہارتِ فن نے امیروں اور رئیسوں کے کام و دہن کو لذت بخشی تو شعرا نے کاغذ کے صفحات پر خوان نعمت سجا کر اہل علم کی دماغی فرحت کا سامان مہیا کیا، اکثر مثنوی نگاروں نے جشن شادی کا منظر دکھانے کے بعد الوان نعمت کا شعری دسترخوان بچھایا ہے، مثلاً ملا نصرتی نے مثنوی گلشن عشق میں ضیافت کا جو سامان مہیا کیا ہے، اس کے چند منتخب اشعار نیچے نقل کئے جاتے ہیں،

ہر یک رنگ پر کار کا خوش پلاؤ	اتھا پھول بن یک روش کا سجاؤ
مزعفر نہ کہہ زعفراں زار تھا	قبولی میں سوسن کا مہکار تھا
سہانی تھی کھچڑی مالے کی یوں	نشیمن ہے بلبل پھول باتاں میں جوں
چقندر نے لایا کنول پھول بار	ہوا قلیہ نرگس چمن لالہ زار
گل چاند کا کاک[1] پائے خطاب	کما جاں[2] دسیں جوں گل آفتاب
کدو ہور چچونڈے توریئں کے بڑے	قبولی کے گھر بیل منڈوے چڑھے
جو کتنے[3] ہوئے دال میں مل کے گھول	رکھے ہنس کے گل زعفرانی پہ بول
برانیاں و بجنیاں کی ڈو نگرہ تلاؤ	لہوے ہور دوراجاں کی موزوں پکار
کھڑے دو بھجے خوش مٹھائی کے نبٹ	شکر پارہ ہور ہیٹھی جس کی اینٹ
کموسے، کموسے کی سترماں کی ٹھار	شکر پارے کا فرش انگن کے منجھار

۱ و ۲ نان کی قسمیں ۳ ایک سالن جس میں چنے کی دال اور کئی ترکاریاں ڈالی جاتی ہیں، پکنے پر اس کا رنگ زرد ہوتا ہے،

ملیدے کے جن ٹھینگ پر رخ کرے
چھوٹی بوٹ چھینٹے میں گھٹو کے بھرے

پھر آوے نظر جن سر نگ جام پر
ججھر میں زلیبی ہے سبز طے نظر

مثنوی سے الگ ہو کر بھی شعرا نے کھانوں کی تعریف میں نظمیں لکھی ہیں، اسی قسم کی ایک نظم میر حسن کی "خوانِ نعمت" ہے، جس کے منتخب کچھ اشعار نیچے دئے جاتے ہیں:

بچھا جس وقت دستر خوان آکر
قرینے سے رکھے کھانے لگا کر

پلاؤ، زیر بریانی، و قورداغ
ہر اک عالم میں اپنے قطعۂ باغ

وہ مشقابین بھری بریانیوں کی
بلب قفلیاں بورانیوں کی

چلاؤ سادہ و قیمہ چلاؤ
کمیت از قورمہ یخنی پلاؤ

پلاؤ میں رکھا زردہ جو یک بار
ہوا ایک تختۂ جیں زعفران زار

پنے دوپیازے اور قلئے تمامی
اتاریں ہاتھ جن اوپر سلامی

کباب اقسام کے رکھے وہ ہر سو
بھریں دم فاختہ جن کا کو کو

سلونی وہ تلی مچھلی مزے دار
کہ دریائی کباب اس کے نمک خوار

حلیموں کے طبق جلتے ہوئے گرم
جسے خورشید کھاوے دیکھ کر شرم

وہ تنگے اور مٹش براق جوں برف
نہ پاوے جس کی لذت بر شک ظرف

تنجن اور قلئے چاشنی دار
کہ جس سے ترش شیریں حرف لدار

نمودار آش زیر قورمہ یوں
تلے کہسار کے ہو چاندنی جوں

وہ انڈے نیم رو جوں چشم تصویر
کرے نرگس کو حلقہ جس کا زنجیر

مربہ اور اچار اور لیموں ے تر
جنا صنعت سے اور کرتا سراسر

خمیری، روغنی اور شیر مالی
اگر چیر و تو جوں ریشم کی جالی

چپاتی گرم اور ستھرے د ہیلکے — روئی کے جیسے گالے ہلکے ہلکے
رو پہلے خوانچے فرنی کے جوں چاند — کہ جس کی ہو چمک سے چاند بھی ماند
پیالے کھیر کے جوں ماہِ تاباں — لبکتے جیسے نسرین کا گلستاں
دھرے خوشبو مزعفر کے پیالے — کہ زردی پر نہیں جن کے نوالے
وہ یاقوتی وہ فرنی مل کے باہم — دکھاتے ہیں گلِ نرگس کا عالم
خطائی اور کماچ اور گاودیدے — روٹی کے نسخے، شیرے ملیدے
وہ لوز زعفرانی کی رکابی — کہ جوں سورج مکھی کی آفتابی
گلابی پیڑے اور برفی کا عالم — کہوں کیوں کر ایسے یہ ہیں باہم

حسن کے جو سخن سے خط اٹھادے
خدا روز اس کو یہ نعمت کھلادے

چائے، کافی، قہوہ:

چائے کا استعمال ہندوستان میں کوئی نئی بات نہیں، لیکن انگریزی تہذیب کے اثر سے اس کا رواج بہت زیادہ ہوگیا، اس لئے کھانے کے سلسلے میں اس کا ذکر بھی ضروری معلوم ہوتا ہی، کافی کا بھی ہمارے یہاں چلن ہے، خصوصاً جنوبی ہند میں قہوے کا استعمال اب بہت کم ہے، مغلوں کے آخری دور میں اس کا رواج بہت زیادہ تھا، قہوے کی اسی مقبولیت کے پیش نظر شاہ حاتم نے اس کی تعریف میں ایک مختصر مثنوی لکھی تھی، جس کے چند منتخب اشعار نیچے نقل کئے جاتے ہیں:

جہاں میں سرد مہری سے خزاں ہے — جو ہم سے گرم ہے تو قہوہ داں ہے
بجا ہے اس کی مجھ سے گرم جوشی — کہ جانے ہے مری پیمانہ نوشی

جہاں دیکھو وہاں ہر آن قہوہ | ہے بزمِ عیش کا سامان قہوہ
برائے حرمت افزائے تواضع | تواضع اس کی ہے جائے تواضع
سبھوں کے ہاتھ مجلس میں پیالہ | چمن سا کھل رہا یک دستہ لالہ
ہے سب رنگوں میں قہوے کا عجب رنگ | گہے طاؤسی و گاہے ہے شب رنگ
بلوریں یوں لگے قہوے سے اب جام | گلے ملتے ہیں گویا صبح اور شام
مجھے ہر دن یہ چاروں جام بس ہیں | دو پیالہ صبح اور دو شام بس ہیں[1]

چائے اور کافی پینے کے لئے انگریزوں کے لائے ہوئے پیالے (CUP) اور پرچ (SAUCER) کا استعمال ہندوستان میں عام ہو گیا، کپ اور ساسر کے علاوہ انگریز اپنے ساتھ چائے کا مکمل سیٹ بھی لائے، جو کپ، ساسر، کیتلی، دودھ دانی اور شکر دانی پر مشتمل ہوتا ہے، اردو نے کپ اور ساسر کے ساتھ ساتھ سیٹ کو بھی قبول کر لیا، یہ لفظ اردو میں عام ہے، قہوے کے لئے چھوٹے چھوٹے خوبصورت فنجان استعمال ہوتے ہیں، مہمان کے سامنے ان مشروبات کو پیش کرنے کے لئے کشتی استعمال ہوتی ہے، انگریزی لفظ ٹرے (TRAY) بھی اردو میں اتنا ہی عام ہے،

کھانا پکانے کی جگہ اور دوسرے لوازم :

لذیذ اور مرغن کھانوں کے ساتھ ان کے پکانے والوں اور اس جگہ کے لئے جہاں کھانا پکتا ہے، جو الفاظ اردو میں استعمال ہوتے ہیں وہ بھی شستہ ہیں، کھانا پکانے والے کو باورچی یا رکابدار کہتے ہیں، باورچی عام لفظ ہے، معمولی اور اوسط درجہ کا کھانا پکانے والے کو بھی باورچی کہا جاتا ہے، رکابدار اعلیٰ درجے کے باورچی کو کہتے ہیں، وہ صرف چھوٹی ہانڈی پکاتے ہیں، اور باورچی چھوٹی اور بڑی دونوں طرح کی ہانڈیاں پکاتے ہیں، بکاول اور خانساماں دوسرے

---

[1] دیوان زادہ، قلمی، مخزونہ رضا لائبریری، رام پور، یوپی۔

الفاظ ہیں، جو کھانا پکانے والے کے لئے استعمال ہوتے ہیں، ثانی الذکر لفظ پہلے صرف انگریزوں کے باورچیوں کے لئے استعمال ہوتا تھا، لیکن اب عام طور پر مستعمل ہے، بکاول بادشاہوں اور امرا کے باورچی خانے کے داروغہ کو بھی کہا کرتے تھے، باورچی کے لئے "خاصہ پز" بھی پہلے استعمال ہوتا تھا، لیکن اب متروک ہو چکا ہے، باورچی کے ساتھ تنوری روٹی پکانے والے نانبائی کو بھی یاد رکھنا چاہئے، کھانا پکانے کی جگہ کو باورچی کی مناسبت سے باورچی خانہ کہا جاتا ہے، اسے مطبخ بھی کہتے ہیں لیکن اس لفظ کا چلن بہت کم ہے، کھانا پکانے کے لئے چولھا جو ہر خاص وعام کی زندگی کا ایک لازمی جز ہے، اسی وجہ سے اس کی بنیاد پر محاورے اور مثلیں بن گئی ہیں، مثلاً چولھا جھونکنا، چولھے میں پڑے دجائے، چولھے آگ نہ گھڑے پانی، چولھے کی ہے تیری، توے کی ہے میری وغیرہ، چولھے کے ساتھ بھاڑ کو بھی یاد کر لینا چاہئے، یہ بھی ہماری زندگی میں اہمیت رکھتا ہے، اس کی بنیاد پر بھی چند محاورے بن گئے ہیں، جیسے بھاڑ جھونکنا، بھاڑ میں جھونکنا ڈالنا، بھاڑ میں جائے وغیرہ، بھاڑ سے نکالا بھٹی میں جھونکا مثل ہے،

بادشاہوں، شہزادوں اور امرا کے پینے کے پانی کا بھی خاص انتظام ہوتا تھا، باورچی خانے کے جس حصے میں پینے کا پانی اور دوسرے مشروبات اور صراحی، آبخورہ وغیرہ رکھے جاتے تھے اسے آبدار خانہ کہا جاتا تھا، اور جس شخص کے ذمے یہ خدمت ہوتی تھی اسے آبدار کہتے تھے، برف کے ٹھنڈے پانی کو برفاب کہا جاتا تھا، اسی طرح مکان کا وہ حصہ جس میں امرا کھانا کھاتے نعمت خانہ کہلاتا تھا، اردو نے مذکورۂ بالا تمام الفاظ اپنے اندر سمو لئے ہیں۔

کھانا پکانے، کھانے اور پانی پینے کے برتن:

کھانا پکانے کے لئے جو برتن استعمال کئے جاتے ہیں، انھیں برتن کے علاوہ باسن بھی کہتے ہیں، اور برتن بھانڈا بھی، ان میں سے کچھ ہندوستانی ہیں، جیسے ہانڈی (ہنڈیا)، بٹوا، ڈھکن، ڈھکنی،

کڑاہی، تلائی، توا، تھال، تسلا، لگن، پرات، کوتھا، چگیری، کرچھا، کرچھی، کرچھلی، دروئی، ڈوئی، گھنٹی وغیرہ، ان چیزوں کے ساتھ بچوں کی ہنڈکلیا کو بھی یاد کر لینا چاہیئے، مسلمان اپنے ساتھ دیگ، دیگچا، دیگچی، پتیلا، پتیلی، سرپوش، کفگیر، سیخ، کدوکش وغیرہ لائے، ان برتنوں کے علاوہ کھانے کی تیاری میں چولھا، انگیٹھی پیڑا، جوکا دچوکی) چکلا، بیلن، تھیپڑا، سل، بٹا، سلوٹا، نان بائی کا جوڑ (ارہ اور کھوجنی) رفیدہ، پشتا، دست پناہ، سنسی وغیرہ بھی بنیادی اہمیت رکھتے ہیں،

کھانے کے برتنوں میں سے زیادہ تر مسلمانوں کے ساتھ باہر سے آئے، مثلاً رکابی، پیالہ، کاسہ، بادیہ، قدح، قاب، متقاب، بشقاب، طباق، طشت، طشتری، بجہ، سینی، بکاولی وغیرہ، ہندوستانی برتنوں میں تھالی، پیالی، کٹورا، کنول کٹورا، کٹوری وغیرہ ہیں، بھوج پتل (بھوج پتر) کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ یہ ہندوستان کی خاص چیز ہے،

پانی رکھنے اور پینے کے برتنوں میں زیادہ تر ہندوستانی ہیں، جیسے مٹکا، مٹکی، گھڑا، گگرا، ہنڈا، ٹھلیا، کلسا، کلسی، چھاگل، جھجر، جھجری، جھاڑی، ڈول، ڈونگا، جمبو، لوٹا، لٹیا، بدھنا، بدھنی، کٹورا، کٹوری، کلھڑ، کلیا وغیرہ مسلمانوں کے ساتھ بھی چند چیزیں آئیں، مثلاً صراحی، کوزہ، آبخورہ، جام، مشک، مشکیزہ، پیالہ، کاسہ وغیرہ، اس ضمن میں لٹکن، گھڑونچی، جامدانی، بھراو وغیرہ کو فراموش نہیں کیا جا سکتا، چائے کا پانی گرم رکھنے کے لئے سماور (آب گرما) پہلے عام طور پر استعمال ہوتا تھا،

انگریزوں کے ساتھ فرائی پین، کیتلی، پلیٹ، ڈونگا، جگ، گلاس وغیرہ آئے، چھری کانٹا اگرچہ ہندوستانی الفاظ ہیں، لیکن استعمال کے لحاظ سے یورپ کی چیز ہیں، شہروں میں ہندوستانی چولھے کی جگہ اسٹوو یا پرائمس، بتی کا چولھا، گیس کا چولھا وغیرہ نے لی ہے، کوکر بھی اب گھروں میں اپنی جگہ بنا تا جا رہا ہے، اسلئے اردو میں بھی اس کی جگہ ہو گئی ہے۔

مذکورۂ بالا برتنوں کے علاوہ اور بہت سی چیزیں ہیں، جن کا تعلق کھانا پکانے سے ہے، کھانا پکانے کے تعلق سے بہت سے الفاظ اور محاورے بھی ہیں، نیچے چند الفاظ اور محاورے دئے جاتے ہیں:

چکی، اوکھلی، موسل، ہاون دستہ، امام دستہ، کھرل، چاقو، چھری، لوئی، پیڑا، چنگی، خشکی، پلیتھن، خمیر، آبلا دخمیری آٹے کا پھولا پن[1]، چنگیر، پھینکا، صافی، منا، منے (چولھے کے پانکھوں اور وسط پر بنی ہوئی چھوٹی ٹھمکی یا گمٹیاں جن پر دیچی یا توا رکھتے ہیں[2])، آنچ کا کھیل آگ کی تیزی یا گرمی کو کم یا زیادہ کرنا)، (چاول یا سالن کو)، دم کرنا، دم دینا، دم پر رکھنا، دم توڑنا دیگچے کے منہ کو کھولنا)، توا ہنسنا (توے کے نیچے دھوئیں کی جمی ہوئی کاک کا سلگ اٹھنا اور ننھے ننھے متحرک پتنگوں کی قطار کی شکل میں پھیلنا، اہل ہنود ان کے جلنے کی مقدار سے نیک یا بد شگون لیتے ہیں[3])

کھانا کھانے کے آداب اور تکلفات:

مسلمان بادشاہوں اور ان کی تقلید میں درباری امرا نے جس طرح کھانے کی تیاری میں اہتمام کیا، اسی طرح انھوں نے دستر خوان کے لوازم بھی بنائے اور آداب بھی مقرر کئے اور بڑے تکلفات سے کام لیا، جن میں سے اکثر کا چلن آج تک مسلمانوں کے اونچے اور کسی حد تک متوسط طبقے کے گھرانوں میں پایا جاتا ہے، خود دستر خوان مسلمانوں کی لائی ہوئی چیز ہے، جو مسلم گھرانوں میں عام ہے، فرش دستر خوان کے لئے ضروری ہے، سینی، کشتی، کشتی پوش، طباق، خوان، خوان پوش وغیرہ کھانا لانے کے لئے بنائے گئے، کھانا دستر خوان پر چن جانے کے بعد اسے مکھیوں سے محفوظ رکھنے کے لئے اوپر نعمت خانہ کھڑا کیا گیا، کھانا کھانے کے برتنوں کا ذکر اوپر آچکا ہے، ہنڈیاں رکھنے کے لئے سفلدان بنا، ہاتھ دھونے کے لئے طشت (تشت)، سلاپچی، چلمچی، آفتابہ، تسلے وغیرہ

---

[1] ظفر الرحمٰن دہلوی، کتاب مذکور، ص ۱۱۹ [2] ایضاً، ص ۱۶۸ [3] ایضاً، ص ۱۲۵۔

سے کام لیا گیا، چکنائی دور کرنے کے لئے بیسن دانی، پنیلی کی کھلی، صندل کی ٹکیاں وغیرہ بھیں پھر صابن اور صابن دانی آئی، پانی پینے کے لئے صراحی، کوزہ اور آبخورہ کا اہتمام کیا گیا، انگریزی تہذیب سے اردو کے دسترخوان نے ڈائننگ روم، ڈائننگ ٹیبل، نیپکن، ٹوال وغیرہ لئے، نیپکن کے لئے اردو میں زانو پوش کا لفظ بنایا گیا ہے، لیکن اس کا استعمال بہت کم ہے،

کھانے کے لئے جہاں اردو نے لنگ روٹی اور دال دلیا اپنائے وہیں ماحضر اور خاصہ بھی اس نے قبول کئے، خاصہ بادشاہوں اور امیروں کے کھانے کے لئے مخصوص تھا، اسی طرح بادشاہ کے پینے کا پانی آب حیات اور امیروں اور رئیسوں کے پینے کا پانی آب خاصہ کہلاتا تھا، صبح کا مختصر کھانا ناشتا کہلاتا ہے، حاضری کا لفظ بھی پہلے استعمال ہوتا تھا، لیکن اب متروک ہو چکا ہے، انگریزوں کے صبح کے ناشتے کے لئے حاضری کا لفظ عموماً بولا جاتا تھا،

کھانا دسترخوان پر رکھنے کو دسترخوان پر لگانا یا چننا کہتے ہیں، اسی طرح جب کھانا کھا چکتے ہیں اور بچا ہوا کھانا اور برتن اٹھا لئے جاتے ہیں، تو اسے دسترخوان بڑھانا کہتے ہیں تھالی کی صورت میں تھالی پروسنا کہا جاتا ہے،

کھانا لگ جانے اور تمام لوگوں کے دسترخوان (یا ڈائننگ ٹیبل) پر بیٹھ جانے کے بعد صاحبِ خانہ یا خاندان کا بزرگ یا میزبان کہتا ہے، بسم اللہ یا بسم اللہ شروع کیجئے یا بسم اللہ نوش فرمائیے،

کھانے کے تکلفات زبان تورے سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا، شادی یا دوسری تقریبات میں مختلف اقسام کے لذیذ کھانے نو خوانوں میں بڑے تکلف کے ساتھ تقسیم ہوتے ہیں، ان کھانوں کے مجموعے کا نام تورہ ہے[1]، شادی سے پہلے گھر گھر تورہ تقسیم کرنے کی تقریب کو تورہ بندی کہتے ہیں[2]،

---

[1] نور اللغات، نور الحسن نیر، حصہ دوم، [2] ایضاً۔

خوان پر کپڑا رکھا جاتا ہے وہ خوان پوش یا تورہ پوش کہلاتا ہے، تورے کا ذکر شعرا نے بھی اشعار میں کیا ہے، مثلاً

لگا کے خوان میں بھیجا نہ کیجئے کچھ چیز
خدا کے واسطے گذرے ہم ایسے تورے سے (انشا)

لوں میں تو چیزیں فقط گنتی گنانے کے لئے
ایسے تورے کو سلام، آئے ہیں تو خوان عبث (جان صاحب)

اوپر لغت نویس کے حوالے سے بتایا جا چکا ہے کہ یہ خوان بڑے تکلف کے ساتھ پیش ہوتے ہیں، لکھنؤ میں اس کا یہ طریقہ تھا،

"خوانوں کی شان عام سوسائٹیوں میں یہ تھی کہ لکڑیوں کے خوان ان پر رنگین تیلیوں کا گنبد نما جالا، اس پر ایک سفید کپڑے کا کتا جو چوٹی کے اوپر باندھ دیا جاتا اور شاہی باورچی خانے اور معزز امرا میں دستور تھا کہ اس بندھن پر لاکھ لگا کے مہر بھی کر دی جاتی تاکہ درمیان میں کسی کو تصرف کا موقع نہ ملے، پھر اس کتنے کے اوپر نہایت پر تکلف، رنگین اور اکثر ریشمی خوان پوش ہوتا۔ یہ خوان پوش بڑی سرکاروں میں لازمی طور پر اطلس اور کمخاب یا زربفت کے ہوتے اور کبھی فقط لچکا ٹانک دیا جاتا یا کارچوب کا کام ہوتا۔"[1]

انقلاب زمانہ کے ساتھ دوسری بہت سی اچھی چیزوں کی طرح تورہ بندی کے تکلفات میں بھی کمی آگئی ہے، نہ ویسے تکلفات ہی رہے اور نہ خوانوں کی تعداد کی قید ہی رہی، لیکن اردو کے تہذیبی خزانے میں وہ الفاظ ہمیشہ کے لئے محفوظ ہیں۔

کھانے کے اوقات:

ہندوستان میں کھانا کھانے کے اوقات یکساں نہیں ہیں، لیکن انگریزی تہذیب کے اثر سے عموماً چار وقت کھانا کھایا جاتا ہے، ناشتہ (حاضری) دوپہر کا کھانا، شام کا ناشتا یا شام کی

---

[1] مولانا عبدالحلیم شرر لکھنوی گذشتہ لکھنؤ، ص ۲۸۷، ۲۸۸۔

چائے، رات کا کھانا، انگریزی الفاظ لنچ (Lunch) اور ڈنر (DINNER) (خصوصاً دعوت کے موقعوں پر) اردو میں عموماً استعمال ہوتے ہیں۔ لنچ کے لئے ظہرانہ، ڈنر کے لئے عشائیہ اور شام کی چائے کے لئے عصرانہ کے الفاظ اردو میں گھڑے گئے ہیں۔ آخر الذکر تو عام ہو چکا ہے، لیکن ظہرانہ اور عشائیہ کو قبول عام حاصل نہ ہو سکا۔ ٹفن (Tiffin) کا لفظ بھی اردو میں عام طور پر بولا جاتا ہے۔ شام کی چائے کی دعوت کے لئے ٹی پارٹی (Tea Party) کا لفظ اردو نے اپنایا ہے۔ بوفے (Buffet) بھی اردو میں استعمال ہوتا ہے، مگر ابھی عام نہیں ہوا ہے۔

کھانا کھانے کے بعد کے تکلفات:

کھانا کھا لینے اور ہاتھ منہ دھو لینے کے بعد بھنا ہوا دھنیا اور سونف وغیرہ کھاتے ہیں، انھیں کھلوریاں کہتے ہیں۔

پان اور حقہ:

کھانے کے ساتھ پان اور حقے کا تصور خود بخود ذہن میں ابھرتا ہے۔ یہ دونوں چیزیں دوست احباب اور ملاقاتیوں کی خاطر مدارات کے لئے بھی ضروری ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے بنانے اور استعمال کرنے میں بہت تکلفات سے کام لیا گیا۔ لکھنؤ کی بیگمات نے خصوصاً پان بنانے میں بہت شائستگی دکھائی۔ اسی شائستگی نے بیڑے اور گلوری کے علاوہ تعویذی گلوری (مربع بیڑا) بھی بنائی۔ اگر بیڑے یا گلوری پر چاندی کا ورق لگا دیا جائے تو اسے ورقی بیڑا یا ورقی گلوری کہا جاتا ہے۔ اردو نے بیڑے اور گلوری کو چاندی کے ورق سے آراستہ اور زردہ، قوام، شاہی گولیوں اور الائچی دانے سے معطر کیا، کتھے کو کیوڑے سے بسایا۔ دھان اور پان کی نزاکت مشہور ہے۔ اسی نازک اور نزاکت کے لئے دھان پان کا محاورہ پیدا ہوا۔ پان پھول (پھول پان) اور پان سے

لے مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی، ادبی نقوش، ص ۳۳۹۔

پتلا اور چاند سے چکلا، بھی اسی مفہوم کے محاورے ہیں، ان کے علاوہ پان نے اور بھی بہت سے محاورے بنائے ہیں، مثلاً پان جیرنا (بیکار کام کرنا)، پان دینا (کھلانا، رخصت کرنا)، پان پتا (مجلس شادی یا زوجہ کی خبر گیری)، وغیرہ، مسلمانوں میں پان دینا منگنی کی رسم ادا کرنے کو کہتے ہیں، ہندوؤں میں پان کھلائی سے مراد وہ حق ہے، جو بھاوجوں کو پان کھلانے کے عوض گھر چڑھتی کے وقت دیا جاتا ہے[1]، پان بیچنے والے کو پنواڑی اور عورت کو پنوارٹن کہا جاتا ہے، پان کو تنبول بھی کہتے ہیں، اسی سے تنبولی اور تنبولن بنے،

کھانے کا اہم جز ہونے کے علاوہ پان مجلسی یا تہذیبی لحاظ سے بھی ہمیشہ اہمیت کا حامل رہا ہے، عام مجلسوں میں شادی بیاہ میں اور دوسری تقریبوں میں پان بڑے اہتمام کے ساتھ مہمانوں کو پیش کئے جاتے ہیں، پان پتا مجلس شادی کی خبر گیری کو کہتے ہیں، زوجہ کی خبر گیری کو بھی پان پتا کہا جاتا ہے، عورتوں کا سولہ سنگار مشہور چیز ہے، اس میں پان بھی شامل ہے،

ہندوستان میں پان بہت سی جگہوں میں پیدا ہوتے ہیں اور اپنی قدرتی خوبی کے لحاظ سے زیادہ یا کم پسند کئے جاتے ہیں، لیکن لکھنؤ کے تنبولیوں نے پان کو صنعتی اصول پر لطیف و لذیذ بنانے کی کوشش کی، وہ پانوں کو مہینوں زمین کے اندر دفن کر کے رکھتے ہیں، یہاں تک کہ ان کا کچا پن دور ہو جاتا ہے، پھر اینٹھ بالکل نہیں باقی رہتی ہے، رگیں نازک اور نرم ہو جاتی ہیں، رنگ میں سفیدی اور پختگی آجاتی ہے۔ ۔ ۔ ۔ یہی بنے ہوئے پان بیگمی پان کہلاتے ہیں[2]،

پان کے لوازم (کتھے چونے کی کلھیاں، سروتا وغیرہ) رکھنے کے لئے ابتدا میں پٹاری استعمال ہوتی تھی، پھر پاندان بنا، اس میں تراش خراش یا صنعت کاری ہوئی تو وہ آرام پان ہوا، اسے آرام دان بھی کہا جاتا تھا، پھر آگے چل کر وہ حسن دان کہلایا، یہ گنبد نما اور کلس دار

---

[1] نور الحسن نیر، نور اللغات حصۂ اول [2] مولانا عبد الحلیم شرر لکھنوی گذشتہ لکھنؤ ص ۲۱۴،

ہوتا ہے، اس لئے خوبصورت معلوم ہوتا ہے، پانوں کو رکھنے کے لئے ڈگی تیار ہوئی، اور گلوریاں رکھنے کے لئے خاصدان بنایا گیا، اسے گوراجا کہتے تھے، پاندان اور خاصدان کے لئے غلاف بھی تیار ہوا، جسے کسنا نام دیا گیا، پان کھانے کے بعد پیک کا پیدا ہونا اور اسے تھوکنا ضروری ہے، بار بار اٹھنے کی زحمت سے بچنے یا فرش کو خراب ہونے سے بچانے کے لئے اگالدان وجود میں آیا، اسے پیکدان بھی کہتے ہیں، خود پان کو رکھنے کے لئے ایک الگ ڈھکن دار برتن تھا، جو پان کی شکل کا ہوتا تھا، اسے ناگر دان کہتے تھے، لیکن اب اس کا چلن تقریباً نہیں رہا، اب پان کوری ہانڈیوں میں رکھتے جاتے ہیں، (مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی کے الفاظ میں "اردو نے پان کو گرمی کی تمازت سے بچانے کے لئے خس کی پٹاری کا خس خانہ اور تول سے منڈھی ہوئی کوری اور سوندھی سوندھی اور پانی سے تر بتر ہانڈیوں کا آبدار خانہ تیار کیا اور پان جیسی معمولی چیز کو لطف و لطافت کا مرقع بنا دیا"[۱]

پان کے سلسلے میں الائچی اور چکنی ڈلی کا ذکر بھی ضروری ہے، کیونکہ یہ بھی پان کے ساتھ شوق سے کھائی جاتی ہیں، بقول (مولانا) عبد الحلیم شرر لکھنوی خاص تقریبوں میں اور خاص موقعوں پر ان میں (الائچیوں میں) چاندی کا ورق لگا دیا جاتا ہے، اور جب خاصدان یا تھالی میں رکھی جاتی ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ چاندی کے چمکتے ہوئے ٹکڑے رکھے ہیں[۲]، الائچی کی نسبت سے الائچی دان بنایا گیا، اس میں الائچی کے ساتھ لونگ بھی رکھی جاتی ہے، چاندی، سونے یا تانبے کا چار خانوں کا الائچی دان جو گھرا کہلاتا ہے[۳]، چکنی ڈلی حقیقت میں وہی ڈلی ہے، جو پان میں استعمال ہوتی ہے، لیکن اسے دودھ میں پکا کر خشک کر لیتے ہیں، چکنی ڈلی پر غالب کا

---

[۱] خلیق انجم، فرہنگ اصطلاحات پیشہ وراں ص ۵۳ [۲] ایضاً ص ۲۳۹ [۳] ایضاً ص ۲۱۶ [۴] نور الحسن نیر، نور اللغات، حصہ دوم۔

قطعہ مشہور ہے،

پان کی گلوری کا لطف ادھورا رہے گا اگر اس کے ساتھ تمباکو نہ ہو، یہ لفظ دراصل عربی[1] کا ہے، لکھنؤ کی بیگمات پینے کا ہو تو تما کو اور پان میں کھانے کا ہو تو تمباکو کہتی ہیں، دلی والے پینے کا ہو تو تمباکو، کھانے کا ہو تو زردہ کہتے ہیں،[1] زردہ دراصل بنائے ہوئے خوشبودار تمباکو کو کہتے ہیں، اس کے علاوہ قوام، مشکی دانہ، زعفرانی پتی، شاہی گولیاں، وغیرہ لطیف پان کو لطیف تر بناتی ہیں،

محرم کے دنوں میں بہت سے مسلمان پان نہیں کھاتے، اس کے بدلے وہ بھنا دھنیا، خربزے کے بیج کا کترا ہوا کھوپرا، الائچی، بادام، چھالیا وغیرہ ملا کر کھاتے ہیں، اسے "گوٹا" کہتے ہیں،[2]

بھوپال میں پان کی جگہ ایک قسم کا مسالا استعمال کرتے ہیں، جس میں جوز، جوتری، پستہ، کتھا، ز گ، الائچی، چھالیا وغیرہ ڈالتے ہیں، اس کا نام گھگا ہے،[3]

حقے کا رواج ہندوستان میں اکبر (م ۱۶۰۵ء) کے عہد میں شروع ہوا، حقے کی ابتدائی شکل گڑگڑی یا ناریل تھی، رفتہ رفتہ اس میں ترقی ہوئی اور خوبصورتی کے ساتھ نفاست بھی پیدا ہوئی، اب بھنڈا، پیچوان، فرشی حقہ، فرشی گڑگڑی، شک وغیرہ مجلس کی زینت بننے لگے، سرراہ پلانے کے لئے ہتھڑیا دھڑیا، یا لکڑ بنایا گیا، نیچہ اور فتح پیچ نے حقے کو حسین تر اور آرام دہ بنایا، حفظان صحت کے اصول پر نیچے میں مہنال لگائی گئی، چلم کی آگ کو بھڑکنے سے بچانے کے لئے اور کچھ زینت کی خاطر بھی اس پر سرپوش رکھا جانے لگا، اسے جنبر یا چنبل بھی کہتے ہیں، عرق گیر یا گٹی چلم کے نیچے اس غرض سے رکھتے ہیں کہ تمباکو کا عرق اس میں رہے اور نے کا پانی خراب نہ ہو، اسے جنجل بھی کہا جاتا ہے، فرشی کو خراب ہونے سے بچانے کے لئے اس کے نیچے کپڑا یا چمڑا بچھایا جاتا ہے،

---

[1] نور الحسن نیر، نور اللغات، حصہ دوم [2] سید احمد دہلوی، فرہنگ آصفیہ، ج ۴ [3] ایضاً،

جسے زیر انداز کہتے ہیں،

پہلے تبا کو معمولی قسم کا استعمال ہوتا تھا، اس میں اصلاح اور ترقی ہوئی، اور گڑ کے شیرے کی ملاوٹ سے اس کی تلخی کو دور کیا گیا، پھر لطیف و نفیس خمیرہ تیار ہوا، اس کے بعد تو دو رسہ سہ رسہ، چو رسہ خمیروں کی خوشبو سے محفل مہک اٹھی،

حقہ دو طرح سے پیا جاتا ہے یا چلم دو طرح سے بھری جاتی ہے، سلفا اور توا، سلفا جلد کش لگانے کے لئے ہے، توا کچھ دیر میں سلگتا ہے اور کافی دیر تک چلتا ہے، اہل مجلس کی خاطر و ضع کے لئے توا ہی استعمال ہوتا ہے، پہلے بڑے بڑے شہروں میں چائے کی دکان کی طرح حقہ پینے کی جگہیں بنی تھیں، ان کو گگڑ خانہ کہتے تھے، اور حقہ پلانے والا گگڑ والا کہلاتا تھا، اسے ساقی جنگ کہتے تھے،

عوام کی زبان میں عمو ماً حقے کو پنچوں کا پیالہ کہا جاتا ہے اور پنچوں کا پیالہ پینا سے مراد برادری میں شامل ہوتا ہے کسی زمانے میں حقہ پانی بند بڑی کڑی سزا تھی،

حقے کی مقبولیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اردو شاعری نے بھی اسے اپنا موضوع بنایا، محمد شاہ نے اپنے زمانے کے ایک شاعر جعفر علی خاں زکی سے اس موضوع پر ایک مثنوی لکھنے کی فرمائش کی تھی لیکن وہ دو تین شعر سے زیادہ نہ کہہ سکے، آخر شاہ حاتم نے اس کام کو انجام دیا[1]، نیچے اس مثنوی کے آخری حصے کے چند منتخب اشعار نقل کئے جاتے ہیں،

ہے حقہ یار یارو، دل جلوں کا	ہے حقہ درد میں مونس سبھوں کا
مزہ اس تلخ وش کا آئے اس کوں	کہ گزرا گھونٹ ساپی جائے اس کوں
مسیحا دم اسے کہنا روا ہے	کہ ہر یک مرض کو اس سے شفا ہے

---

[1] میر تقی میر، نکات الشعرا، ص ۳۰، ۱۳۶،

مجھے دن رات ایسا یار بس ہے
کہ ہر دم جس کے تئیں پاس نفس ہے

ہے آمد رفت اس کے دم کی دن رات
ہمدم حیات، ہم فرحت ذات

قبول خاطر شاہ و گدا ہے
یہ ہفتاد و دو ملت آشنا ہے

ہے سب کے مذہب و مشرب سے آگاہ
ہے ہر یک محفل اندر اس کے تئیں راہ

وہ ہے گا آشنا دونوں سے یکساں
طلبگار اس کے ہیں ہندو مسلماں

ہے شمع مجلس و مجلس کا صاحب
جہاں دیکھو تہاں سب کا مصاحب

ہے عاشق سیرت و معشوق صورت
ملے ہے نیک و بد سے بے کدورت

تمام عالم میں حاتم ڈھونڈ آیا
پر ایسا دوسرا ہمدم نہ پایا[1]

عورتیں بھی حقہ پیتی تھیں، میر حسن نے ایک موقع پر بدر منیر کے لئے حقہ یوں تیار کیا ہے:

خواص ایک حقہ لئے تھی کھڑی
کہ لالے کی پتی تھی اس میں پڑی

وہ شیشے کا حقہ مرصع کا کام
مغرق زری کا وہ نیچہ تمام

ولے ایک اس پر پڑا تھا جو پیچ
یہ سب اس کے آگے تھا گویا کہ ہیچ

لب نازک اوپر وہ مہنال دھر
نکالے تھی پردے میں دو دو جگہ

شعرا نے غزلوں میں بھی اسے "مسیحا دم" کہہ کر کبھی کبھی یاد کیا ہے، لیکن ان اشعار کو ادبی حیثیت سے کچھ زیادہ اہمیت نہیں دی جا سکتی۔

انگریزی تہذیب و تمدن کے اثر سے حقے کا رواج شہروں میں بہت کم ہو گیا ہے اور اس کی جگہ سگریٹ نے لے لی ہے، عوام بیڑی پیتے ہیں، جو کچھ تمباکو سے بنتی ہے، اعلا انگریزی تعلیم یافتہ سگریٹ کے علاوہ چرٹ یا سگار اور پائپ بھی استعمال کرتے ہیں، انگریزی کے یہ تینوں الفاظ اردو نے اپنا لئے ہیں۔

[1] دیوان زادہ قلمی، مخزونہ رضا لائبریری، رام پور، یوپی۔

۶

لباس

لباس ستر پوشی کے لئے بھی ہے، راحت و آسائش کے واسطے بھی اور زیب و زینت کی خاطر بھی۔ ہندوستان میں قدیم زمانے میں بہت سیدھا سادہ لباس پہنا جاتا تھا، یعنی دھوتی، ساڑی اور چادر۔ دھوتی کا نام دھوتی اس لئے پڑا کہ اسے ہر روز صبح کو دھو کر پاک کر لیا جاتا ہے[1] کیونکہ (ہندو عقیدے کے مطابق) رات کی بندھی ہوئی دھوتی کو ناپاک خیال جاتا ہے[2]۔ مرد سر پر عموماً پگڑی باندھتے تھے۔ راجے، مہاراجے موتی اور جواہرات ٹکی ہوئی پگڑی استعمال کرتے تھے جسے پاگ کہا جاتا تھا، نوکر چاکر چیرا باندھتے تھے۔ امتداد زمانہ کے ساتھ اور مسلمانوں کے اس ملک میں آباد ہو جانے کی وجہ سے یہاں کے لباس میں اضافہ اور ترقی ہوئی۔ عورتوں کے لباس میں چولی، انگیا، لہنگا (سایا)، گھاگھرا، اوڑھنی، دوپٹہ، پشواز، جوڑا وغیرہ داخل ہوئے۔ جوڑا ایک خاص قسم کی پوشاک تھی، جو دلہن کو برات کے دن پہنائی جاتی تھی[3]۔ اب اس کا رواج بہت کم ہو گیا ہے۔ مردوں نے انگرکھا، شلوکہ، بالا بر، اچکن (چپکن)، شیروانی، نیمہ، نیم آستین، صدری (کمری، جاکٹ)، مرزئی، ڈگلا، گھٹنا، مندیل، ٹوپی، چیرا، پٹکہ وغیرہ استعمال کرنا شروع کیا۔ مسلمان باہر سے اپنے ساتھ عبا، قبا، جبہ، جغہ، فرگل (فرغل)، دستار، عمامہ، شملہ، کلاہ، کرتا، پاجامہ (پائجامہ)، ازار، شلوار، تہمد (تہ بند)، لنگی، برقع، محرم (سینہ بند)، شال

---

[1] ظفر الرحمن دہلوی، فرہنگ اصطلاحات پیشہ وراں، ج ۸، ص ۔ [2] سید احمد دہلوی، فرہنگ آصفیہ، ج ۲ ص ۔

وغیرہ لے کر آئے تھے، اکثر لباس عام ہو گئے یعنی ہندو مسلمان دونوں انھیں استعمال کرنے لگے مثلاً اچکن، انگرکھا، شلوکا، مرزئی، صدری، شیروانی[1]، صافہ، پاجامہ، دھوتی، انگیا، چولی، محرم، ساڑی، اوڑھنی، دوپٹہ وغیرہ، صرف چند چیزیں مسلمانوں کے ساتھ مخصوص تھیں اور آج بھی یہی حال ہے، جیسے عبا، قبا، دستار، عمامہ، شملہ، تہمد، برقع وغیرہ، شاہان وقت، امرا اور رؤسا دستار میں طرہ یا جیغہ یا مرصع کلغی استعمال کرتے تھے، پروفیسر خلیق احمد نظامی کا بیان ہے کہ (WINDSOR PALACE) کے کتب خانہ میں بادشاہ نامے کا ایک مصور قلمی نسخہ ہے، جس میں مغلیہ دور کے امرا کی بے حد دلچسپ معاصر تصویریں ہیں، دیکھ کر یہ اندازہ لگانا مشکل ہے کہ اس میں ہندو امیر کونسا ہے اور مسلمان کون[2]۔ اردو زبان نے مذکورۂ بالا تمام الفاظ اپنا لئے اور عالم اور عامی دونوں انھیں استعمال کرتے ہیں،

وقت کی رفتار کے ساتھ بعض کپڑوں کی وضع قطع میں تبدیلی اور تنوع پیدا ہوا، پاجامے کی خصوصاً کئی قسمیں ہوئیں، مثلاً قندھاری پاجامہ، غرض کے پائنچوں کا پاجامہ، ایک بر کا پاجامہ، کلی دار پاجامہ، غرارہ، شلوار (ڈھلا) اور یہی یا اریب دار (آڑا) پاجامہ، چوڑی دار پاجامہ کھڑا پاجامہ، علی گڑھ پاجامہ وغیرہ، ٹوپی کی بھی متعدد قسمیں وجود میں آئیں جیسے، چوگوشیہ، پنج گوشیہ، دو پلڑی (دوپلی)، نکے دار، مندیل، عرق چیں، عالم پسند (جھونا)[3]، ترکی ٹوپی، ایرانی ٹوپی، مغلئی ٹوپی، رام پوری ٹوپی، کشتی نما ٹوپی، تاکمن، مکٹ وغیرہ، ٹوپ یا کن ٹوپ کو

---

[1] حیدر آباد کے امرا کشمیر کے بنے ہوئے ایک اعلیٰ قسم کے اون کپڑے کی جو شیروان یا شیروانی کے نام سے مشہور تھا، اچکن پہنا کرتے تھے، کپڑے کی شہرت اور عمدگی کی وجہ سے اچکن کا نام شیروانی پڑ گیا، (ظفر الرحمٰن دہلوی، اصطلاحات پیشہ وران جلد دوم [2] اوراق مصور، دہلی شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی ۱۹۶۳ء، ص ۱۱،

[3] نواب واجد علی شاہ کی ایجاد ہے، (مولانا عبد الحلیم شرر لکھنوی، گذشتہ لکھنؤ، ص ۳۱۳،

بھی ٹوپیوں ہی میں شمار کرنا چاہئے،

عراق میں ایک قسم کی گول ٹوپی تھی جو سر کے پسینے سے پگڑی کو محفوظ رکھنے کے لئے دستار کے نیچے پہنی جاتی تھی، اب آدمی کتری ہوئی کا مدار ٹوپی کو کہتے ہیں اور بغیر پگڑی کے پہنی جاتی ہے۔[1] تاکھن ایک خاص وضع کی پٹاری نما ٹوپی ہے، جو پارسی ٹوپی کے نام سے مشہور ہے اور اس قوم کے بزرگ اس کو اپنی قومی ٹوپی سمجھتے ہیں، تاکھن لفظ طاقیہ یا طاقی کا غلط تلفظ ہے۔[2] اسی طرح بکٹ ہندوؤں کی ایک مخصوص ٹوپی ہے جو کلغی دار ہوتی ہے، یہ دراصل کرشن جی کا تاج تھا، اسی کی نقل ہندو دولھا کو پہنائی جاتی ہے،

جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے، قدیم زمانے میں ہندوستان میں مرد سر پر پگڑی باندھتے تھے؛ امتداد وقت کے ساتھ اس نے بھی نئے نئے انداز اختیار کئے، مثلاً پٹی دار پگڑی، چوڑی دار پگڑی، اکھڑکی دار پگڑی، نستعلیق پگڑی (دستار)، چکورے دار پگڑی، سیٹھی پگڑی (سرپیچی، بتلی، چیرا)، مندیل وغیرہ، پگڑی میں سرپیچ یا بالابند ہوتا، جو اس کے حسن کو دوبالا کرتا، مسلمان بھی پگڑی باندھتے تھے، علماء و فضلا کی پگڑی کو عمامہ کہا جاتا اور یہ لفظ آج بھی اسی مفہوم میں مستعمل ہے، بادشاہوں کی پگڑی کو دستار کہا جاتا، اس کے وسط میں نوکدار مخروطی کلاہ ہوتی، مرور زمانہ کے ساتھ اس کا استعمال عام ہو گیا اور دستار کا لفظ اپنے مخصوص معنی سے ہٹ کر عام پگڑی کے مفہوم میں استعمال ہونے لگا، میر تقی میر کا مشہور شعر ہے:

میر صاحب زمانہ نازک ہے   دونوں ہاتھوں سے تھامیے دستار

ہندوستانی معاشرت میں کسی وقت میں دستار یا پگڑی بڑی اہمیت کی چیز تھی، دستار بدل بھائی ہوتے تھے جن کا خلوص اور محبت قابل رشک تھی، پگڑی بدلنا اسی مفہوم میں محاورہ ہے۔[3]

---

[1] نور الحسن نیر، نور اللغات، حصہ سوم [2] ظفر الرحمن دہلوی فرہنگ اصطلاحات پیشہ وراں جلد دوم

پگڑی بندھنا ایک دوسرا محاورہ ہے جس کا مفہوم ہے سرداری یا وراثت کی پگڑی سر پر رکھی جانا، بعض مسلمانوں میں فاتحہ سوم کے روز اور ہندوؤں میں اکثر مردے کی تیرہویں کے دن وراثت کی پگڑی بندھوائی جاتی ہے، پگڑی کی اہمیت کا اندازہ مندرجہ ذیل محاوروں سے بھی لگایا جا سکتا ہے،

پگڑی اتارنا (بے آبرو کرنا)، پگڑی اترنا (بے عزت ہونا)، پگڑی اچھالنا (رسوا کرنا) پگڑی اچھلنا (رسوا ہونا)، پگڑی کی شرم رکھنا (آبرو رکھنا)، پگڑی اٹکنا (ہمسری یا مقابلہ ہونا)

عورتوں کی زبان میں پگڑی والا حکیم، بید اور ڈاکٹر کو کہتے ہیں، چونکہ عورتیں صبح کو اور رات کے وقت حکیم کا نام لینا منحوس خیال کرتی ہیں، اس لئے ان وقتوں میں پگڑی والا یا جیرے والا کہتی ہیں۔ جیسے یورپ اور امریکا وغیرہ میں فارغ التحصیل طلبہ کو ڈگریاں دی جاتی ہیں، اسی طرح اسلامی مدارس کے فارغ التحصیل طلبہ کے سر پر دستار فضیلت باندھی جاتی ہے، اسلامی درسگاہوں میں دستار بندی کی نوعیت وہی ہے، جو یونیورسٹیوں میں کنووکیشن (CONVOCATION) کی ہے، تملہ بہ مقدار علم فارسی کی ایک مشہور مثل ہے جو اردو میں بھی مستعمل ہے،

انگریزوں نے مردانہ لباس میں کوٹ، پتلون، نیکر، سوٹ، واسکٹ (VEST COAT) ٹائی، بش شرٹ، قمیص، بنیان، کالر، ہیٹ، گاؤن، اوور کوٹ، چسٹر، رین کوٹ وغیرہ کا اور زنانہ لباس میں فراک، جمپر، بلاؤز، پیٹی کوٹ، انڈر ویر (UNDER WEAR) وغیرہ کا اضافہ کیا، اردو میں یہ نام بعینہٖ مستعمل ہیں، آخر الذکر کے لئے تہ پوش کا لفظ گھڑا گیا ہے، جو عام نہیں ہوا ہے،

لباس کے سلسلے میں دستی، رومال، روپاک، عرق گیر، پانو پاگ، بینی پاک، دستانہ، جراب،

لہ سید احمد دہلوی، فرہنگ آصفیہ جلد اول ۲ہ ایضاً ۳ہ اگرچہ یہ لفظ عربی ہے، لیکن لباس انگریزی ہے،

پاتابہ، موزے وغیرہ کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، یہ چیزیں مسلمان اپنے ساتھ باہر سے لائے ۔
ہندوستان میں انگوچھا تھا جو ہاتھ منہ پونچھنے کے لئے بھی کام آتا تھا اور دھوپ میں سر پر بھی
ڈال لیا جاتا تھا۔ انگوچھے کا یہ استعمال دیہاتوں میں آج بھی پایا جاتا ہے۔ انگریزوں کے ساتھ
ٹوال (TOWEL) آیا جو اردو میں تولیا بن گیا۔

جوتا لباس کا ایک اہم جزو ہے، ہندوستان میں جوتے کا چلن نہیں تھا، لوگ ننگے پاؤں
ہوتے یا کھڑاؤں پہنتے تھے۔ جوتا مسلمانوں کے ساتھ اس ملک میں آیا۔ ٹوپی کی طرح اس نے بھی تبدیلی
اور ترقی کی مختلف منزلیں طے کیں اور اس کے مختلف نام پڑے، مثلاً بٹھوان جوتا، چرھواں
جوتا، لال زری کے جوتے، کاشانی مخمل کے جوتے، ٹاٹ بافی کا جوتا، تیکی کا جوتا، خوردنوکا، دلی والا
جوتا، کامدار جوتا، دھلی، سلیم شاہی جوتا وغیرہ۔ آخرالذکر اکبر شاہ ثانی کے لڑکے شہزادہ سلیم کی
ایجاد ہے۔[1] غلطی سے لوگ اسے جہانگیر کی طرف منسوب کرتے ہیں، شاید اس لئے کہ تاریخ میں وہی
شہزادہ سلیم کے نام سے مشہور ہے۔ صاحب فرہنگ اصطلاحات پیشہ وراں نے اس کی وجہ تسمیہ
یہ بتائی ہے کہ یہ حضرت سلیم چشتی کا پسندیدہ تھا، لیکن اور کسی ذریعے سے اس کی تائید نہیں ہوتی۔
مذکورۂ بالا تمام جوتوں کی ساخت کے لحاظ سے ہیں جنس جوتا کے لئے کفش، پاپوش، جفت پا،
کفش پائی، آرام پائی، زیرپائی، پیزار، نعلین وغیرہ نام وقتاً فوقتاً رکھے گئے، لیکن اب ان ناموں
میں سے اکثر کا چلن نہیں رہا، مگر پاپوش اور پیزار نے اردو زبان میں اپنی مستقل جگہ بنائی ہے،
کیونکہ محاورے نے انہیں اپنے دامن میں لے لیا ہے، پاپوش سے، پاپوش پر مارنا، پاپوش بھی نہ
مارنا، پاپوش کی نوک سے، پاپوش کی خاک سے وغیرہ اور پیزار سے، پیزار کی نوک سے
(پر)، پیزار پر مارنا، پیزار دکھانا وغیرہ عورتوں کی زبان کے محاورے ہیں۔

---

[1] سید احمد دہلوی، لغت مذکور، ج ۱، مقدمہ، ص ۱۷

بچپل کو بھی جو عورت مرد دونوں استعمال کرتے ہیں، جوتوں ہی میں شمار کرنا ہوگا، یہ حیدرآباد کی ایجاد ہے۔[1]

انگریزوں کی ہندوستان میں آمد کے بعد شوز، پمپ شوز (گرگابی) بوٹ، سینڈل، سلیپر وغیرہ استعمال ہونے لگے، اردو نے ان ناموں کو اپنالیا ہے۔

جوتے کے سلسلے میں پالش اور برش کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ یہ انگریزی الفاظ اب اردو میں جذب ہو چکے ہیں۔

جوتے کے متعلقات کے لئے بھی اردو میں کافی دلچسپ الفاظ استعمال ہوتے ہیں، نیچے چند متعلقات لکھے جاتے ہیں۔

بان:۔ جوتے کی ایڑی کے پہلوؤں پر مضبوطی کے لئے خوبصورت تراش کا سلا ہوا چمڑا۔

تو ا:۔ جوتے کے پنجے کے سرے کا چمڑے کا جوڑ جو نوک یا ٹھوکر پر رہتا ہے۔

زبان:۔ جوتے کے پاکھوں کے نیچے کی چمڑے کی پٹی۔

سکھ تلا جوتے کے نیچے۔ اوپر کا نرم اور اچھی قسم کا چمڑا جو پیر کے تلوے کو سلائی کی رگڑ سے محفوظ رکھے۔

لا:۔ کامدار یا دھلی جوتے میں ڈالا جانے والا زردوزی سکھ تلا۔

لنگوٹ:۔ جوتے کی ایڑی کی سلائی پر اندر کے رخ لگی ہوئی چمڑے کی پٹی۔[2]

دونوں پیر کے جوتوں کو جوڑا کہتے ہیں۔ جس سے ہر اردو داں واقف ہے۔ ان میں سے ایک کو پوائی کہا جاتا ہے، جس کا استعمال بہت کم ہے۔

---

[1] (مولانا) عبدالحلیم شرر لکھنوی گذشتہ لکھنؤ ص ۳۲۲ [2] یہ اصطلاحات فرہنگ اصطلاحات پیشہ وراں، مولفہ ظفر الرحمٰن دہلوی، سے لی گئی ہیں۔

لباس اور کپڑا لازم و ملزوم ہیں، اس لئے ان کپڑوں کا ذکر بھی ضروری ہے جن سے
لباس تیار ہوتے رہے ہیں، یا آج تیار ہوتے ہیں پھر لباس کی طرح کپڑے سے بھی آدمی کے
تہذیبی رجحان کا پتا چلتا ہے۔ ہندوستان میں پارچہ بافی کا کام ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے اور
سوتی، ریشمی اور اونی، ہر طرح کے کپڑے بنتے رہے ہیں۔ مسلمانوں نے اس صنعت کو اور ترقی
دی ہے۔ لیکن اس ترقی کے باوجود ہندوستان میں بیرونی ممالک سے اعلیٰ درجے کے کپڑے
برابر آیا کرتے تھے۔ زربفت، مخمل، مشجر، دیبا اور اطلس خصوصاً باہر سے منگائے جاتے تھے۔ ان
کپڑوں کے اکثر نام جو اردو میں مستعمل ہیں، مسلمان بادشاہوں کے عہد سے تعلق رکھتے ہیں،
چونکہ ان کی زبان فارسی تھی، اس لئے یہ نام زیادہ تر فارسی ہیں، اور ان سے اعلیٰ درجے کی
تہذیب اور شائستگی کا اظہار ہوتا ہے، ان کی فہرست خاصی طویل ہے، نیچے چند نام دئے
جاتے ہیں۔

مخمل، کمخواب، اطلس، شروان (شیروانی) پشمینہ، پٹ پشمینہ، کشمیرا، اروان، بانات،
مالیدہ، نرما، زربفت، بادلا (بادلہ) کلابتون، تاش (طاش)، جھجھر، جھرمی، سلاسل، مشجر،
گلشن، دیبا، بہادر شاہی، محمودی، جامہ وار، کتان، مشروع، تنادیز (بلبل چشم) دریائی،
لاہی پھلکاری، رادھانگری، تمامی، رعنا، بادام، موج لہر، سنگی، سوسی، گبرون، خنجری، مخملی،
ململ، شبنم، یک تارا، شربتی، آب رواں، پھوار، تنزیب، سکھ بدن، جامدانی (باج ہندی)
چکن، ڈوریا، نورسی، دھوپ چھاؤں، (مورکھی)، چھینٹ وغیرہ۔

اوپر جن کپڑوں کے نام دئے گئے ہیں، وہ زیادہ تر ثروت مند اور خوشحال لوگوں کے
استعمال میں آتے ہیں، ان کپڑوں کے ساتھ ساتھ غریبوں کے استعمال میں آنے والے گزی،

---

[1] سید صباح الدین عبد الرحمٰن، "ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی جلوے" ص ۶۱، ۶۲۔

گاڑھے، کھادی (کھدر) مارکین (ملیشیا)، چارخانہ لٹھے وغیرہ کو بھی یاد رکھنا چاہیے،

یہ کپڑے جو ہندوستان میں بنتے تھے، رنگ کے لحاظ سے متنوع تھے، مسلمانوں کی ہندوستان میں آمد سے پہلے جن رنگوں کے کپڑے تیار ہوتے تھے، ان میں سے چند یہ تھے:

آسمانی، انگوری، بادامی، بیگنی، پیازی، پستی، تربوزی، جامنی، جوگیا، چمپئی، دھانی، دودھیا، روپہلا، سیندوری، سلیٹی، فالسئی، کیسری، کتھئی، کسمی، کرنجی، کیوڑی، کاہی، گیندئی، لاکھی، مونگیا، مٹیلا وغیرہ،

مسلمانوں کے عہد میں ان رنگوں میں اور تنوع پیدا ہوا، چند نام ذیل میں دے جاتے ہیں:

آبنوسی، آبی، آتشی، ارغوانی، اخضری، حنائی، خاکستری، رمانی، زنگاری، زعفرانی، زیتونی، زمردی، سوسنی، شنگرفی، شربتی، شہابی، طاؤسی، عنبری، عنابی، فیروزی، فرفری، کبودی، کاسی، گلنار، لاجوردی، مرجانی، نقرئی، یاقوتی وغیرہ،[1]

بعض کپڑوں میں پھول بھی کاڑھے ہوتے ہیں، جیسے جامدانی، چکن، پھلکاری وغیرہ، یا ٹیٹرون، ٹیٹرکس وغیرہ کی بعض قسموں پر، لیکن اس قسم کے کپڑے کم ہیں

اتنے متنوع، خوبصورت اور آرام دہ کپڑوں کے تیار کرنے والے کا نام نہ لینا بے انصافی ہوگی، اسے عام زبان میں "جلاہا" کہا جاتا ہے، تخصیص کے لئے ہندو جلاہے کو کولی اور مسلمان جلاہے کو مومن کہا جاتا ہے، اردو زبان کی شائستگی نے جلاہے کی تحقیر کو دور کرنے کے لئے اسے پارچہ باف یا نورباف کا نام دیا، شعر و ادب میں نساج کا لفظ بھی استعمال ہوتا ہے،

اب تو زیادہ تر کپڑے ملوں میں تیار ہوتے ہیں، لیکن قدیم زمانہ میں ہاتھ سے بُنے جاتے تھے، جس جگہ بنائی کا کام ہوتا تھا، اسے کرگاہ (کارگاہ کا مخفف) کہا جاتا تھا۔

---

[1] سید صباح الدین عبدالرحمٰن، ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے تمدنی جلوے ص ۱۰۰، [2] ایضاً ص ۱۰۱

کپڑا تیار ہونے کے بعد بکنے کے لئے بازار میں آتا ہے، اس کے بیچنے والے کو بزاز اور اس بازار کو بزازہ کہا جاتا ہے، ململ کی مناسبت سے اسے سفید بازار بھی کہا جاتا تھا۔

ہندوستان کی عورتیں ہمیشہ رنگین اور پھولدار کپڑے کی دلدادہ رہی ہیں، اس لئے سادہ کپڑوں پر خوبصورت رنگین بیل بوٹے چھاپنے کا رواج ہوا، کپڑے کی زمین سفید بھی رکھی جاتی ہے، اور رنگین بھی کر لی جاتی ہے، اس کام یا پیشے کو چھپائی کا کام یا پیشہ یا چھپ کاری کہا جاتا ہے، چھپائی کی طرز میں کاریگروں نے کافی تنوع پیدا کیا، زنجیرا، مرلی، لہریا وغیرہ چند طرزوں یا شکلوں کے نام ہیں، بیلیں اور بوٹے اگر آنکھوں کے لئے خوشنما ہیں تو ان کے نام جو اصطلاح کی حیثیت رکھتے ہیں، کانوں کے لئے بھی خوش آیند ہیں، مثلاً انگوری بیل، پھول پان بیل، گل بہار بیل، تاک دار بوٹا، دو قدا بوٹا، کنج بوٹا وغیرہ[1]

سوزن کاری (سوئی یا کڑھائی کا کام) جسے عموماً کشیدہ کاری، گلکاری، نقاشی وغیرہ کہا جاتا ہے، عورتوں کی بڑی مقبول چیز ہے اور کپڑوں کو بہت حسین بنانے والی ہے، اس صنعت کو چکن کاری یا چکن دوزی کہتے ہیں، یہ لباس کے علاوہ چادر، تکیہ، غلاف، دستی، ٹیبل کلاتھ وغیرہ کو بھی زینت دیتا ہے، جھلکاری بھی اسی سلسلے کی چیز ہے، سوتی یا ریشمی کپڑے یا زری کے پھول بوٹے کتر کر کپڑے پر ٹانکنے کو جھلکاری کہتے ہیں[2] کپڑوں پر موتیوں کے پھول بوٹے بھی بنائے جاتے ہیں، اسے پوتھ کاری کہا جاتا ہے[3] بہاڑی عورتیں کپڑے پر چھوٹے چھوٹے آئینے بجائے پھول سی دیتی ہیں، اسے یام کہتے ہیں[4]

اس سلسلے کی تیسری اور سب سے اعلیٰ صنعت زردوزی ہے، یہ عموماً قیمتی یا اعلیٰ درجے کے کپڑوں میں استعمال ہوتی ہے، اسے اس کی مختلف روش یا کڑھائی کے لحاظ سے مختلف نام

---

[1] ظفر الرحمٰن دہلوی، فرہنگ اصطلاحات پیشہ وراں، جلد دوم [2] ایضاً [3] ایضاً [4] ایضاً۔

دیئے گئے ہیں، مثلاً کامدانی، بھرت کاری، کارچوبی، گلکاری، وصلی، سلمے تارے کا کام وغیرہ، اس کام کے لئے سونے اور چاندی کے جو تار استعمال ہوتے ہیں، انھیں بادلہ (بادلا) اور مقیش کہتے ہیں اور ریشمی یا سوتی ڈورے پر بٹے ہوئے بادلے کو کلابتون یا کلابتو کہتے ہیں، کلابتون ترکی زبان کا لفظ ہے، اسی سے کلابتو بنا لیا گیا ہے، سونے چاندی کے تاروں کو باریک کرنے کو تارکشی کہا جاتا ہے،

زری کا تیار کیا ہوا گوٹا یا گوٹ کناری جسے عموماً گوٹا کناری کہا جاتا ہے، زنانے لباس کو زرق برق بناتی ہے، منقش گوٹے کو ٹھپا کہتے ہیں، زری گوٹا خواہ کسی قسم کا ہو اصطلاحاً مسالہ کہلاتا ہے، مسالے دو طرح کے ہوتے ہیں، سچا مسالا، جھوٹا (کھوٹا) مسالا، سچا مسالا سونے یا چاندی کا ہوتا ہے، اور جھوٹا مسالہ تہ بنرے کا، زری گوٹا بنانے والے کاریگر کو زرباف یا گوٹا باف کہا جاتا ہے، مسالے کی کئی قسمیں ہیں، مثلاً دو انگشتیا گوٹا، گنگا جمنی گوٹیا، گوکھرو، سمندر لہر، دھنک، پیمک، ماہی پشت (ماہی پشت کا جال)، طرہ، کناری، پٹھا، لچکا، لپا وغیرہ، گوٹا کناری کے علاوہ کرن بھی زنانے لباس کو مزین کرتی ہے، کرن سنہرے یا روپہلے بادلے کی بنی ہوئی جھالر کو کہتے ہیں جو آنچل پر لگائی جاتی ہے، اس کی بھی کئی قسمیں ہیں جیسے انگشتیا کرن، دو انگشتیا کرن، آنچل وغیرہ، سونے یا چاندی کے پھول جھالر کے طور پر دامن یا پلو کے کور پر ٹانکے جاتے ہیں، اسے سراسری کہتے ہیں[1]، اس سلسلے میں ولایتی لیس کو فراموش نہیں کیا جا سکتا،

میر حسن نے مثنوی سحر البیان میں بعض لباسوں کا ذکر کیا ہے، مندرجۂ ذیل اشعار کو پڑھ کر ان لباسوں کی خوبصورتی، نفاست اور زیبایش کا اندازہ ہوتا ہے،

کہوں اس کی پوشاک کا کیا بیاں فقط ایک پشواز آبِ رواں

---

[1] ظفر الرحمٰن دہلوی فرہنگ اصطلاحات پیشہ وراں، جلد دوم

زبس موتیوں کی تھی سنجاف کل — کہے تو وہ بیٹھی تھی موتی میں تل

اور ایک اوڑھنی جوں ہوا یا حباب — جسے دیکھ شبنم کو آوے حجاب

صباحت، صفا اس میں جھلکی ہوئی — بڑی سر سے کاندھے پہ ڈھلکی ہوئی

گریباں میں تکمہ اک الماس کا — ستارہ سا مہتاب کے پاس کا

وہ کرتی وہ انگیا جواہر نگار — نیا باغ اور ابتدا کی بہار

جھلک پائجامے کی دامن سے یوں — نظر آئے آئینے میں برق جوں

صفائی یہ پوشاک کی دیکھیو — نظر سوچ میں ہے کہ میلی نہ ہو

اوپر کے اشعار میں زنانہ لباس کی زیبائش و آرائش پائی جاتی ہے، تو مندرجہ ذیل اشعار میں مردانہ لباس کی چمک دمک ملتی ہے،

گلے میں پڑا نیمہ شبنم کا ایک — بدن سے عیاں نور عالم کا ایک

تمامی کی سنجاف جلوہ کناں — کہ جوں عکسِ مہ زیرِ آبِ رواں

طرح دار اک سر پہ بھیٹا سجا — تمامی کا پٹکا کمر سے بندھا

عجب بیچ سے پیچ بیٹھے تھے مل — کہ ہر پیچ پر پیچ کھاتا تھا دل

جواہر کا تکمہ گلے میں لگا — ستارہ ہو جوں صبح کا جگمگا

وہ موتی کی لٹکن، زمرد کی پر — لٹک جس کی زیبندہ دستار پر

لباس کا تذکرہ ادھورا رہ جائے گا اگر شال کا ذکر نہ کیا جائے، شال ہندوستان کی ایک خاص چیز ہے، جو عورت اور مرد دونوں استعمال کرتے ہیں، یہ سردی سے محفوظ رکھنے کے لئے بھی ہے اور زیبائش کے واسطے بھی، جہاں سردی کم پڑتی ہے وہاں بھی اس کا استعمال پایا جاتا ہے، جو ظاہر ہے زیبائش کی خاطر ہوتا ہے، اس صنعت کو ہندوستان میں عہد اکبری میں

خاص ترقی ہوئی، صرف ایک شہر لاہور میں شال بافی کے ایک ہزار سے زیادہ کارخانے تھے،[1] اس عہد سے پہلے چھوٹی شالیں بنتی تھیں، لیکن اکبر کی خواہش پر بڑی شالیں بھی تیار ہونے لگیں، یہ شالیں مختلف رنگوں کی بنتی تھیں، مثلاً نارنجی، قرمزی، صندلی، بادامی، ارغوانی، عنابی، زیتونی، زمردی، فاختی وغیرہ،[2] ان رنگوں کی شالیں آج بھی ہندوستان میں بنتی ہیں، اور اہل استطاعت انھیں بڑے شوق سے خریدتے اور استعمال کرتے ہیں، کشمیری شالیں خصوصاً زیادہ مشہور ہیں، شال اگر دہری یا دو فردی ہو تو اسے دوشالہ یا چادر جوڑا کہا جاتا ہے،

صاحب فرہنگ اصطلاحات پیشہ وراں نے شال کی مندرجۂ ذیل قسمیں بتائی ہیں:

جوہری شال، دور دار شال (حاشیہ دار شال)، زوج شال (دورخی کڑھی ہوئی شال) شکار گاہ (وہ شال جس کے متن میں صحرائی جانوروں کی شکلیں کڑھی ہوتی ہیں)، قدری شال یا شال چہار باغ (اس قسم کی شال میں معمولی کام سے زیادہ عمدہ اور خوشنما کام بنا ہو تو دو قدری اور سہ قدری کہلاتی ہے) کھوسار (دہرا حاشیہ کڑھی ہوئی شال) قصابہ یا کسا (شال کی قسم کا مگر اس سے چھوٹا صرف سر پر اوڑھنے یا گلے میں باندھنے کا پارچہ)[3]

شال کے علاوہ پشمینے کی بنی ہوئی چادر بھی اہل ثروت استعمال کرتے ہیں، سنجاب، سمور، قاقم وغیرہ کی بنی ہوئی پوستینیں بھی امرا و رؤسا کے استعمال میں رہتی ہیں، ان تینوں لفظوں کی اردو شعر و ادب میں مستقل جگہ ہے۔

انگریز بھی اپنے ساتھ قسم قسم کے مردانہ اور زنانہ کپڑے لائے جو بناوٹ کے لحاظ سے عمدہ اور رنگ اور طرز (ڈیزائن) کے اعتبار سے پسندیدہ تھے، ان میں سادگی کے ساتھ نفاست تھی، جو لوگ مغربی تہذیب سے متاثر ہوئے انھوں نے تو ان کپڑوں کو استعمال کیا ہے، مشرقی

---

[1] ابوالفضل، آئین اکبری ج ۱، آئین شال ص ۹۸ [2] ایضاً [3] ظفر الرحمٰن دہلوی فرہنگ اصطلاحات پیشہ وراں، جلد دوم

تہذیب کے سنجیدہ یا ثقہ مزاج حضرت نے بھی ان کو پسند کیا، ان کپڑوں میں سے چند کے نام جو اردو میں عموماً مستعمل ہیں، نیچے دیئے جاتے ہیں،

پاپلین، ٹول، ڈرل (زین)، ساٹن ڈک، مکھن زین، لانگ لٹ (لٹھا یا چھالٹی) وائل، جارجٹ، الپاکا، فلالین، (FLANNEL) سرج (SURGE) کریپ (CRAPE) چیک (CHECK) بابل لیٹ (BOBBIN KNIT) وغیرہ، آخر الذکر کو اردو میں کنجل لیٹ بھی کہتے ہیں۔

موجودہ دور میں ٹیرلین، ٹیریکاٹ، ٹیٹرکس، ٹیٹرون وغیرہ کا بھی اضافہ ہوا ہے، مذکورہ بالا کپڑوں میں سے اکثر آج بھی بنتے اور استعمال ہوتے ہیں، لیکن چند کپڑے ایسے ہیں، جن کی حیثیت اب محض تاریخی ہے، ان میں سے صرف دو کا ذکر نیچے کیا جاتا ہے،

سراجہ:۔ یہ ریشمی دھاری دار ململ تھی اور ڈھاکے میں خصوصاً نہایت عمدہ تیار ہوتی تھی۔ مالدہ میں اس کی تیاری میں تنوع پیدا کیا گیا اور وہ مختلف ناموں سے موسوم ہوئی، مثلاً مچھلی کانٹا، سبز گنار، بلبل چشم، لال قدم پھولی، سبز قدم پھولی وغیرہ، یہ کپڑے اپنی نفاست اور اعلیٰ صنعت کاری کی بنا پر ۱۸۸۰ء کے ملبورن انٹرنیشنل اگزیبیشن میں بھیجے گئے تھے۔[۱]

کالیکو:۔ کالی کٹ کا عمدہ قسم کا بنا ہوا سبز کپڑا جو کسی زمانے میں یورپ بھیجا جاتا تھا، اور وہاں کالیکو کے نام سے مشہور تھا..... مدراس کے علاقے میں اب بھی اس قسم کا عمدہ کپڑا تیار ہوتا ہے، اور راجہ مندری کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔[۲] راجہ مندری مدراس کے علاقے میں ایک جگہ کا نام ہے،

چند اور ہندوستانی کپڑوں کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا:

---

[۱] ظفر الرحمٰن دہلوی، فرہنگ اصطلاحات پیشہ وراں، جلد دوم [۲] ایضاً

تامنا، ایک قسم کا بھاگلپوری ٹسری کپڑا جس کی بناوٹ میں دیوتاؤں کی مورتیں، نام یا کسی دعا کے الفاظ کی شکلیں بنائی ہوں۔[۱]

متھا (مکنا، ہنگٹا) ایسے ریشم کا بنا ہوا کپڑا جس کا کیڑا کوئے کو پھاڑ کر نکل گیا ہو، اہملکے قائل ہندو فرقے اور بعض برہمن اس کو خاص رسوم کے موقع پر استعمال کرتے ہیں۔[۲]

مارچا، مارچ یعنی موسم بہار کے ریشم کا بنا ہوا کپڑا جو اور مہینوں کے ریشم کے کپڑے کی نسبت صاف، سفید اور نرم ہوتا ہے۔[۳]

پنڈت رتن ناتھ سرشار نے فسانۂ آزاد کی ابتدا میں ایک کردار کی تصویر یوں کھینچی ہے،

"دوسرے بزرگوار زیبا اندام، نازک خرام، گلفام، کنچل لیٹ (اصل کیچل) کا دھانی رنگا ہوا کرتہ، اس پر روپیہ گز والی مہین شربتی کا تین کمر توئی کا چست انگرکھا، گلبدن کا چوڑی دار گھٹنا پہنے .... نکے دار ماشہ بھر کی ننھی سی ٹوپی ابیین سے اٹکائے .... چھوٹے پنجے کا زرد مخملی چڑھواں جوتا زیب پا کئے ہوئے .... پھونک پھونک کر قدم رکھتے چلے آتے تھے۔"

خوجی فسانۂ آزاد کا ایک نہایت اہم کردار ہے، آزاد کی منگنی اور مانجھے کی تقریب کے موقع پر اس کی تصویر افسانہ نگار کے قلم نے یوں تیار کی ہے:

"سمدھیانے میں بھی خوجی مہتمم اعلیٰ تھے، آں حضرت نے پرانے فیشن کی زربفت کی اچکن زیب بدن کی، دستر لگا ہوا، جیب کٹی ہوئی، قیمتی بیل ٹکی ہوئی، سر پر حضو نے ایک بہت بڑا شملہ رکھا، تنگ بدن کا پاجامہ، کاندھے پر کشمیر کا سبز رنگ دوشالہ، پاؤں میں روپہلی گھیتلا جوتا، ہاتھ میں سیاہ جریب"۔

---

[۱] ظفر الرحمٰن دہلوی، فرہنگ اصطلاحات پیشہ وراں جلد دوم [۲] ایضاً، [۳] ایضاً،

لباس کے چند متعلقات کا ذکر بھی ضروری معلوم ہوتا ہے، کیونکہ یہ اتنے اہم ہیں کہ ان کے بغیر مکمل لباس کا تصور ہی نہیں ہو سکتا، ان کی حیثیت الفاظ سے زیادہ اصطلاحات کی ہے، دامن، آستین، جیب، گریبان، صراحی، گھاٹ (کنٹھا) پالا، فرشی، تعویذ، کف، کالر، تکمہ، ابرا، استر، میان تہ، آنچل، پلو، پاکھا (کواڑیاں)، بغل، چوبغلا، خواصی، بالا بر، کمر توئی، رومالی (میانی)، چوڑیاں، نیفہ، چڑیا، کلی (کلیاں) جھالر، لنگر (آڑبند، بچھیا) مرا (مری)، وغیرہ ہیں اسے اکثر سے عام آدمی بھی واقف ہیں، ان اصطلاحات میں سے بہت سی ہماری معاشرتی زندگی کا جز بن گئی ہیں، چولی دامن کا ساتھ، آستین کا سانپ وغیرہ مشہور محاورے ہیں، دامن، جیب، گریباں، دوپٹہ، آنچل وغیرہ شاعری کی بزم میں بھی باریاب ہیں اور وہاں انھوں نے اپنی مستقل جگہ بنا لی ہے، نیچے مثالاً چند شعر نقل کئے جاتے ہیں،

اب کے جنوں میں فاصلہ شاید نہ کچھ رہے
دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں
(میر تقی میر)

نہ میں دیوانہ ہوں اصغر نہ مجھ کو ذوق عریانی
کوئی کھینچے لئے جاتا ہے خود جیب و گریباں کو
(اصغر گونڈوی)

قریب یار ہے روز محشر چھپے گا کشتوں کا خون کیوں کر
جو چپ رہے گی زبان خنجر لہو پکارے گا آستیں کا
(امیر مینائی)

بے حجابی یہ کہ ہر ذرے سے جلوہ آشکار
اس پہ گھونگھٹ یہ کہ صورت آج تک نادیدہ ہے
(آسی غازی پوری)

میری حیرت کی قسم تم کو اٹھاؤ تو نقاب
میرا ذمہ ہے کہ جلوے نہ پریشاں ہوں گے
(جگر مرادآبادی)

ان متعلقات کے علاوہ کپڑا کاٹنے اور سینے کی بہت سی اصطلاحات ہیں، جیسے، قطع کرنا، چاک، ادیب، اریب سریب، بنتنا، بیونت، ٹمنا، اور ما، بخیہ (رکبی سلائی)، تیجی (کچی سلائی)، ترپادن، ترپنا، نگندا، پٹا وغیرہ،

لباس کے سلسلے میں رفو کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، اس کی ایک مستقل حیثیت ہے،

رفو کرنے والے کو رفوگر کہا جاتا ہے، اسی سے رفوگری بنا ہے، رفو کی بھی اصطلاحات ہیں، جن میں سے مندرجۂ ذیل مشہور ہیں؛

آفتاب مہتاب (ماہتاب، بجازی (داب) بلبل چشم، بچی، تار، الوٹ (تاگا کاٹ) تار چون (درو)، ٹلکی، ٹیپ، پتیل یا عف رفو۔[1]

لباس کے سلسلے میں دھلائی کا مختصر ذکر بھی ہے، یہاں بھی اردو کے دامن میں شستہ الفاظ موجود ہیں، خود دھلائی کے لئے دھوب کے علاوہ شوب کا فصیح لفظ بھی استعمال ہوتا ہے، دھوب سے دھوبی اور دھوبن بنے۔ ان کو برہٹا، برہٹن بھی کہا جاتا ہے، کپڑے کا میل چھانٹنے کے لئے بھٹی چڑھائی جاتی ہے، پھر صابن جسے دھوبیوں کی اصطلاح میں کھارا کہا جاتا ہے، اور مختلف مسالوں کے ذریعے انھیں صاف کیا جاتا ہے، دیہاتوں میں اب بھی اس مقصد کے لئے گدھے، بکری وغیرہ کی مینگنی اور رہ ملا کر مسالا تیار کیا جاتا ہے، جسے ہری کہتے ہیں، جہاں کپڑے دھوئے جاتے ہیں، اس جگہ کو گھاٹ یا دھوبی گھاٹ کہا جاتا ہے، ایک مشہور مثل ہے: دھوبی کا کتا نہ گھر کا نہ گھاٹ کا، دھونے کے عمل کو پا پھنایا او چھپ کرنا کہتے ہیں، دھلے ہوئے کپڑے کو اجلا کپڑا کہتے ہیں، اجلا اور اجلی عورتوں کی زبان میں دھوبی اور دھوبن کو کہتے ہیں، مسلمان عورتیں رات کے وقت دھوبن کا لفظ استعمال نہیں کرتیں اس کے بجائے اجلی کہتی ہیں،[2] کپڑے کو اجلا کر کے اس میں نیل کی چاشنی دی جاتی ہے، جس کی وجہ سے وہ اور صاف معلوم ہونے لگتا ہے، اب ٹینوپال کے استعمال سے سفید کپڑے کو دودھیا بنا دیا جاتا ہے، کانجی یا کلپ دکلف، دے کر کپڑے میں کرّاپن پیدا کیا جاتا ہے،

ریشمی اور گرم کپڑے دھونے کے لئے مختلف قسم کی دوائیں استعمال ہوتی ہیں، لیکن

---

[1] ظفر الرحمٰن دہلوی، فرہنگ اصطلاحات پیشہ وراں، جلد دوم۔ [2] سید احمد دہلوی، فرہنگ آصفیہ، ج ا۔

ابھی ان کے نام اردو میں جذب نہیں ہوئے ہیں، صرف پیٹرول اردو میں مکمل طور پر سرایت کر چکا ہے۔

جب دھلائی کی تمام منزلیں طے ہو جاتی ہیں تو ان پر استری کی جاتی ہے۔ استری دو طرح کی ہوتی ہے۔ ایک تیز استری کہلاتی ہے، جو گرم ہوتی ہے اور سوتی کپڑوں پر کی جاتی ہے، دوسری ٹھنڈی استری کہی جاتی ہے جو معمول سے بہت کم گرم ہوتی ہے اور یہ اونی اور ریشمی کپڑوں پر کی جاتی ہے، اونی اور ریشمی کپڑوں پر استری کرنے سے پہلے ان کو پانی کی ہلکی پھوار دے کر یا دوسرے بھیگے ہوئے کپڑے سے نم کر لیا جاتا ہے، اسے پچارہ دینا کہتے ہیں۔

سب کچھ ہو جانے کے بعد دھوبی کپڑوں کو ایک خاص سلیقے سے تہ کرتا ہے۔ اسے کپڑے بنانا کہتے ہیں۔

دھلائی کے ضمن میں واشنگ کمپنی اور لانڈری کو فراموش نہیں کیا جا سکتا، یہ دونوں الفاظ اردو میں جذب ہو چکے ہیں۔

زیور:

لباس کے بعد عورتیں جس چیز کی زیادہ دلدادہ ہیں وہ زیور ہے، زیور نہ صرف عورتوں کی زینت کا سامان ہے بلکہ وہ اسے اپنی جائداد یا ملکیت تصور کرتی ہیں۔ اب سے سو پچاس سال پہلے تک ان کا یہ تصور خصوصاً بہت زیادہ تھا، زیور خوبصورت ہوں یا بھدے، وہ انھیں پہنیں یا نہ پہنیں، زیوروں کی ایک بڑی تعداد کا ان کے پاس ہونا ضروری تھا، قدیم زمانے میں یہ زیور عموماً بھدے اور بھاری ہوتے تھے، لیکن وقت کی رفتار کے ساتھ ساتھ ان میں نفاست بھی پیدا ہوتی گئی اور تنوع بھی، سولہ سنگار کے ساتھ بارہ یا بتیس ابرن اسی تنوع کی شہادت ہے۔

بارہ ابرن (ابھرن) سے مراد بارہ جگہ پہننے کے زیور ہیں، وہ جگہیں امیر مینائی نے ایک

ہندی شاعر کے دوہے کے حوالے سے حسب ذیل بتائی ہیں:

کان، سر، ناک، پیشانی، گلا، سینہ، ڈنڈ (بازو) ہاتھ، ہاتھ کی انگلیاں، کمر، پانو، پانو کی انگلیاں، (امیر اللغات)

ان کی صحیح ترتیب یوں ہوگی:

سر، پیشانی، کان، ناک، گلا، سینہ، کمر، بازو، ہاتھ، ہاتھ کی انگلیاں، پانو، پانو کی انگلیاں،

صاحب امیر اللغات نے اسی ہندی شاعر کے حوالے سے تیس ابرن کا بھی ذکر کیا ہے، جو مندرجۂ ذیل ہیں:

سیس پھول، کھور[1]، بینا[2]، نتھ، بالی، پتر، جھومک، کرن پھول، کنٹھ سری[3]، چوا ہار، جگنو، پنج لڑی، چمپا کلی، چندر ہار، مکٹ ہار، پہنچی، پچھیلی، چھن، کنگن، نونگہ، برے، جوشن، بازو بند، آرسی، انگوٹھی، چھلے، کنکنی (کردھنی) کڑے، پازیب، جھانجھن، چھڑے، نویرہ[4]، (۶)

سولہ سنگار کا ذکر آگے آئے گا:

زیور چونکہ عورت کی بڑی پسندیدہ اور محبوب چیز ہے، اس لئے اس میں ہمیشہ تبدیلیاں بھی ہوتی رہیں اور اضافے بھی ہوتے رہے۔ بیسیوں زیور ایسے ہیں جو پہلے استعمال میں آتے تھے، لیکن اب صرف ان کے نام کتابوں کے صفحات میں محفوظ رہ گئے ہیں، بہت سے زیور ایسے بھی ہیں جن کے نام سے بھی شاید لوگ واقف نہ ہوں، قدیم و جدید رائج و متروک زیوروں کی تعداد خاصی بڑی ہے، یہاں صرف چند زیوروں کے نام دیئے جاتے ہیں:

---

[1] ماتھے کا زیور، [2] ٹیکا [3] گلے کا زیور [4] ہاتھ میں چوڑیوں کے درمیان پہننے کا زیور، [5] پیر کی انگلیوں میں پہننے کا زیور، [6] کتاب مذکور حصۂ دوم،

سیس پھول، ٹیکا، سراسری، چاند، چاندلا، بندہ، آویزہ، کرن پھول، در گوش، گوشوارہ، بالی (بالیاں) جھمکا، جھومر، بجلی، کیل، لونگ، نتھ، بلاق، گلوبند، تمنی، ہار، چندن ہار (چندن ہانس) دلڑا (دو لڑا) پچ لڑا (پچ لڑی) ست لڑا (ست لڑی)، طوق، جگنو (جگنی)، چمپا کلی، ہیکل، دھدھکی، اربسی، کردھنی، تونگا (تونگے) کمرزیب، جہاں گیری (جہانگیریاں)، پری بند، بازو بند، نورتن، جہاب، کنگن، پہنچی، چھلے (پورے) انگوٹھی، آرسی، ساقہ، پازیب، پایل، چھاگل، خلخال، لچھا، کڑا (کڑے)، توڑا (توڑے)، الوٹ وغیرہ،

چند اور زیوروں کے دلچسپ نام جن کا چلن اب نہیں رہا یا بہت کم ہو گیا ہے،

مانگ :۔ ماتھے کا زیور جس میں موتی جڑے ہوتے ہیں،

مور بھنور :۔ کان میں پہننے کا مور کی شکل کا زیور،

مچھلی :۔ مچھلی کی شکل کا کان میں پہننے کا زیور،

مگر :۔ کان میں پہننے کا مگر کی شکل کا زیور،

مولی :۔ باریک موتیوں کی لڑیوں کا گچھا، جھومر کی طرح مانگ کے کسی ایک طرف بطور زیور لٹکا دیا جاتا ہے،[1]

سبزہ :۔ کان میں پہننے کا سبز رنگ کا زیور،

ہتھ پھول :۔ زنجیروں دار پنکھڑی کی وضع کا بنا ہوا ہاتھ کی پشت کا زیور،[2]

چمپلیاں :۔ (چوہے دنتیاں)، پہنچی کی قسم کا زیور، اس کے دانے پہنچی کے دانوں کے برخلاف بجائے گول ہونے کے چنبیلی کی کلی کی شکل کے ہوتے ہیں، ان دانوں کی چوہے کے دانتوں سے مشابہت کی وجہ سے اس زیور کا نام چوہے دنتیاں مشہور ہو گیا ہے اور ملکہ نور جہاں کی

---

[1] ظفر الرحمٰن، دہلوی، فرہنگ اصطلاحات پیشہ وراں، جلد دوم [2] ایضاً،

ایجاد بتایا جاتا ہے۔[1]

دکن کے بعض زیوروں کے نام خاصے دلچسپ ہیں، جیسے، پھول بالیاں، چاند بالیاں، چکرمان، چھلی، چولا پھول، لونگ کے پھول وغیرہ۔[2]

مندرجہ ذیل زیور تہذیبی لحاظ سے خصوصاً لائق توجہ ہیں:

دولھا کو بطور نشان پہنانے کی تین نگوں کی انگوٹھی جس کے اوپر دو طرف موتی اور بیچ میں کوئی قیمتی نگ جڑا ہو۔[3]

بیر بالی:۔ دلھن کی ناک میں پہنانے کی دو موتی اور ان کے درمیان نگ ڈال کر تیار کی ہوئی بالی۔[4]

بیسر:۔ (موربی)، بیضوی شکل کی جڑاؤ نتھ جو بعض مقامات پر دلھن کو پہنانے کے لئے مخصوص ہوتی ہے۔[5]

سہرا:۔ اس میں موتی کی سات لڑیاں ہوتی ہیں، شادی کے موقع پر دلھن کے یا ولادت کے موقع پر زچہ کے سر پر باندھا جاتا۔[6]

علی بند:۔ عورتیں کلائی پر باندھتی ہیں، اور ہاتھوں کی انگلیوں میں بھی پہنتی ہیں،

کیری:۔ عطر رکھنے کا زیور جو آم کی کیری کے مشابہ ہوتا ہے،

نتھ اور ہنسلی کی بھی تمدنی اہمیت ہے، نتھ سہاگ کی نشانی ہے اور اب سے چالیس پچاس سال پہلے تک اس کا استعمال عام تھا تعلیم یافتہ خواتین نے اسے ترک کر دیا ہے، لیکن دیہاتی غیر تعلیم یافتہ عورتیں، خصوصاً ہندو عورتیں اب بھی استعمال کرتی ہیں، ہنسلی عورتوں کا زیور ہونے کے علاوہ مسلمانوں میں منت کے طور پر بچوں کو پہنائی جاتی ہے،

---

[1] ظفر الرحمٰن دہلوی، فرہنگ اصطلاحات پیشہ وراں جلد ۴ [2] سید صباح الدین عبد الرحمٰن، ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے تمدنی جلوے، ص ۱۰۳، [3] ظفر الرحمٰن دہلوی، فرہنگ مذکور، ج ۴ [4] ایضاً [5] ایضاً [6] سید صباح الدین عبد الرحمٰن کتاب مذکور، ص ۱۴۳،

اوپر زیوروں کے نام دیے گئے ہیں، اُن میں سے زیادہ تر ہندی ہیں، جنھیں اردو نے اپنایا ہے، بعض نام ہندی اور فارسی کی ترکیب سے بنے ہیں اور چند نام فارسی ہیں، لیکن یہ سارے زیور ہندوستانی ہیں۔ ملکہ نورجہاں کا جمالیاتی ذوق مشہور ہے، اہلِ ہند کی معاشرتی زندگی میں اس کی جدت طبع سے بہت سی نئی چیزوں کا اضافہ ہوا، چند زیور بھی اس کی اختراعات میں شامل ہیں، مثلاً جہانگیری، (جہانگیریاں) جوشن، گل بند، بازوبند، نونگہ وغیرہ۔[1]

یورپ میں زیور کا رواج کم رہا ہے، اس لئے یورپی اقوام کے ذریعے ہندوستان میں زیور بہت کم آئے، ایرنگ (EARING) ٹاپ، لاکٹ وغیرہ گنتی کے چند زیوروں کے نام ملتے ہیں جو اب اردو الفاظ بن چکے ہیں۔

زیوروں کے بعض متعلقات کے نام بھی خاصے دلچسپ ہیں، مندرجہ ذیل متعلقات سے لوگ عموماً واقف ہیں۔

ہنسلی، مرکی، کانٹا، سہارا، گونج وغیرہ۔

شعرا خصوصاً مثنوی نگاروں نے اپنے اشعار کو زیوروں سے زینت دی ہے، مثلاً میر حسن نے بدرمنیر کو ان زیوروں سے آراستہ کیا ہے۔

وہ ترکیب اور چاند سا وہ بدن	وہ بازو پہ ڈھلکے ہوئے نورتن
جڑاؤ وہ بالے کہ بالے کا رشک	وہ موتی کے بالے کہ عاشق کا اشک
وہ آنکھوں کی مستی وہ مژگاں کی نوک	کرن پھول کی اور بالے کی جھوک
وہ موتی کا دلڑا وہ موتی کا ہار	سدا اشک غم دیدہ جس پر نثار
گلے دھگدھگی، پچ لڑا، ست لڑا	سراسر گلے حسن اس کے پڑا

[1] سید صباح الدین عبدالرحمٰن، ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی جلوے، ص ۹۰ - ۹۱۔

جڑاؤ دمکتی وہ چمپا کلی | رہے جس سے الماس کو بے کلی
جہانگیریوں کا کروں کیا بیاں | کہ اٹھا تھا ہاتھوں سے اس کے فغاں

ایک دوسرے موقع پر بدرِ منیر زیوروں سے یوں سجی ہوئی تھی،

وہ ماتھے پہ ٹیکے کی اس کے جھلک | سحر چاند تاروں کی جیسے چمک
وہ بالے کی تابندگی زیرِ گوش | جسے دیکھ اڑ جائیں بجلی کے ہوش
وہ ہیرے کا تکمہ بہ صد آب و تاب | وہ صبحِ گلو، مطلعِ آفتاب
وہ تکمے پہ چمپا کلی کی پھبن | کہ سورج کے آگے ہو جیسے کرن
وہ الماس کی ہیکل ایک خوشنما | تصور رہے جس کا دل سے لگا
وہ بجگ بند بازو کے اور نورتن | کہ جوں گل سے ہو شاخ زیبِ چمن
وہ پہنچی ہمرد کی اور دست بند | شراکت میں تھے شاخِ گل سے دوچند
وہ لعلوں کی پازیب آویزہ دار | صد اشکِ خونیں ہو جس پر نثار
وہ پنے کے پاؤں میں چھلے تھے کل | کہ آنکھوں سے دل ان پہ کھاتے تھے گل

غزلوں میں بھی شعرا نے کبھی کبھی اشعار کو زیوروں سے مزین کیا ہے، مثلاً:

صبح کا تارا مجل ہو دیکھ بندے کی لٹک | دیکھ سورج یہ جڑاؤ مرکیاں تھرائے ہے
(جرأت)
دیکھتا کیا ہے عقدِ پروین کو | اپنے آویزہ گہر کو دیکھ
(مصحفی)
اس جبیں پر جلوہ گر الماس کا ٹیکا نہیں | آسماں پر دن چڑھے دیکھو قمر پیدا ہوا
(بہادر شاہ ظفر)
ہزار گل کی بہاریں نہ ہو سکیں ہمسر | تمھارے ایک کرن پھول کی بہار کے ساتھ
(نظیر)
زلفیں وہ مشکناب سی، چہرہ وہ چاند سا | جگنو رہا گلے میں ستارہ سا جگمگا
(نظیر)
یہ کس کے کان کے بالے کی جھلک دیکھی ہے | مثالِ ماہیِ بے آب بیقرار ہوں میں
(ناسخ)

ممکن نہیں اس پر نظر بد کا اثر ہو — زیور میں علی بند بھی ہے نادِ علی بھی
(انشا)

بالے ہیں ترے حسن کے دربار میں بھنور دو — اس پر سے غضب یہ ہے کہ ہیں ان میں مگر دو
(ظفر)

بہت سی کہاوتیں بھی زیور کے تعلق سے مشہور ہیں، جیسے:

"ہاتھ کنگن کو آرسی کیا"

"ماموں کے کانوں میں انٹیاں بھانجے اینٹھے پھریں"

میاں ناک کاٹنے کو پھریں، بیوی کہیں مجھے نتھ گھڑا دو۔

"سونے سے زیادہ گھڑائی مہنگی"

"بھٹ پڑے وہ سونا جس سے ٹوٹیں کان"

مردوں کے زیور:

ہندوستان میں راجے مہاراجے نہایت قیمتی زیور پہنا کرتے تھے، ان کے بڑے بڑے درباری اور اعلیٰ عہدے دار بھی ان کی تقلید میں قیمتی زیور استعمال کرتے تھے۔ مغل بادشاہوں نے بھی راجاؤں کی اس روایت کو برقرار رکھا۔ یہ زیور ہار، لڑی، بالی، کنگن، آویزہ، انگوٹھی وغیرہ کی شکل میں ہوتے تھے۔ ان زیوروں کے علاوہ مغل بادشاہ اپنی پگڑیوں میں طرہ، کلغی، سرپیچ وغیرہ استعمال کرتے تھے، جن میں بیش قیمت موتی، ہیرے اور جواہرات وغیرہ ٹکے ہوتے تھے۔ مغل بادشاہوں کے دربار سے ہلال کی شکل کا سادہ یا جڑاؤ زیور بطور نشان راجپوت سرداروں کو پگڑی پر لگانے کے لیے عطا ہوتا تھا، اس زیور کا نام فتح چاند تھا[1]، عوام اپنے راجا یا بادشاہ کی تقلید کو اپنے لئے باعثِ فخر اور موجبِ مسرت خیال کرتے ہیں، اس لئے وہ بھی اپنی حیثیت کے مطابق سونے یا چاندی کے بنے ہوئے زیور پہننے لگے۔ اردو زبان اور شعر و ادب میں ان مردانہ زیوروں کا بھی ذکر ملتا ہے،

---

[1] ظفر الرحمن دہلوی، فرہنگ اصطلاحات پیشہ وراں، جلد چہارم

مثلاً مثنوی سحر البیان میں شہزادہ بے نظیر کو یوں حسین تر بنایا گیا ہے:

غرض شاہزادے کو نہلا دھلا	دیا خلعت خسروانہ پنھا
جواہر سراسر پہنایا اسے	جواہر کا دریا بنایا اسے
لڑی، کنگن اور کلغی اور تن	عدد ایک سے ایک زیب بدن
مرصع کا سرپیچ جوں آفتاب	مصفا بہ شکل گل آفتاب
وہ موتی کے بالے بہ صد زیب و زین	کہیں جن کو آرام جان و دل کا چین

جس طرح عورتوں کے بہت سے زیوروں میں ہماری قدیم تہذیب کے عکس دیکھے جا سکتے ہیں، اسی طرح مردوں کے بھی چند زیور تہذیبی لحاظ سے اہمیت رکھتے ہیں، مثلاً مندرجہ ذیل زیورات:

نادعلی:۔ نادعلی حقیقت میں ایک دعا کا نام ہے۔ اسے زہر مہرے یا چاندی کی تختی پر کندہ کرا کر دفع شر کے لئے یا نظر بد سے محفوظ رہنے کی خاطر بچوں کے گلے میں پہناتے ہیں[1]،

حول دلی:۔ نظر بد سے محفوظ رہنے کے لئے کوئی دعائیہ عبارت قیمتی پتھر پر یا دھات کی ہشت پہل تختی پر کھدی ہوئی گلے میں زیور کے طور پر پہنی جاتی ہے[2]،

انٹی/انٹیاں:۔ کان کی لو میں پہننے کا سادہ یا جڑاؤ بالی نما بنا ہوا سونے کا حلقہ اکثر ہندو مہاجن اور مارواڑی خوشحالی کی علامت کے طور پر پہنتے ہیں[3]۔

قول کا چھلا:۔ ایک قسم کا چھلا جس کی ساخت اس طرز پر ہوتی ہے کہ آخیر پر پنجے سے پنجا اس طرح ملا ہوا بنایا جاتا ہے کہ گویا کوئی ہاتھ میں ہاتھ دے کر قول کر رہا ہے، یہی چھلا اکثر یار احباب ایک دوسرے کو دیتے ہیں[4]۔

---

[1] نورالحسن نیر، نورالغات، ج ۴ [2] ظفر الرحمٰن دہلوی، فرہنگ مذکور، ج ۴ [3] ایضاً [4] نورالحسن نیر، نورالغات، ج ۱،

جواہرات، موتی وغیرہ:

زیور کے ضمن میں ہیرے، جواہرات، موتی اور نگینے وغیرہ کا ذکر بھی ضروری ہے، ان قیمتی اشیا کا استعمال قدیم زمانے میں راجے، مہاراجے، بادشاہ، امرا و رؤسا وغیرہ کیا کرتے تھے، اور اب بھی امیر اور ثروت مند ہی انھیں استعمال کرتے ہیں، عوام اور اوسط درجے کے لوگ معمولی یا نقلی ہیرے اور موتی وغیرہ استعمال کرتے ہیں، ان چیزوں کا استعمال بہر حال ہمیشہ رہا ہے، اور آج بھی ہے، اس لئے اردو کا خزانہ ان سے خالی نہیں ہے،

جواہر کی چار قسمیں ان کی قدر قیمت کے لحاظ سے حسب ذیل ہیں:

لعل (لال)، الماس (ہیرا) یاقوت، زمرد،

ان جواہر میں سے ہر ایک کی متعدد قسمیں ہیں، مثلاً قمری لال، لعجمی لال، زیتی الماس، سیمابی الماس، اصمری یاقوت، ارغوانی یاقوت، نیلم، کوکب (گوہر شب چراغ)، پکھراج، ریحانی زمرد، زنگاری زمرد وغیرہ،

الماس کی مندرجہ ذیل قسموں کے نام خالص ہندوستانی ہیں اور خاصے دلچسپ بھی ہیں،

برہمن برن ہیرا۔ سفید رنگ بے عیب ہیرا، بعض خاص زیوروں کے لئے بہت پسند کیا جاتا ہے[1]،

بیش برن ہیرا۔ زردی مائل رنگ کا ہیرا، اس کی خاصیت میں یرقان کی بیماری پیدا کرنا بیان کیا جاتا ہے[2]،

کھتری برن ہیرا۔ نیلگوں آبی رنگ کا ہیرا، اچھی قسم میں شمار ہوتا ہے[3]،

الماس کا زیور چاندنی راتوں میں پہننا پسند کیا جاتا ہے، چونکہ یہ جوہر ہر موسم میں پہنا جاتا ہے، اس لئے اس کو سدا رُت جوہر کہتے ہیں[4]،

یاقوت کا بنا ہوا زیور جاڑے کے موسم میں پہننا پسند کیا جاتا ہے، اس لئے اس کو سرما رُت کا

---

[1] ظفر الرحمٰن دہلوی، فرہنگ اصطلاحات پیشہ وراں ج ۴، [2] ایضاً، [3] ایضاً، [4] ایضاً۔

جو ہر کہتے ہیں[1]، لیکن پکھراج یاقوت ہی کی ایک قسم ہونے کے باوجود بسنت میں پہننا پسند کیا جاتا ہے، اور اسی وجہ سے بسنت رُت جوہر کہلاتا ہے[2]۔

مذکورہ بالا جواہرات کے علاوہ بہت سے قیمتی پتھر ہیں، جو زیور بنانے کے کام آتے ہیں، مثلاً فیروزہ، کہربا، لاجورد، بلور، عقیق، بادزہر، زہر مہرہ، درنجف، دانۂ فرنگ وغیرہ،

جواہر اور قیمتی پتھروں سے ترشے ہوئے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کو نگ یا نگینہ کہا جاتا ہے، نگ حقیقت میں فارسی لفظ نگیں کا مخفف ہے، نگینے مختلف شکلوں یا پہلوؤں کے تراشے جاتے ہیں، مثلاً

پان گھاٹ نگینہ ۔۔ پان کی شکل کا لمبوترے پہل کا تیار کیا ہوا نگینہ،

دو لوکا ۔۔ گیہوں یا جو کی وضع کا بنا ہوا نگینہ،

کنول ۔۔ مخروطی وضع کا پہل دار بنایا ہوا نگینہ،

ثما ۔۔ بیضوی شکل کا لمبوترا بنایا ہوا نگینہ،

بعض نگینے قدرتی ساخت کے بھی ہوتے ہیں، جیسے کتابی نگینہ، ایک ڈال نگینہ، دو چشمہ وغیرہ، گسوانام کا ایک نگینہ ہے، جو ہندوؤں میں وشنو دیوتا سے منسوب کیا جاتا ہے[3]۔

زیور کے سلسلے میں موتی کی اہمیت بھی مسلم ہے، اس کے لئے اردو میں مروارید اور لولو کے الفاظ بھی مستعمل ہیں، اس کی متعدد قسمیں ہیں، مثلاً شمی مروارید، عمانی مروارید، شیرخام مروارید، درغلطاں، دریتیم، نجم موتی کے زیور ہر طبقے میں استعمال ہوتے ہیں، بعض گہنے موتی ہی کے ہوتے ہیں، جیسے دریچہ (دریچے) موہن مالا، اکاولی، آرسی ہار وغیرہ، بعض گہنوں میں سچے موتی خاص طور پر اور بڑی تعداد میں لگائے جاتے ہیں، انھیں بھی موتیوں کا زیور کہا جاتا ہے، موتی کا زیور گرمی کے موسم میں پہننا پسند

---

[1] ظفر الرحمٰن دہلوی، فرہنگ اصطلاحات پیشہ وراں، ج ۲، [2] ایضاً [3] نگینے سے متعلق اصطلاحات فرہنگ اصطلاحات پیشہ وراں، جلد چہارم، پیشہ نگینہ گری، سے لی گئی ہیں۔

کیا جاتا ہے اس لئے اس کو گر مارٹ جوہر کہتے ہیں ؎[1]

موتی کے ساتھ مونگا بھی قابل ذکر ہے، اسے اردو میں مرجان بھی کہتے ہیں، جو عربی زبان کا لفظ ہے، شعر و ادب میں زیادہ تر یہی لفظ استعمال ہوتا ہے، موتی کی طرح یہ بھی سمندر سے نکالا جاتا ہے، یہ سرخ، سفید، زرد اور سادہ رنگ کا ہوتا ہے، اس کے ہار بنائے جاتے ہیں، میر حسن کا ایک شعر ہے،

وہ موتی کے مالے وہ مونگے کے ہار　　　　گل و نسترن کی چمن میں بہار

کوڑی اور گھونگے کے بھی زیور تیار ہوتے ہیں، جو غریب طبقے کی عورتیں پہنتی ہیں،

سنار:

زیور کے اتنے تفصیلی ذکر کے بعد زیور بنانے والے کے بارے میں بھی چند کلمے کہنا ضروری ہے، کیونکہ زینت گر تو در اصل وہی ہے، اگرچہ درزی کی طرح وہ بھی اپنی وعدہ خلافی کے لئے بدنام ہے، چنانچہ مثل مشہور ہے، سنار کی کھٹائی اور درزی کے بند،

سنار کے لغوی معنی ہیں نارد عورت، کو سندر بنانے اور مزین کرنے والا[2]، اسے زرگر بھی کہا جاتا ہے، سنار یا زرگر عمومی حیثیت سے بولا جاتا ہے، ورنہ سادے زیور بنانے والے کو گھڑیا اور نفیس اور نازک قسم کے زیور بنانے والے کو سادہ کار کہتے ہیں، زیور میں نگینے یا جواہرات جڑنے والا جڑیا یا مرصع کار کہلاتا ہے، اور اس عمل کو جڑائی یا مرصع کاری کہتے ہیں، زیور کے نگینے کو کندن سے جوڑا جاتا ہے، اس کو کندن کاری یا پکی جڑائی کہتے ہیں، زیور پر کانچ کے بنے ہوئے مسالے سے خوبصورت پھول اور پتیاں بنائی جاتی ہیں، اس کام کو مینا کاری کہتے ہیں، اور اس کا کاریگر مینا کار کہلاتا ہے، زیور پر نقش بنا کر ان کی سطح کو ابھارا جاتا ہے، اسے منبت کاری کہتے ہیں، اور اس کے کاریگر کو منبت کار کہا جاتا ہے، اوپر لکھا جا چکا ہے کہ غریب طبقے کی عورتیں کوڑیوں

---

[1] ظفر الرحمن دہلوی، فرہنگ اصطلاحات پیشہ وراں، ۱، ص ۸۹ [2] سید احمد دہلوی، فرہنگ آصفیہ، ج ۳، ص ۱۳۳

اور گھونگھوں کے بھی زیور پہنتی ہیں، ان کے بنانے والے کو سنکھاری (سنکھ ہاری) کہا جاتا ہے سناروں کے محلے کو یا جہاں سناروں کی بہت سی دوکانیں ہوں، سنار ہٹا کہا جاتا ہے اور سنارپٹی بھی۔

چوڑیاں :

چوڑی کا شمار بھی زیوروں ہی میں ہو سکتا ہے، کیونکہ یہ بھی زینت کی چیز ہے، زینت کے علاوہ ہندوستانی عورتیں اسے سہاگ کی علامت سمجھتی ہیں، یہ عموماً کانچ، بلور اور لاکھ کی بنتی ہیں، امیر اور خوشحال عورتیں سونے کی چوڑیاں بھی پہنتی ہیں۔ ان کے علاوہ چاندی، ہاتھی دانت، سینگ اور بعض جوہردار پتھروں کی بھی چوڑیاں پہنتی ہیں، چوڑیاں بنانے والے اور بیچنے والے کو چوڑی کار یا چوڑیہار (مرد)، چوڑیہارن (عورت) کہتے ہیں، اسے میںہار اور میںہارن بھی کہا جاتا ہے، لاکھ کی بنی ہوئی چوڑیوں کو لکھرا اور ان کے بنانے والے کو لکھیرا کہتے ہیں،

چوڑیاں ہندوستانی تہذیب میں اس قدر اہمیت حاصل کر چکی ہیں کہ ان کی بنیاد پر محاورے بن گئے ہیں مثلاً چوڑیاں بڑھانا، چوڑیاں ٹھنڈی کرنا (اتارنا، توڑنا)، چوڑیاں ٹھنڈی ہونا، چوڑیاں پہنانا (بیوہ کے ساتھ شادی کرنا)، چوڑیاں پہننا (بزدلی دکھانا) وغیرہ،

بناؤ سنگار :

بناؤ سنگار عورت کی فطرت میں داخل ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اس کے بغیر زیور صحیح معنوں میں زینت کا سامان بھی نہیں بن سکتا، اسی لئے بارہ ابھرن (بتیس ابھرن) سولہ سنگار مثل مشہور ہے، بارہ ابھرن اور بتیس ابھرن کا ذکر اوپر آچکا ہے، سولہ سنگار کی تفصیل حسب ذیل ہے،

(۱) غسل کرنا (۲) تیل ملنا (۳) سر گوندھنا (۴) سر کو زیور سے آراستہ کرنا (۵) چندن بھرنا (۶) لباس پہننا (۷) قشقہ کھینچنا (۸) کاجل لگانا (۹) گوشوارہ لٹکانا (۱۰) ناک کا زیور یا موتی سے

---

[1] ظہیر الرحمٰن دہلوی، فرہنگ اصطلاحات پیشہ وراں،

آراستہ کرنا (۱۱) گلے ... زیور پہننا (۱۲) پھولوں یا موتیوں کا ہار گلے میں ڈالنا (۱۳) مہندی لگانا (۱۴) کمربند کا جس میں گھنگھرو ہوتے ہیں، کمر میں لپیٹنا (۱۵) پاؤں ... زیور سے آراستہ کرنا (۱۶) پان کھانا۔[1]

سولہ سنگار کے علاوہ عورتوں کی سات آرائشیں بھی ہیں جنھیں ساہر عفت کہا جاتا ہے[2]، ان کو سولہ سنگار کا اختصار سمجھنا چاہیے، وہ آرائشیں حسب ذیل ہیں:

سرمہ لگانا، مہندی لگانا، پان ... مسی لگانا، سر گوندھنا، زیور پہننا، افشاں چننا یا چوڑیاں پہننا۔[3]

اوپر سنگار کی جو تفصیلات دی گئی ہیں ان میں سے اب بہت سی باقی نہیں رہیں، لیکن ان سے ہندوستانی عورت کے مذاقِ خود آرائی اور ساتھ ہی اردو زبان کی وسعت کا اندازہ ہوتا ہے۔

ابوالفضل نے عورتوں کے سولہ سنگار کے ساتھ مردوں کے بارہ سنگار کا بھی ذکر کیا ہے، جو حسبِ ذیل ہیں۔

داڑھی کو پیراستہ کرنا، غسل کرنا، قشقہ کھینچنا، خوشبو اور تیل ملنا، کان میں سونے کی بالیاں پہننا، لباس پہننا، مکٹ باندھنا، تلوار ہاتھ میں رکھنا، جمدھر اور اس کی قسم کا اسلحہ کمر میں باندھنا، انگوٹھی پہننا، پان کھانا، موزہ یا جوتا پہننا۔[4]

عورتوں کی زبان میں پانچوں کپڑے بھی مردوں کی زینت میں شامل ہیں، یہ کپڑے پگڑی، انگرکھا، پاجامہ، دوپٹا اور رومال پر مشتمل ہیں۔

امتدادِ زمانہ کے ساتھ نہ عورتوں کے سولہ سنگار رہے اور نہ مردوں کے بارہ سنگار، دو سنگار

---

[1] نورالحسن نیر، نورُ اللغات، ج ۱، ص ۱۱، ۹۴ [2] ایضاً ، ج ۲، ص ۴ [3] سید احمد دہلوی، لغات النساء ... ص ۴۲ [4] آئینِ اکبری ... ج ۳ ...

بہر حال زبان میں اپنی مستقل جگہ بنا چکا ہے، لیکن بارہ سنگار نے شاید اردو میں جگہ پائی ہی نہیں،

غسل کرنے کا چلن ہر ملک اور ہر قوم میں تھا اور آج بھی ہے، ہندوستان میں قدیم زمانے میں کھلی فضا میں نہانے کا رواج تھا، مسلمان اپنے ساتھ غسل خانہ لائے جس کو اہل ہند نے پسند کیا، اور وہ یہاں کی معاشرتی زندگی کی ایک اہم چیز بن گیا، شاہی حمام اور امراء اور رؤسا کے حمام کے علاوہ عوام کے بھی حمام بن گئے، اور آج بھی بڑے بڑے شہروں میں حمام پائے جاتے ہیں، جن میں مقررہ پیسے دیکر جو چاہے غسل کر سکتا ہے، لیکن یہ غسل خانے یا حمام صرف مردوں کے لئے ہیں، عورتیں گھر ہی کے غسل خانے میں نہاتی ہیں، انگریزی معاشرت کے اثر سے غسل خانہ اور زیادہ ضروری ہو گیا اور غسل خانے اور حمام کے ساتھ ساتھ باتھ روم بھی ہماری معاشرت میں داخل ہو گیا، پہلے غسل خانہ میں گھڑا، بیسن (بیسن دانی)، کھلی وغیرہ رکھی جاتی تھیں، پھر ان کی جگہ ٹب، ٹب، (صابن دانی) وغیرہ نے لے لی، انگریزی باتھ روم اپنے ساتھ شاور باتھ بھی لایا،

قدیم زمانے میں عورتیں عموماً کالی چکنی مٹی سے بالوں کو دھویا کرتی تھیں، اس کا رواج اب بھی دیہات کی عورتوں میں پایا جاتا ہے، وہ اسے صابن پر ترجیح دیتی ہیں، لیکن اب عموماً خوشبودار صابن استعمال ہوتا ہے، موجودہ صابن یورپ اور امریکہ کی دین ہیں، اب ان ہی ناموں سے ہندوستان میں بھی صابن بننے لگے ہیں، مگر ان کے نام زیادہ تر انگریزی ہیں، ان انگریزی ناموں کو اردو نے بجنسہٖ اپنا لیا ہے، مثلاً پیرس سوپ، لکس، کیتھیکورا، پام آلیو، سن لائٹ، لائف بوائے، رکسونا، سنتھال وغیرہ، ہندوستانی ناموں سے بھی چند صابن بنتے ہیں، جیسے حمام، موتی، صندل سوپ وغیرہ،

سر میں تیل لگانے کا دستور ہمیشہ سے رہا ہے، یہ تیل عموماً خوشبودار ہوتے ہیں، جو مختلف

پھولوں میں بسائے جاتے ہیں، ان کا ذکر پھولوں کے سلسلے میں آچکا ہے۔ چنبیلی، گلاب (گل روغن) بیلا اور موگرے کے تیل زیادہ پسند کئے جاتے ہیں۔

سر گوندھنا یا کنگھی چوٹی کرنا سنگار کے سلسلے میں کسی زمانے میں بڑی اہمیت رکھتا تھا۔ یہ ایک مستقل فن بن گیا تھا جسے مشاطگی کہتے تھے، جو عورت اس فن کی ماہر ہوتی تھی اسے مشاطہ کہا جاتا تھا، اسی مشاطگی نے اردو کو زلفِ تابدار، زلفِ پُرپیچ، زلفِ پُرخم، زلف چلیپا، زلفِ پُرشکن، زلف شکن در شکن، زلف پیچاں، زلف دوتا، زلف رسا، زلف عنبریں، زلف عنبر باز، زلف مشکیں، زلف مشکبار، زلف مشک فام، زلف گرہ گیر، زلف مسلسل وغیرہ عطا کیا۔ سر کے بال جو چوٹی کے گوندھنے میں مانگ کے دونوں طرف ماتھے پر ہلال کی شکل میں رکھے جائیں اسے چاند پری کہتے ہیں، اس کو محمد شاہی پٹیوں کا سر گوندھنا بھی کہا جاتا ہے۔[1] جو اس عہد میں نوجوان عورتوں میں چوٹی گوندھنے کا ایک عام چلن تھا۔ جوڑا بھی بال بنانے کی ایک شکل ہے جو عام ہے۔ جوڑے کو موباف سے زینت دی جاتی ہے، "آخری دور میں موباف میں جوڑا اچکا بھی لپیٹ دیا جاتا، اس سے پوری چوٹی چاندی کی معلوم ہوتی"[2] کسی زمانے میں بال لیپا کا بھی چلن تھا۔ یہ جوڑا باندھنے کی موتیوں کی لڑی تھی۔[3] میر حسن نے موباف کی تعریف یوں کی ہے:

وہ کنگھی وہ چوٹی وہ کنگھی صاف صاف	کناری کے پیچھے چمکتا تھا صاف
مباف زری نے کیا ہے غضب	دیا ہے گرہ دن کو دنبال شب
سنگاروں میں گو سب ہے وہ آتار ا	یہ کہتے ہیں چوٹی کا اس کو سنگار
نہ ہو کیونکہ چوٹی کا رتبہ بڑا	کہ اک نور ہے اس کے پیچھے پڑا

---

[1] ظفر الرحمن دہلوی، فرہنگ اصطلاحات پیشہ وراں، جلد چہارم [2] سید صباح الدین عبد الرحمن: ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے تمدنی جلوے، ص ۲۴۳ [3] ظفر الرحمن دہلوی، فرہنگ مذکور، ج ۴، ۴۲۔

ہندوستان کی عورتیں مانگ پر سندور چھڑکنا سنگار کے ساتھ ساتھ سہاگ کی علامت سمجھتی ہیں، مسلمان عورتوں نے بھی اس کو قبول کیا لیکن انھوں نے افشاں کو بھی رواج دیا، چند چمکدار چیزوں، جیسے مقیش یا گوٹے کی کترن یا سونے چاندی کے ورق، ابرک وغیرہ کو خوب باریک کرکے پیشانی پر نقش و نگار بناتے ہیں، اور بالوں پر چھڑکتے بھی ہیں، اس چیز کو افشاں کہتے ہیں اور اسے لگانے کو افشاں چننا کہا جاتا ہے، دولھن کی پیشانی پر خصوصاً افشاں چنی جاتی ہے، مانگ میں موتی بھرنا یا موتی کی لڑی لگانا بھی سنگار میں داخل ہے، جو بڑی زینت کا باعث ہے، میر حسن نے اس کی تابندگی یوں دکھائی ہے،

بھری مانگ موتی سے جلوہ کناں نمایاں شب تیرہ میں کہکشاں

نسیم نے اس کی چمک دمک یوں ثابت کی ہے،

جب اس کی موتیوں سے مانگ بھردی فلک نے کہکشاں قربان کردی

پان اور مسّی بھی سنگار کے اہم اجزا ہیں، پان کی سرخی اور لکھوٹے اور مسی کی سیاہی سے دانتوں کی سفیدی اور چمک نمایاں تر ہو جاتی ہیں، اسی مقصد کی خاطر لکھنؤ میں ایسی الائچیاں ایجاد کی گئیں کہ ایک الائچی کھا لینے سے منہ سرخ ہو جاتا، اسی طرح ایک اور قسم کی الائچیاں ایجاد ہوئیں کہ ایک الائچی پان میں ڈال کر کھالی جاتی تو مسی خود بخود لگ جاتی، لیکن یہ الائچیاں اصل کو نہ پہنچ سکیں، اس لئے عام پسند اور مقبول نہ ہو سکیں،[1] پان کی سرخی یا رنگ کو جو جم جاتا ہے، پان کی تحریر کہتے ہیں، ہونٹوں کو خوشنما بنانے کے لئے کتھے، چونے اور مسی کا مرکب بھی استعمال ہوتا ہے، جسے لاکھا کہا جاتا ہے، اسی طرح کاجل اور سرمہ بھی سنگار کی چیزوں میں داخل ہیں، ان سے آنکھوں کی سیاہی اور خوبصورتی بڑھ جاتی ہے، سرمگیں آنکھوں کی شعرا نے

---

[1] مولانا عبد الحلیم شرر لکھنوی، گذشتہ لکھنؤ ص ۱۸۱،

بھی تعریف کی ہے، ان آنکھوں کو بھی سرمگیں آنکھ کہتے ہیں جن کے پپوٹے کی کوریں قدرتی طور پر سیاہ ہوں، آنکھوں کے پپوٹے کی کوروں پر سلائی سے جو لکیریں بنائی جاتی ہیں، انھیں سرمئی تحریر کہا جاتا ہے، پان، مسی اور کاجل ہندوستان کی چیزیں ہیں اور سرمہ مسلمان اپنے ساتھ لائے، میر حسن نے ان چیزوں کا حسن اس انداز سے دکھایا ہے:

وہ مسی اور اس کے لب لعل فام ۔۔۔ سواد دیار بدخشاں کی شام

وہ آنکھوں کا عالم وہ کاجل غضب ۔۔۔ کہے تو پڑی نرگستاں میں شب

ستم تس پہ سرمے کی تحریر سی ۔۔۔ کھنچی ہاتھ کافر کے شمشیر سی

لکھو تادہ پانوں کا مسی کے ساتھ ۔۔۔ کہ جوں دامن شب شفق کے ہو ہاتھ

غازہ بھی سنگار کا ایک اہم جزو رہ چکا ہے، لیکن اب یہ ایک عام استعمال کی چیز بن گیا ہے، اسے گلگونہ اور ابیر بھی کہتے ہیں، سودا کا ایک اچھا شعر ہے،

اے خوں شدہ دل تو تو کسی کام نہ آیا ۔۔۔ گلگونۂ عارض ہے نہ ہے رنگ حنا تو

پھول سے آدمی کسی حال میں بے نیاز نہیں رہ سکتا، خوشی کے موقع پر خصوصاً اس کا استعمال زیادہ ہوتا ہے، سنگار بھی خوشی کی نشانی ہے، اس لئے اس موقع پر پھولوں کا ہار (پھول مالا) بدھی (بدی)، ہار سنگار، کنٹھا، گجرا، وغیرہ استعمال ہوتے ہیں، جوڑے میں پھول یا پھولوں کا گچھا لگانا نوجوان عورتوں کی پسندیدہ چیز ہے،

عطر بھی سنگار کے لوازم میں داخل ہے، اس کا کچھ ذکر پھولوں کے سلسلے میں کیا جا چکا ہے، عطر گلاب، عطر حنا، عطر سہاگ، عطر دونا، عطر خس، عطر بید مشک، عطر مجموعہ وغیرہ عموماً سنگار میں استعمال ہوتے ہیں،

بناؤ سنگار اس وقت تک مکمل نہیں ہوسکتا جب تک ایک اچھا سا آئینہ نہ ہو، قدیم

ہندوستان میں بھی آئینہ تھا، جو مختلف دھاتوں جیسے چاندی، سونا، فولاد وغیرہ سے بنایا جاتا تھا مسلمانوں کے ساتھ شیشے کا آئینہ آیا جو فولادی آئینے کے مقابلے میں کہیں بہتر تھا حلبی آئینہ خاص طور پر مشہور تھا، اردو نے آرسی اور درپن کو بھی قبول کر لیا ہے، عربی کا مرأۃ شعر و سخن کی زبان میں مستعمل ہے، انگریزوں کے ساتھ ڈریسنگ ٹیبل (سنگار میز) آیا جو اب اردو میں نام ہو چکا ہے،

سنگار کے یہ لوازم رکھنے کے لئے جو پٹاری یا صندوقچہ استعمال ہوتا ہے اسے سنگار دان، حسن دان، مقابہ، سہاگ پٹارا وغیرہ نام دیئے گئے ہیں، بعض لوازم کے لئے الگ الگ نام بھی ہیں، جیسے عطر رکھنے کے برتن کو عطر دان، کاجل رکھنے کے برتن کو کجلوٹا یا کجلوٹی، سرمہ رکھنے کی شیشی کو سرمہ دانی، کنگھی رکھنے کے غلاف کو شانہ پیچ کہا جاتا ہے،

بناؤ سنگار حقیقت میں عورت کو قدرت کا ایک نفیس اور دلربایانہ عطیہ ہے، اسی سے وہ اپنی سہیلیوں میں مقبول و ممتاز ہوتی ہے، اسی کے ذریعہ وہ شوہر کو اپنی طرف زیادہ متوجہ کرتی ہے، اسی کے زور سے وہ روٹھے ہوئے شوہر کو مناتی ہے، اسی لئے سنگار کرتے وقت عورت صرف اپنی پسند کی چیزوں کا استعمال نہیں کرتی، بلکہ شوہر کی پسند کا بھی خیال رکھتی ہے. سنگار کے اہتمام کی ایک اچھی مثال شوق قدوائی کی مثنوی عالم خیال میں ملتی ہے، برہ کی ماری عورت کو شوہر کے خط کے ذریعے اطلاع مل چکی ہے کہ وہ فلاں دن گھر پہنچ رہا ہے، اس دن عورت عالم خیال میں اپنے دل سے بہت سی باتیں کرتی ہے اور آخر میں کہتی ہے کہ

اب تو یہ فکر ہے کہ آج کچھ تو سنگار رچا ہے
ٹوٹ گیا ہے کل بلاق سونے کا تار چاہیے
ہاتھوں میں چوڑیاں ہیں کم ٹوٹ کے کر گئیں کمی
آئیں گے اب بڑے میاں ان سے منگاؤں گی نئی

مجھ کو بھی سادگی پسند ان کو بھی سادگی پسند

پہنوں سفید ہی لباس ہو گا انھیں یہی پسند

بیلیں ہوں یا بوٹیاں پھیکی ہیں کامدانیاں

چند دوپٹے پھاڑ لوں رکھی ہیں جامدانیاں

بیل کناری ابھی چوک سے میں منگا نہ لوں

لائی ہے اچھن ایک بیل اس کو بھی لوں میں یا نہ لوں

ہار میں گوندھ لوں اگر پھول ہوں خانہ باغ میں

اب کے برس تو موگرا گھر میں کھلا نہ باغ میں

اے لو منصور، آگئے بنتی سنورتی ہی رہی

جی نہ پڑا سنگار کچھ حوصلہ کرتی ہی رہی

مکان

مکان آدمی کی بنیادی ضرورتوں میں ہونے کے علاوہ راحت، آسایش اور اظہار شان و شوکت کا بھی ایک ذریعہ ہے، اس کی تعمیر میں تدریجی ترقی ہوئی ہے، پہلے گھاس پھوس کی ٹٹیاں یا جھونپڑیاں بسر اوقات کے لئے بنائی گئیں، پھر مٹی کے گھروندے بنے، عقل کی جلانے اولاد آدم کو اینٹ بنانا سکھایا اور چونے اور گارے کی مدد سے پختہ مکانات کی تعمیر ہونے لگی، عقل نے اور پرواز کی تو پتھر کے ٹھوس، شاندار اور نفیس مکانات، حویلیاں اور محلات آبادی کی رونق کا باعث ہوئے، پہلے پختہ مکانات سیدھے سادے ہوتے تھے، پھر ان میں نقش و نگار بننے لگے اور طرح طرح کی آرایش و زیبایش ہونے لگی، ہندوستان میں پہلے صرف ہندوستانی طرز تعمیر کے مکان اور محل ہوتے تھے، جب مسلمان اس ملک میں آباد ہوئے تو وسط ایشائی انداز کی عمارتیں بننے لگیں، لیکن وہ ہندوستانی طرز تعمیر سے متأثر ہوئے بغیر بھی نہ رہ سکے، وہ ہندوستان کی عمارتوں کی زینت و آرایش، منبت کاری، نقش و نگار وغیرہ سے خصوصاً متاثر ہوئے، انگریزوں کی حکومت قائم ہونے کے بعد ملک میں یورپی انداز کی عمارتیں بھی بننے لگیں، مگر عمارتوں اور ان کے مختلف حصوں کے نام جو اردو زبان میں داخل ہوئے اور کثرت سے مستعمل ہیں، زیادہ تر فارسی ہیں یا فارسی کی مدد سے بنائے گئے ہیں، مثلاً مندرجۂ ذیل نام:

محل، محل سرا، حرم سرا، شبستان، خوابگاہ، جلوخانہ، حویلی، بارہ دری، دیوان خانہ، توشک خانہ، بالاخانہ، طرہ، دریچہ، زنانہ ڈیوڑھی، بخاری، ناغول، غلام گردش، شاگرد پیشہ، خواص پورا، باورچی خانہ،

مطبخ، نعمت خانہ، آبدار خانہ، حمام، غسل خانہ، آتش دان، طہارت خانہ، بیت الخلا، بدررو، صحن، شہ نشیں، آفتابی، ماہتابی، ماہتابی (مہتابی) سائبان، برآمدہ، زینہ، دہلیز، برق ربا وغیرہ۔

عمارت کے متعلقات کے ناموں میں سے چند نام یہ ہیں:

درو دیوار، بام، بام و در، دروازہ، حریم، محراب، طاق، ستون، سقف، کرسی، پایہ، برج، گنبد، مینار، منارہ، کنگورہ، کلس، روشندان، تابدان، رخنہ، روزن، دودکش وغیرہ۔

ان ناموں میں سے بعض نے شعر و سخن کے ایوان میں بھی اپنی جگہ بنالی ہے، مثلاً

اگ رہا ہے در و دیوار سے سبزہ غالب ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے
(غالب)

آہ خوش دیدنی کے قابل تھی بسمل کی تڑپ صبحدم کوئی اگر بالائے بام آیا تو کیا
(اقبال)

یاد تھیں ہم کو بھی رنگارنگ بزم آرائیاں لیکن اب نقش و نگار طاق نسیاں ہو گئیں
(غالب)

قید میں یعقوب نے لی گو نہ یوسف کی خبر لیکن آنکھیں روزن دیوار زنداں ہو گئیں
(غالب)

موج نسیم صحرا ہے آج عنبر افشاں رخنہ نہ کھل گیا ہو دیوار بوستاں کا
(مصحفی)

چل کے کعبے میں سجدہ کر مومن چھوڑ اس بت کے آستانے کو
(مومن)

نقش پائے رقیب کی محراب نہیں زیبندہ سر جھکانے کو
(مومن)

اصغر حریم عشق میں ہستی ہی جرم ہے رکھنا کبھی نہ پاؤں یہاں سر لئے ہوئے
(اصغر گونڈوی)

مکان اور اس کے متعلقات کے سلسلے میں جو ہندوستانی الفاظ اردو میں استعمال ہوتے ہیں، ان میں سے چند نیچے دئے جاتے ہیں:

کوٹھی، ڈیوڑھی، رنواس، اسارا، دالان، چھت، کوٹھا، ابروٹا، اٹا، اٹاری، کوٹھری، منڈیر، چوکھنڈی، آلا، کھڑکی، جھروکا، چلمن (چلون) آنگن (انگنائی) بروٹھا، چوکھٹ، کواڑ،

پھاٹک، چبوترا، بیٹھک (بیٹھکا) چوپال، چار دیواری، موری، پرنالا وغیرہ،

ہندوستان کے دیہاتوں اور قصبوں میں (چھوٹے چھوٹے شہروں میں بھی) مکان چاہے کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہو اس میں آنگن ضرور ہوتا ہے، یہ مربع یا مستطیل ہوتا ہے، اس کی عموماً دو شکلیں ہوتی ہیں (۱) شیر دہن آنگن (۲) گئو مکھ آنگن۔ اول الذکر وہ آنگن ہے، جو دروازے کی جانب چوڑا اور صدر عمارت کی طرف سکڑا ہوا ہو، یہ ہندوؤں میں منحوس خیال کیا جاتا ہے، ثانی الذکر وہ آنگن ہے جو دروازے کی جانب تنگ اور اصل عمارت کی طرف چوڑا ہو، یہ ہندوؤں میں مبارک سمجھا جاتا ہے[1]،

یورپی اقوام کے ساتھ بنگلا، ڈاک بنگلا، بلڈنگ، فلیٹ، بالکنی، گیلیری، ورینڈا، ٹیرس، ڈائننگ روم، ڈرائنگ روم، کچن وغیرہ آئے، یہ تمام الفاظ ہماری زبان میں اس طرح جذب ہو گئے ہیں گویا اردو الفاظ ہیں،

ان شاندار اور آرام دہ حویلیوں، کوٹھیوں اور عمارتوں کے ساتھ ساتھ اردو نے غریبوں کی کٹیا، جھونپڑی، جھونپڑا، چھپر وغیرہ کو بھی یاد رکھا ہے،

مکانات کے ضمن میں تہ خانے اور خس خانے کا بھی ذکر ضروری ہے، تہ خانے کو تل گھر اور بھونرا بھی کہا جاتا ہے، معاشرتی لحاظ سے ہمارے یہاں ان کی بھی اہمیت رہ چکی ہے، ہندوستان ایک گرم ملک ہے، اس لئے بادشاہوں، نوابوں، راجوں، مہاراجوں وغیرہ نے اپنے آرام و آسایش کے لئے تہ خانے اور خس خانے بنوائے جو بہت ٹھنڈے ہوا کرتے تھے، آرام و آسایش کا تو ہر شخص دلدادہ ہے، لیکن بادشاہوں کے بچے خصوصاً بڑے ناز و نعم سے پلا کرتے تھے، تمازت آفتاب اور موسم کے تغیرات سے بچانے کے واسطے تہ خانے میں رکھے جاتے تھے[2]،

---

[1] ظفر الرحمٰن دہلوی، فرہنگ اصطلاحات پیشہ وراں، جلد اول [2] نور الحسن نیر، نور اللغات، حصہ اول،

انشا کا ایک شعر ہے:

آوارہ پڑے پھرتے ہیں کیوں دھوپ میں صاحب

تہ خانے میں اس وقت بنا جلتی ہے ہوا گرم

غالب کی ایک مشہور رباعی ہے جو بطور معذرت کہی گئی ہے،

سامانِ خور و خواب کہاں سے لاؤں؟ آرام کے اسباب کہاں سے لاؤں؟

روزہ مرا ایمان ہے غالب لیکن خس خانہ و برفاب کہاں سے لاؤں؟

مکان کی مختلف قسمیں:

ساخت یا طرز تعمیر کے لحاظ سے مکان کی مختلف قسمیں یا ان کے مختلف نام ہیں، مثلاً محل، حویلی، کوٹھی، بارہ دری، بنگلہ، آئینہ محل، اک گچی (اک منزلہ) عمارت، دوہری عمارت، بھول بھلیاں، تہ خانہ (تل گھر، بھونرا) کھپریل، ترپولیا، جوابی عمارت، ساون بھادوں، چونسٹھ کھمبا وغیرہ،

اب تک جن عمارتوں کا ذکر ہوا وہ سب رہنے کے لئے ہیں، ان کے علاوہ اور بھی کچھ عمارتیں ہیں، جو ابن آدم نے بنائی ہیں، اور جو فن تعمیر کا عمدہ نمونہ پیش کرتی ہیں، ان میں سے چند کے نام نیچے دئے جاتے ہیں:

مسجد، مندر، شوالہ، ہیکل، گرجا، امام باڑہ، مجلس خانہ، عاشور خانہ، برہم استھان، استھان، خانقاہ، دھرم شالا، مقبرہ، چھتری، قلعہ، کوٹ، مدرسہ، کالج، یونیورسٹی، دفتر، سرائے، ہوٹل وغیرہ، تفریح گاہوں اور چمنوں کی آفتابی کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا،

مکان کی تعمیر میں اس قدر تدریجی ترقی ہوئی کہ اس کے بعض حصے کئی کئی طریقے یا انداز سے بننے لگے، اردو زبان نے ان کے انداز تعمیر کے لحاظ سے ان کے لئے نئے نئے الفاظ بنائے اور

اصطلاحیں تراشیں، مثلاً چھت کی مختلف قسموں کے لئے یہ الفاظ استعمال ہوتے ہیں:

آواز بند چھت (گنگ چھت) بادل گرج چھت، پختہ چھت، دوچیلا چھت (دوپلیا) کچی چھت، چوبی چھت (کڑی تختے کی چھت) لداؤ کی چھت (ڈاٹ کی چھت) کشتی کی چھت[1]،

دروازے اپنی بناوٹ کے لحاظ سے یوں ایک دوسرے سے الگ کئے جاتے ہیں:

تاجدار دروازہ، محرابی در، گھونگھٹ دار دروازہ، اک پٹا دروازہ[2]،

دروازے کے ضمن میں کواڑ کا ذکر بھی ضروری ہے، کیونکہ کواڑ کے بغیر دروازہ مکمل نہیں ہوتا، دروازے کے دونوں کواڑ اصطلاحاً جوڑی کہلاتے ہیں، ایک کواڑ کو پٹ کہتے ہیں، کواڑ کی متعدد قسمیں ہیں جن میں سے چند حسب ذیل ہیں:

آئینے دار جوڑی، ادے دار کواڑ، جھلی دار کواڑ، انگریزی کواڑ (جوڑی) بینک دار جوڑی، بٹن دار جوڑی، پیچ بینی جوڑی، دیسی جوڑی، مغلئی جوڑی، دو فردا کواڑ، ٹوٹوان کواڑ، جو فردی جوڑی، دوپلیا دروازہ، لنگوٹ دار کواڑ[3]،

چوکھٹ اور کواڑ لازم و ملزوم ہیں، چوکھٹ کے بغیر کواڑ کا تصور ہی نہیں ہو سکتا، اس کی منجملہ ذیل قسمیں مشہور ہیں:

پیتام دار چوکھٹ، دیسی یا مغلئی چوکھٹ، دوسالی چوکھٹ، کرن دار چوکھٹ[4]،

چوکھٹ کے لئے اردو میں چند اور الفاظ استعمال ہوتے ہیں، مثلاً دہلیز، لت خورہ، عتبہ، آستانہ، آستاں وغیرہ، آخری تین الفاظ شعر و سخن میں زیادہ مستعمل ہیں،

کواڑ اس وقت تک مکمل طور پر حفاظت کا کام نہیں دے سکتا، جب تک اس کے پٹوں کو بند کرنے کا سامان نہ کیا جائے، اس مقصد کے لئے جو چیزیں بنیں اس کے نام بہت سے ہیں، کیونکہ

---

[1] ظفر الرحمٰن دہلوی فرہنگ اصطلاحات پیشہ وراں، جلد اول [2] ایضاً، [3] ایضاً [4] ایضاً،

اس کی شکلیں بہت سی ہیں، نیچے چند نام دیے جاتے ہیں،

کھٹکا، گٹکا، اڑنگا، اڑنی، بنجی، جھنجھنی، بڑکا، اکرام، چپکا، کنڈی وغیرہ، انگریزی لفظ بولٹ

بھی اب اردو میں استعمال ہونے لگا ہے۔

مکان کی مکمل حفاظت تالے کے بغیر نہیں ہو سکتی، تالے کے لئے کنجی ضروری ہے، تالا گجراتی

زبان کا لفظ ہے، لیکن اب پورے طور سے اردو بن چکا ہے، قفل اور کلید بھی اردو میں کثرت سے

استعمال ہوتے ہیں، چابی بھی جو پرتگالی لفظ ہے، اردو میں ضم ہو چکا ہے، قفل کے بعض متعلقات

کے نام جو اردو میں استعمال ہوتے ہیں، دلچسپ ہیں، مثلاً

اینٹ ہنام :۔ قفل میں کنجی کے گھر کے منہ پر جڑی ہوئی مستطیل شکل کی چیز جو منہ کی حفاظت اور

خوشنمائی کے لئے لگائی جاتی ہے،

برنجی :۔ چھوٹی قسم کی پیتل کی کیل،

پتا :۔ قفل کا پیندا یا تلا،

کان :۔ قفل کے ڈھانچے کے ڈھکنوں کے اوپر کو نکلے ہوئے حصے جن میں ایک طرف کڑے

کا سرا اٹکا رہتا ہے،

مکھ پان :۔ قفل میں کنجی لگانے کے منہ کا ڈھکنا، اس کی دو قسمیں ہیں، سر کواں مکھ پان اور

چو مکھ پان[1]،

نقش و نگار اور زیبائش :

عمارت کی تعمیر کے سلسلے میں نقش و نگار کی بڑی اہمیت ہے، ان کی وجہ سے عمارت کا

حسن بھی بڑھتا ہے، اور اس میں شان بھی پیدا ہوتی ہے، نقش و نگار لکڑی میں بھی بنائے

---

[1] ظفر الرحمٰن دہلوی، فرہنگ اصطلاحات پیشہ وراں، جلد ہفتم،

جاتے ہیں، اور پتھر پر بھی، پتھر کے نقش ونگار کو پچی کاری یا منبت کاری کہتے ہیں، اور لکڑی کے نقش ونگار کو نجاری کی اصطلاح میں مداخل کہا جاتا ہے، اس ضمن میں اردو میں لطیف اصطلاحیں ملتی ہیں،

علم ہندسے کی ایک یا کئی مختلف شکلوں سے ترتیب دیے ہوئے استادانِ فن کے تیار کردہ نمونوں کو پتھر کی سل یا لکڑی کے تختے یا دھات کی چادر میں آرپار تراش لینے کو اصطلاحاً جالی کہتے ہیں، اس کی چند قسمیں حسب ذیل ہیں،

اٹھماسی جالی، زنبوری جالی، انجم جالی، بارہ ماسی جالی، تماسی جالی، چھ ماسی جالی، بدرم جالی، بان پھول کی جالی، دیکھت بھولی جالی، تلمدانی جالی، گلدار جالی، ماہی پشت کی جالی وغیرہ[1]

ان جالیوں کے علاوہ مندرجۂ ذیل چیزیں بھی مکان کی زینت کا باعث ہیں،

جھلملی، مجر، پنجرہ، خاتم بندی، لگ ھرا، جھالر، مہرک، موچپتے، مرادمرے، تکونیا گل، گل ناؤ، الاچہ (الانچہ) ہیرا وغیرہ،[2]

زینت کے ساتھ ساتھ حفاظت کی خاطر سے برق ربا لگایا جاتا ہے تاکہ مکان بجلی گرنے کے صدمے سے محفوظ رہے،

سب کچھ ہو جانے کے بعد عمارت کو رنگ و روغن سے روشن اور پُر رونق بنایا جاتا ہے، اس سلسلے میں بھی اردو نے بہت سی اصطلاحات بنائی ہیں، ذیل میں چند اصطلاحیں لکھی جاتی ہیں، جو عام طور پر معلوم ہیں،

آبک پاشی، استرکاری، سندلا (صندلا) کاری، چینی کاری، کاشی کاری، رودکشی، آئینہ بندی وغیرہ،

---

[1] ظفر الرحمٰن دہلوی فرہنگ اصطلاحات پیشہ وراں، جلد اول [2] ایضاً

عمارت کی تعمیر میں پلستر (PLASTER) کی اہمیت مسلّم ہے، یہ لفظ بھی اردو میں ضم ہو چکا ہے،

اینٹ اور پتھر:

عمارت کی تعمیر میں متعدد چیزیں لگتی ہیں، ان میں اینٹ اور پتھر کی بنیادی حیثیت ہے، اینٹ مستطیل شکل کی ہوتی ہے اور پزاوے یا بھٹے میں پکا کر سخت بنائی جاتی ہے، بناوٹ کے لحاظ سے اس کے مختلف نام ہیں، جو حسب ذیل ہیں، اور جن سے لوگ عموماً واقف ہیں،

ادھا، پوا، پونا، بھانواں، چِتّھا، چوپال، کھورا، گما، گدکا، لکھوری وغیرہ،

چوپال کو شاہجہانی اینٹ بھی کہتے ہیں جو غالباً شاہجہان آباد (دہلی) کی تعمیر کے وقت بڑے بڑے آثار کی چنائی کے لئے تیار کرائی گئی ہوگی، بظاہر اس کی وجہ تسمیہ یہی معلوم ہوتی ہے،

لکھوری کی وجہ تسمیہ کے بارے میں بعض کہتے ہیں کہ شاہجہان آباد کی تعمیر کے وقت لاہور سے اینٹ بنانے والے آئے تھے، ان کی بنائی ہوئی اینٹیں لاہوری کے نام سے مشہور ہوئیں اور پھر عوام کی زبان پر لکھوری بن گئیں، بعض کا بیان ہے کہ اس اینٹ کو بہت دنوں تک پزاوے میں دبا رکھتے ہیں، جس کی وجہ سے وہ خوب پختہ ہو کر لاکھی رنگ کی ہو جاتی ہے، اس لئے اس کو لکھوری کہا جاتا ہے۔[2] اب اس کا رواج تقریب قریب ختم ہو گیا ہے،

اینٹ ہی کے سلسلے میں مندرجہ ذیل چیزیں بھی آتی ہیں، جن کا استعمال اینٹ سے بھی زیادہ ہے:

کو ٹلو، قلفی دار کو ٹلو، کھپرا، نریا (نلیا) وغیرہ،

انگریزی لفظ ٹائل (TILE) بھی اردو میں عام طور سے استعمال ہوتا ہے:

پتھر کی بھی متعدد قسمیں ہیں، ان کے نام زیادہ تر فارسی ہیں، نیچے چند نام جن سے

---

[1] ظفر الرحمٰن دہلوی، فرہنگ اصطلاحات پیشہ وراں، جلد اول [2] ایضاً۔

اردو داں طبقہ اچھی طرح واقف ہے، لکھے جاتے ہیں:

سنگ ابری، سنگ باسی (سنگ سرخ) سنگ چقماق، سنگ خارا، سنگ غلولہ، سنگ دام یا دودیا، سنگ سیماق، سنگ مرمر، سنگ مریم، سنگ موسیٰ، سنگ زہر مہرہ، سنگ ستارا، سنگ یمانی وغیرہ،

مذکورہ بالا پتھروں کے علاوہ کچھ معمولی پتھر ہیں، جو عمارت میں تو استعمال نہیں ہوتے لیکن بنیاد یا تعمیر کے دوسرے کاموں میں استعمال ہوتے ہیں، مثلاً بھر بھرا پتھر (ریتیلا پتھر)، پرت دار پتھر (دردی پتھر) اسے روا بیا بھی کہتے ہیں،[1]

مندرجہ بالا پتھروں کے علاوہ چند اور پتھر ہیں، جو عمارت کی تعمیر میں کام نہیں آتے بلکہ دوسرے مصرف میں آتے ہیں، چونکہ تمدنی حیثیت سے ان کی اہمیت ہے، اس لئے ذیل میں چند پتھروں کا ذکر کیا جاتا ہے،

سنگ سلیمانی:۔ سفید دھاری دار سیاہ رنگ پتھر جو بہت کمیاب ہے، اس سے تسبیح کے دانے بنائے جاتے ہیں، اس کی دھاریوں کی وجہ سے بعض کاریگر اسے زناری کہتے ہیں اور بعض بعض مقامات پر گودنا اور رتقری کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے،[2] سودا کے ایک قصیدے کا مشہور مطلع ہے:

ہوا جب کفر ثابت ہے وہ تمغائے مسلمانی
نہ ٹوٹی شیخ سے تسبیح زنار سلیمانی

سنگ جراحت:۔ دودیا رنگ کا سنگ مرمر سے ملتا ہوا مگر بہت نرم قسم کا پتھر، اس کے کھلونے بنائے جاتے ہیں۔[3]

---

[1] ظفر الرحمٰن دہلوی، فرہنگ مذکور، جلد اول [2] ایضاً، [3] ایضاً۔

سنگ مقناطیس :۔ آہن کش پتھر[1]

سنگ لرزاں :۔ لچک دار پتھر صرف نمائشی ہوتا ہے۔[2]

سنگ کھٹو :۔ ٹھوس قسم کا سبزی مائل رنگ پتھر بعض بیماریوں کے لئے اس کی تختی گلے میں ڈالتے ہیں، فارسی میں اسے سنگ یشب کہتے ہیں۔[3]

تعمیر عمارت یا معماری کے سلسلے سے بہت سی اصطلاحیں اردو میں ہیں جو عام طور سے استعمال ہوتی ہیں، نیچے مثلاً چند اصطلاحیں دی جاتی ہیں۔

چشمہ :۔ چھت کی کڑیوں کا درمیانی فاصلہ جو سروں پر چنائی سے بڑ کر دیا جاتا ہے۔[4]

جنگیر :۔ صدر طاق کے لب کے نیچے گلدستہ کی شکل کی بنی ہوئی منبت کاری۔[5]

جواب :۔ عمارت کے کسی تعمیر شدہ حصے کا مصنوعی جواب جو کسی مقابل کی دیوار پر بطور جوابی عمارت بنا دیا جائے، مثلاً ایک جانب سہ درہ ہے، اس کے مقابل سہ درے کی گنجائش نہیں ہے، صرف دیوار ہے تو دیوار پر سہ درے کی مصنوعی شکل بنا کر جواب دکھا دیا جائے گا۔[6]

بٹ :۔ گھمیری (مدور) زینے کی سیڑھی۔[7]

کمر کوٹ :۔ مکان کے احاطے کی چار دیواری جو کمر کے برابر یعنی تین ساڑھے تین فٹ ہو۔[8]

یہ ڈالنا دیکھنا :۔ چھت یا فرش کی سطح کو جوڑنے سے پختہ کرنا۔[9]

یہ دورزی :۔ فرش یا چھت کی سطح کی درستی یا تیاری، (اصل لفظ "درستی" بگڑ کر "دورزی" ہو گیا)۔[10]

جال :۔ استر کاری کی باریک درزیں جو استر کاری خشک ہونے سے سطح پر رگوں کی طرح پیدا ہو جاتی ہیں۔[11]

---

[1] ظفر الرحمن دہلوی، فرہنگ مذکور جلد اول [2] ایضاً [3] ایضاً [4] ایضاً [5] ایضاً [6] ایضاً [7] ایضاً [8] ایضاً [9] ایضاً [10] ایضاً [11] ایضاً

املا : مسالا،[۱]

بُدّت : وہ کاریگر اور مزدور جو عمارت کی تعمیر، درستی یا مرمت پر مقرر اور لگے ہوئے ہوں یا لگائے جائیں، اصل لفظ بدہ ہے لیکن مزدور اور عوام "ت" سے تلفظ کرتے ہیں،[۲]

معماری کی اصطلاحات کے ضمن میں چند اوزاروں کے نام کا ذکر نامناسب نہ ہوگا، یہ نام بھی اصطلاح کی حیثیت رکھتے ہیں :

ہُتّا : استرکاری میں پھول بوٹے بنانے کا قلم کی شکل کا بنا ہوا، آہنی منہ کا اوزار،[۳]

جھمری : استرکاری کے چونے کو ٹھوکنے کا تھاپی کی وضع کا چوبی اوزار،[۴]

کرنی : چنائی کے کام میں رددوں پر گارا یا چونا پھیلانے اور دیوار وغیرہ پر چونا چھاپنے کا اوزار،[۵]

نیلا : چھوٹی کرنی جس سے کٹاؤ کا کام بنایا جائے، نیلا دراصل نہرنی (ناخن کاٹنے کا آلہ) سے بگڑ کر نہلا اور پھر نیلا ہو گیا،

ساونی (رین سال) : سطح زمین کی ہمواری، ڈھال اور زاویہ قائمہ دیکھنے کا پرانی وضع کا آلہ،[۶]

سول (ساہول، سہاول) دیوار کی بلندی کی سیدھ یعنی عمود آنچھ دیکھنے کا آلہ،

اس سلسلے کی چند اور اصطلاحیں جو اردو میں استعمال ہوتی ہیں :

پرچین سازی : پچی کاری کے لئے پھول، بوٹے یا حروف و الفاظ تراشنے کی صنعت،[۷]

خاک انداز : سنگ بستہ عمارت کی کرسی کا روکاری پتھر،

دیوالی : منقش ستون کی کرسی یعنی نیچے کے حصے کی صاف اور سیدھی لغیاں، اس کو کرسی کے پیر بھی کہتے ہیں،[۸]

ڈنڈی : سنگین اور منقش ستون کا درمیانی حصہ،[۹]

۱؎ ظفر الرحمٰن دہلوی، فرہنگ اصطلاحات پیشہ وراں ج ا ۲؎ ایضاً، ۳؎ ایضاً، ۴؎ ایضاً، ۵؎ ایضاً،
۶؎ ایضاً، ۷؎ ایضاً، ۸؎ ایضاً، ۹؎ ایضاً -

کندھا کھولنا:۔ پتھر پر پھول بوٹے ڈولانے اور سطح کھود کر پتے پتیوں کی شکل سطح پر ابھارنا اور نمایاں کرنا۔[1]

کچا ہتوڑا (کچ مہرا):۔ بت کاری کا کام کرنے کا ہتھوڑا۔[2]

معمار:

عمارت اور اس کے متعلقات کے ذکر کے ساتھ عمارت کے بنانے والوں کا ذکر نہ کرنا ان کے ساتھ ناانصافی ہوگی، ان کے بنانے والوں میں عموماً مندرجۂ ذیل لوگ ہوتے ہیں،

مہندس، معمار، راج، مستری، مزدور، وغیرہ، یہ الفاظ عام ہیں، ان کے علاوہ میمنے اور اگرے بھی اردو میں مستعمل ہیں۔ دہلی کے مسلمان قدیم پیشہ ور معمار میمنے کہلاتے ہیں۔[3] دہلی کے مسلمان ہندو معماروں کو اگرے کہتے ہیں، آگرہ اور نواح آگرہ کے معمار جو شاہجہانی دہلی کی تعمیر کے وقت دہلی آئے غالباً ان کا نام اگریا مشہور ہوگیا۔[4] انگریزی کے الفاظ انجینیر آرکیٹکٹ وغیرہ بھی اب اردو میں عام طور سے استعمال ہوتے ہیں،

محلوں، حویلیوں وغیرہ کے نام:

سلاطین، اور مغلوں کے عہد میں محلوں، حویلیوں وغیرہ کے نام بھی انہی کی مناسبت سے رکھے جاتے تھے یعنی ان ناموں سے شان بھی ظاہر ہوتی تھی، اور نفاست بھی شلاً، خاص محل، امتیاز محل، ہوا محل، جل محل، موتی محل، قصر سبز، قصر سفید، قصر ہزار ستون، کوشک جہاں نما، کوشک سبز، کوشک فیروزی وغیرہ؛ دکن میں سلطان محمد قلی قطب شاہ (اکبر کا ہم عصر) والی گولکنڈہ کو تعمیرات کا بڑا شوق تھا اس کے بنوائے ہوئے محلوں کے نام بھی اسی انداز کے تھے۔ جیسے خداداد محل، اعلا محل، حنا محل، حیدر محل، محل کوہ طور وغیرہ۔ ان کے علاوہ اس کے یہاں

---

[1] ظفر الرحمن دہلوی، فرہنگ اصطلاحات پیشہ وراں، جلد اول [2] ایضاً، [3] ایضاً، [4] ایضاً،

سجن محل، اجیذن محل اور قطب مندر بھی ہیں، سلطان نے ان محلوں کی تعریف میں نظمیں بھی کہی تھیں جو اس کے کلیات میں موجود ہیں،

نوابانِ اودھ کو بھی محلات کی تعمیر سے خاصی دلچسپی تھی اور ان کا ذوق تعمیر بہت بلند تھا، اس کا آغاز صحیح معنوں میں نواب آصف الدولہ کے عہد سے ہوتا ہے اور خاتمہ آخری نواب یعنی واجد علی شاہ پر ہوتا ہے، نواب واجد علی شاہ کے شوق نے معزولی کے زمانے میں بھی مٹیا برج میں بیسیوں کوٹھیاں تعمیر کرا دیں[1]، ان محلوں اور کوٹھیوں کے نام کچھ تو اسی طور کے ہیں جس طور سے اوپر لکھے جا چکے ہیں، لیکن لکھنؤ کی ترقی و تنوع پسند تہذیب نے نئے انداز کے نام بھی اختیار کئے، مثلاً قیصر باغ، تہنیت منزل، فرحت بخش، حیات بخش، بادامی، آسمانی، حد سلطانی، سد سلطانی وغیرہ، غازی الدین حیدر نے اپنی ایک یورپین بی بی کے لئے ولایتی طرز کا محل بنوایا اور اس کا نام ولایتی باغ قرار دیا[2]

اردو میں مذکورۂ بالا قسم کے نام رکھنے کا آج بھی چلن ہے، اس کے علاوہ نئے نئے قسم کے نام بھی رکھے جاتے ہیں، جن سے اردو زبان کی شستگی اور وسعت دامنی ظاہر ہوتی ہے، مثلاً چند نام نیچے لکھے جاتے ہیں، ان میں سے بعض عمارتوں کا تعلق اردو کے بعض بلند پایہ ادیبوں اور شاعروں سے ہے،

راحت محل، عشرت منزل، بیت الحبیب، سمن زار، لالہ زار، کاشانۂ فرحت، گلکدہ، دلکشا، خیابان، نشیمن، راحت فزا، کہسار، ادبستان، زر افشاں، رین بسیرا، پھول بن وغیرہ، انیسویں صدی سے لال بارہ دری، چاندوالی بارہ دری، ٹیڑھی کوٹھی، کوٹھی دلکشا وغیرہ جیسے نام بھی رکھے جانے لگے، ان ناموں میں بھی ندرت پائی جاتی ہے،

---

[1] مولانا عبد الحلیم شرر لکھنوی، گذشتہ لکھنؤ ص ۳۹ [2] ایضاً۔

مغربی تعلیم و تہذیب کے زیر اثر انگریزی انداز کے نام بھی اردو نے اپنا لئے اور اس قسم کے نام بھی عمارتوں پر نظر آنے لگے:

فاروق بلڈنگ۔ انجم لاج، کلیان مینشن، بھوپال ہاؤس، آغا خان پیلس، حبیب فلیٹش، فاطمہ ٹیرس، کدار کاٹیج وغیرہ،

کتبہ:

عمارت کے دروازے پر خواہ وہ رہنے کا مکان ہو یا عبادت گاہ ہو یا اور کسی قسم کی عمارت ہو، کوئی عبارت لکھوا کر یا پتھر پر کھدوا کر لگا دی جاتی ہے، اسے کتبہ کہتے ہیں عمارت میں عموماً عمارت کی تاریخ بنایا تاریخ تعمیر ہوتی ہے، بعض اوقات کوئی شعر یا قرآنی آیت کندہ کرائی جاتی ہے،

خانہ باغ:

محلوں، حویلیوں وغیرہ کے ساتھ باغ کا تصور خود بخود ذہن میں پیدا ہوتا ہے، ان شاندار عمارتوں کے ارد گرد یا آگے پیچھے بڑے بڑے باغات ہوتے تھے، اور اب بھی کسی حد تک ہوتے ہیں، ان کو پائیں باغ یا خانہ باغ کہا جاتا ہے، میر حسن نے سحر البیان میں ایک باب (داستان تیاری میں باغ کی) باندھا ہے، اس میں عمارت کی خوبی دکھانے کے بعد باغ کی تعریف میں جو اشعار کہے ہیں ان میں سے چند منتخب اشعار نیچے دئے جاتے ہیں ان سے خانہ باغ کی لطافت اور ناز کی و شادابی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے:

چمن سے بھرا باغ، گل سے چمن	کہیں نرگس و گل کہیں یاسمن
چنبیلی کہیں، اور کہیں موتیا	کہیں رائے بیل اور کہیں موگرا
کھڑے شاخ شبو کے ہر جا نشاں	مدن بان کی اور ہی آن بان

کہیں ارغواں اور کہیں لالہ زار | جدی اپنے موسم میں سب کی بہار
کہیں جعفری اور گیندا کہیں | سماں شب کو داؤدیوں کا کہیں
عجب چاندنی میں گلوں کی بہار | ہر ایک گل سفیدی سے مہتاب وار
کھڑے سرو کی طرح چمپے کے جھاڑ | کہے تو کہ خوشبوئیوں کے پہاڑ
کہیں زرد نسریں، کہیں نسترن | عجب رنگ پر زعفرانی چمن
پڑی آبجو ہر طرف کو بہے | کریں قمریاں سرو پر چہچہے
گلوں کا لب نہر پر جھومنا | اسی اپنے عالم میں منہ چومنا
وہ جھک جھک کے گرنا خیابان پر | نشے کا سا عالم گلستان پر
چمن آتشِ گل سے دہکا ہوا | ہوا کے سبب باغ مہکا ہوا[1]

آگے چل کر شاعر نے محل کی کنیزوں کی خوش ادائیوں اور چہلوں کا ذکر کیا ہے، اور باغ کی مناسبت سے انھیں مختلف پھولوں سے تشبیہ دی ہے:

خواصوں کا اور لونڈیوں کا ہجوم | محل کی وہ چہلیں، وہ آپس کی دھوم
کنیزانِ مہ رو کی ہر طرف ریل | چنبیلی کوئی اور کوئی رائے بیل
شگوفہ کوئی اور کوئی کام روپ | کوئی جپ لگن اور کوئی شام روپ
کوئی کیتکی اور کوئی گلاب | کوئی مدن بن اور کوئی ماہتاب
کوئی سیوتی اور ہنس مکھ کوئی | کوئی دل لگن اور تن سکھ کوئی[2]

لکھنؤ میں نواب واجد علی شاہ کی بنوائی ہوئی عمارت قیصر باغ کے نام سے ہر پڑھا لکھا شخص واقف ہے، اس کے اندرونی صحن میں چمن بندی تھی، جو جلو خانہ کہلاتا تھا[3]، نواب

---

[1] مولانا عبد الحلیم شرر لکھنوی، گذشتہ لکھنؤ، ص ۱۰۳، [2] ایضاً،

نواجد علی شاہ نے معزولی کے بعد کلکتے تک بھی بیسیوں کوٹھیاں تعمیر کرادیں جن کے گرد نہایت ہی پُر فضا باغ اور فرحت بخش چمن تھے۔[1]

مکان کی آرائش وزیبائش:

مکان کی طرز آرائش سے بھی اس میں رہنے والے کی تہذیب وشائستگی کا پتا چلتا ہے، متمدن قومیں اپنے مکانات کی بہتر سے بہتر طریقے پر آرائش کرتی ہیں، جیسا کہ اوپر کہا جاچکا ہے، مسلمان اپنے ساتھ جو تمدن لے کر آئے تھے، وہ عرب کی سادگی اور عجم کی نفاست کا مجموعہ تھا، رفتہ رفتہ عرب کی سادگی کم ہوتی گئی اور عجم کی نفاست بڑھتی گئی، مغلوں کے عہد میں خصوصًا نورجہاں کے حرم میں داخل ہونے اور اقتدار ورسوخ حاصل کرنے کے بعد جب دربار پر ایرانی تہذیب وتمدن کے اثرات بہت بڑھ گئے اور عجمی نفاست بہت زیادہ ہوگئی تو دربار اور اہل دربار اور امراء اور وسطے گزر کر متوسط طبقے تک اس کا اثر پہنچا، ہندوستان میں کھاٹ، کھٹولا، کھٹولی، پلنگ، پلنگڑی، چھپر کھٹ، مسہری، گدا، بچھونا، گبھا، چوکی، مونڈھا، پیڑھا، پیڑھی، چادر، دری، سوزنی، گدڑی، کتھری، بوریا، چٹائی، سیتل پاٹی، منگل کوٹی وغیرہ کا چلن تھا، اب ان چیزوں کے ساتھ ساتھ چارپائی، تخت، تپائی، میز، کرسی، صندلی، فرش، غالیچہ، قالین، جاجم (جازم)، شطرنجی، چاندنی، میر فرش، پا انداز، مسند، مسند تکیہ، گاؤ تکیہ، توشک، نہالچہ، چادر، دوتہی، پلنگ پوش، بالاپوش، دولائی، پیش گیر، نمگیرا، سیج بند، نہالی، تکیہ، تکیہ پوش، گل تکیہ، بغل تکیہ، تکیینی، مچھردانی وغیرہ کا بھی استعمال ہونے لگا، اوڑھنے کے لئے لحاف، رضائی، رزائی،[2] دلائی، کمل، شال، دوشالہ، دھسا، دوسا، پچھادریں وغیرہ استعمال ہوتی ہیں،

---

[1] مولانا عبدالحلیم شرر لکھنوی، گذشتہ لکھنؤ، ص ۱۱۲۔ [2] رزائی، کشمیر کے بنے ہوئے ایک اونی پھول دار کپڑے کا نام تھا، جو امراء کے لئے رات کے اوڑھنے کے لئے تیار کیا جاتا تھا۔ (مرزا رحمٰن، دیکھئے فرہنگ مذکور، جلد دوم)

کپڑے اور دوسرے سامان رکھنے کے لئے مختلف چیزیں بنائی گئیں، مثلاً صندوق، صندوقچہ، پٹارا، پٹاری وغیرہ، فرنگیوں کے ساتھ الماری آئی، جو اب بہت عام ہے، مغلوں کے عہد میں اس کمرے یا جگہ کو جہاں یہ سامان رکھا جاتا تھا، توشک خانہ کہا جاتا تھا، آج بھی اس کمرے کو جس میں اس قسم کا سامان رکھا جاتا ہے، توشک خانہ کہتے ہیں،

امرا اور رؤسا کے گھروں میں گرمی کے دنوں میں خس کی ٹٹیاں لگائی جاتی تھیں، اکبر کی فرمایش سے خس کی ٹٹیوں کا رواج شروع ہوا۔[1] ان کا چلن قصبوں اور دیہاتوں میں آج بھی ہے، پنکھا ہر خاص و عام کے استعمال کی چیز ہے، پنکھا سادہ بھی ہوتا ہے اور گوٹوں اور ابرک کی مدد سے خوبصورت اور چمکیلا بھی بنایا جاتا ہے، شعرا نے بھی اسے موضوعِ سخن بنا کر طبع آزمائی کی ہے، مثلاً نظیر اکبر آبادی نے "پنکھا،، کے عنوان سے ایک مخمس لکھا ہے، جس کے چند بند نیچے نقل کئے جاتے ہیں،

کیا موسمِ گرمی میں نمودار ہے پنکھا　　خوابوں کے پسینوں کا خریدار ہے پنکھا
لگ رو کا ہر اک جا یہ خریدار ہے پنکھا　　اب پاس مرے یار کے ہر بار ہے پنکھا

گرمی سے محبت کی بڑا یار ہے پنکھا

نرمی سے، صفائی سے، نزاکت سے، بھڑک سے　　گوٹوں کی لگاوٹ سے اور ابرک کی چمک سے
منقش کے جھڑتے ہیں پڑے تار جھمک سے　　دریائی و گوٹے و کناری کی چمک سے

کیا ہاتھ میں کافر کے جھمک دار ہے پنکھا

ہے یہ وہ ہوادار جہاں اس کا گذر ہو　　پھر گرمی تو واں اپنے پسینے میں چلے رو
کرتا ہے خوشی روح کو، دیتا ہے عرق کھو　　رکھتا ہے سدا اپنے وہ قبضے میں ہوا کو

سچ پوچھو تو صاحب اسرار ہے پنکھا

---

[1] ابوالفضل، آئین اکبری، ج ۳، ص ۱۶،

دستی پنکھے کے علاوہ مکان کی چھت میں بھی بڑا سا پنکھا لگایا جاتا تھا، جسے ایک آدمی حرکت دیتا رہتا اور پورے کمرے میں ہوا پہنچتی، اس کو فرشی یا فراشی پنکھا کہا جاتا ہے جب بجلی ہر جگہ نہیں پہنچی تھی تو کچہریوں اور دفتروں وغیرہ میں اس کا رواج عموماً تھا، اب جگہ جگہ بجلی آجانے کی وجہ سے اس کا چلن کم ہو گیا ہے، مکھیاں اڑانے کے لئے مور کے پروں سے پنکھا بنایا جاتا جو دیکھنے میں بھی بہت خوبصورت ہوتا، اسے مورچھل کہتے ہیں، اس کا رواج بھی اب کم ہو گیا ہے،

انگریزی تہذیب سے اردو نے سوفا، ٹیبل، ڈریسنگ ٹیبل، اسٹول، کباٹ، آرام کرسی، وغیرہ لئے، دستی پنکھے کی جگہ بجلی کا پنکھا استعمال ہونے لگا، فین (FAN) ٹیبل فین وغیرہ تقریباً اردو الفاظ بن چکے ہیں، اسی طرح بٹن، سوچ، وائر وغیرہ بھی اردو میں جذب ہو چکے ہیں،

مذکورۂ بالا چیزیں آرایش و زیبایش اور راحت و آسایش دونوں کا سامان ہیں، لیکن مندرجۂ ذیل اشیا مخصوصاً زیب و زینت کی خاطر ہیں،

پردے، چق، چلمن (چلون) چھت گیری، دیوار گیری، تنک پوش، چنگیر، گلدان، نرگس دان، گلدستے، دستنبو، عطردان، گلاب پاش، مجمر، عود سوز، اگردان، تصویریں، مرقع، طغرے، آئینے، میز پوش وغیرہ،

میر حسن نے مثنوی سحر البیان میں عمارت کا جو نقشہ کھینچا ہے، اس میں مختلف مقامات پر مذکورۂ بالا اشیا میں سے کئی چیزوں کا ذکر کیا ہے:

چقیں اور پردے بندھے زرنگار | دروں پر کھڑی دست بستہ قطار
کوئی ڈورے دربہ اٹکا ہوا | کوئی زہ بہ خوبی سے لٹکا ہوا
چقوں کا تماشا تھا آنکھوں کا جال | نگہ کو وہاں سے گذرنا محال

سنہری مغرق چھتیں ساریاں — وہ دیوار اور در کی گل کاریاں

دئے چار سو آئینے جو لگا — گیا جو گنا لطف اس میں سما

وہ مخمل کا فرش اس میں ستھرا کہ بس — بڑھے جس کے آگے نہ پائے ہوس

وہ سونے کا جو تھا جڑاؤ پلنگ — کہ سیمیں تنوں کو ہو جس پر امنگ

بچھی چادر ایک اس پہ شبنم کی صاف — کہ ہو چاندنی جس صفا کی غلاف

دھرے اس پہ تکیے کئی نرم نرم — کہ مخمل کو ہو جس کے دیکھے سے شرم

کسے اس پہ کسنے وہ مقیش کے — کہ جھبوں میں تھے جس کے موتی لگے

سراسر ادھر تھے زری بان کے — کہ تھے رشک آئینہ صاف کے

وہ گل تکیے اس کے جو تھے رشکِ ماہ — کہ ہر وجہ تھی ان کو خوبی کی راہ

خواصوں نے گھر کو دیا انتظام — تمامی کے پردے لگائے تمام

بچھا فرش اور کر چھپر کھٹ کو صاف — مرصع کا اس پر اڑھا کر غلاف

وہ نرگس کے دستے جو آفاق میں — نہ نکلیں، سو لا کر چنے طاق میں

چھپر کھٹ کے پاس ایک مسند بچھا — اور اس پر تمامی کے تکیے لگا

چنگیر میں بنا اور رکھ پاندان — قرینے سے اس میں رکھے ہار پان

مرصع کئی عطر دان تھے دھرے — انوکھی گھڑت کے کئی جو گھرے

بچھی ایک چوکی، پڑا تورہ پوش — کریں دیکھ کر غش جسے بادہ نوش

مذکورہ بالا زینتی اشیا کے علاوہ روشنی اور روشنی کے آلات بھی مکانوں کی زیبائش کا کام دیتے ہیں، قدیم زمانے میں ہندوستان میں دیا تھا، اور ایران، ترکستان وغیرہ میں چراغ، مسلمانوں کے ساتھ چراغ ہندوستان میں بھی آیا، دئے اور چراغ کی روشنی

ایک زمانے تک جھونپڑوں، مکانوں اور محلوں کو روشن کرتی رہی، چراغ ہماری تمدنی زندگی میں اس حد تک سرایت کر گیا کہ وہ اپنے اصلی معنی و مفہوم سے ہٹ کر استعارۃً اور کنایۃً بھی استعمال کیا جانے لگا، مثلاً بیٹے کو گھر کا چراغ کہا جاتا ہے، گھر کی روشنی اور رونق کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے، خود آدمی کی خوشی کا اظہار بھی اس سے کیا جاتا ہے، یعنی چراغ ہو جانا جو محاورہ ہے، اس سے اور بھی محاورے بنے، جیسے، چراغ بتی کرنا، چراغ میں بتی پڑنا، چراغ سے چراغ جلنا، چراغ لے کر ڈھونڈھنا، چراغ پا ہونا وغیرہ، چند کہاوتیں بھی اس کی بنیاد پر بنیں، جیسے، چراغ تلے اندھیرا، چراغ گل پگڑی غائب، چراغ میں بتی پڑی لاؤ میری بیج چڑھی وغیرہ، بعض چیزوں کو اس سے تشبیہ دی جانے لگی، مثلاً چراغ سحر یعنی آفتاب یا صبح کا ستارا، چراغ سحری یعنی مرنے کے قریب ہونا وغیرہ، چراغ جلتا ہے تو اس سے تیل ٹپکتا ہے، اس کو چراغ سے پھول جھڑنا کہتے ہیں۔ عورتوں کی زبان میں اسے چراغ کا ہنسنا کہتے ہیں، اس سے شادی یا کسی خوشی کے ہونے کا شگون لیتے ہیں۔[1] پیروں اور مریدوں نے چراغی، چراغی چڑھانا، چراغی لینا، اصطلاحیں چراغ ہی سے بنائیں، چراغی فاتحہ پڑھنے والوں کا نذرانہ یا اجرت ہے۔ چراغ ہی کی نسبت سے گداگروں نے چراغی کی اصطلاح نکالی جس کا مفہوم ہے ایک پیسہ۔[2]

دیے یا چراغ کی روشنی مدھم تھی، اس لئے شمع ایجاد کی گئی، چراغ کی طرح بلکہ اس سے زیادہ شمع نے ہماری تمدنی زندگی میں اہمیت حاصل کی، افادیت کے علاوہ یہ زینت اور خوشنمائی کا بھی باعث ہے، شمع کا لفظ بھی اپنے اصلی معنی سے ہٹ کر استعارۃً اور کنایۃً استعمال ہوتا ہے، مثلاً شمع ایمن (تجلی نور حق)، شمع بالیں (قبر کے سرہانے روشن کی جانے والی شمع) شمع عالمتاب (آفتاب)، شمع سحر (صبح کاذب، آفتاب)، وغیرہ، اسی طرح شمع جلتی کرنا یا شمع چڑھانا عورتوں کا

---

[1] نور الحسن نیر، نور اللغات، حصہ دوم [2] ایضاً۔

محاورہ ہے، جس کا مفہوم ہے منت ماننا یا منت ماننے کی لئے شمع جلانا۔

شعرانے بھی شمع کو تشبیہ اور استعارے کے طور پر استعمال کیا ہے، چند شعر مثالاً نیچے نقل کئے جاتے ہیں،

اے شمع تری عمر طبیعی ہے ایک رات | ہنس کر گذار یا اسے رو کر گذار دے
(ذوق)

غم ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج | شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک
(غالب)

لو شمع حقیقت کی اپنی ہی جگہ پر ہے | فانوس کی گردش سے کیا کیا نظر آتا ہے
(اصغر گونڈوی)

کار فرما ہے فقط حسن کا نیرنگ کمال | چاہے وہ شمع بنے چاہے وہ پروانہ بنے
(اصغر گونڈوی)

دیئے کے رکھنے کے لئے ڈیوٹ تھا جسے بعد میں دیپ دان اور چراغ دان بھی کہا جانے لگا، شمع کے لئے شمع دان بنایا گیا، دیپ مال یا دیپ مالا کو بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ دیوار یا برج میں چراغ رکھنے کے لئے قطار در قطار بنے ہوئے موکھے ہوتے ہیں، جو عموماً مندروں یا اس قسم کے دوسرے مقامات پر چراغاں کرنے کے لئے بنے ہوتے ہیں۔[1]

تمدنی ترقی کے ساتھ ساتھ روشنی کے سامان یا آلات میں بھی ترقی ہوتی گئی۔ اردو میں ان کے لئے جو متعدد الفاظ استعمال ہوتے ہیں، ان میں سے چند نیچے دئے جاتے ہیں،

فانوس، مشعل (مشال)، فتیل سوز، قمقمہ، قلادا، جھاڑ، جھاڑ فانوس، قندیل، کنول، ہانڈی، حباب، مردنگی، اکاس دیا، اکا (اک شاخہ)، دو شاخہ، سہ شاخہ، پنج شاخہ، پنجی، جل چراغ، کوکبہ، لگن، دیپ مالا، جھائیں مائیں، سر چراغاں وغیرہ۔

دئے کی ایک قسم لوٹن دیا بتائی جاتی ہے، یہ قدیم جودھپوری ایجاد ہے، یہ ایک عجیب ساخت کا چراغ ہے، جس کو الٹا کرنے یا ادھر ادھر جھکانے سے بھی اوندھا نہیں ہوتا جس کی

---

[1] ظفر الرحمٰن دہلوی، فرہنگ اصطلاحات پیشہ وراں، جلد اول،

وجہ سے نہ چراغ بجھتا ہے نہ تیل گرتا ہے، ۱۸۸۸ء میں اس قسم کا ایک چراغ گلاسکو کی نمایش میں بھیجا گیا تھا۔[1]

دیے اور چراغ کے ضمن میں دیا سلائی اور چقماق (چک مک) کو بھی یاد کر لینا چاہیے، ان کے بغیر چراغ جل ہی نہیں سکتا، جھگڑالو یا فتین عورت کو استعارۃً دیا سلائی کہتے ہیں، چراغ یا شمع کے جلنے سے بتی کے سرے پر جو کاجل بنتا ہے، اسے گل کہتے ہیں، اسے کترنے کے لئے ایک آلہ استعمال ہوتا ہے جسے گل گیر کہا جاتا ہے، کسی کا شعر ہے:

جل بجھا گل بزم میں دیکھی بھی پروانے کی بات

شمع کو گل گیر چھیڑے تھی ہی مر جانے کی بات

دسہرا، دیوالی، عیدین، شادی بیاہ اور بعض دوسرے جشن کی تقریبوں کے موقع پر مکان کو خصوصاً سجایا جاتا ہے، رنگ برنگ کے کاغذ کے پھولوں اور گلدستوں کے علاوہ ابرق (ابرک) کی مدد سے طرح طرح کی آرایشی چیزیں بنائی جاتی ہیں، مثلاً ابرک کی کنول، آرایشی تختہ، آرایشی ٹٹی، آرایشی چھڑی، جگنو، روشن چوکی، دغدغہ، قندیل، کھلونا وغیرہ،[2]

مختلف قسم کے رنگین کاغذ اور اسی قسم کی دوسری بھڑکیلی چیزوں کا بنایا ہوا آرایشی سامان اہل ہنود میں شادی بیاہ کے موقع پر خصوصاً اور مکانوں کے سجانے کو عموماً استعمال کیا جاتا ہے اسے آرایش یا کاغذی باغ و بہار کہتے ہیں، اور اس کا کاریگر آرایش ساز کہلاتا ہے،[3]

جیل یا تانبے کے باریک ورق سے بھی جس کی سطح کو روغنی رنگ سے رنگ کر چمکدار بنا لیا جاتا ہے، آرایشی پھول بوٹے بنائے جاتے ہیں، ان پھولوں کو جگ جگا کہتے ہیں،[4]

انگریزی حکومت کے قیام کے بعد ہندوستان میں نئی نئی ایجادیں پہنچنے لگیں، انہی میں

---

[1] ملا واحدی دہلوی، فرہنگ اصطلاحات پیشہ وراں، جلد اول [2] ایضاً، [3] ایضاً [4] ایضاً،

روشنی کے سامان بھی تھے، دئے اور چراغ کی جگہ لالٹین، لیمپ اور ٹیبل لیمپ نے لی، پھر گیس کی بتیاں اور گیس کے ہنڈے اجالا کرنے لگے، اس کے بعد بجلی نے شہروں کو منور کر دیا، اب دھیرے دھیرے تاریک دیہات بھی بجلی کی روشنی سے روشن ہوتے جا رہے ہیں، بجلی کی روشنی نے اردو کے ذخیرۂ الفاظ میں بلب، بٹن، سوچ (SWITCH)، میٹر (METER)، وغیرہ کا اضافہ کیا، بجلی کے تار کے ساتھ اب اردو میں وائر (WIRE) بھی آزادی سے استعمال ہونے لگا ہے، جھٹکے اور شاک (SHOCK) میں اب کوئی فرق نہیں رہا، بلکہ ثانی الذکر نسبتاً زیادہ استعمال ہوتا ہے، ٹیوب لائٹ اس سلسلے میں جدید ترین اضافہ ہے جس نے گھر کو روشن تر بنا دیا ہے، یہ لفظ بھی اردو میں عام ہو چکا ہے،

ہندوستان میں آج بھی کچے مکانوں کی کثرت ہے، ان کی آرائش و زیبائش دوسرے طریقوں سے ہوتی ہے، ان کی دیواروں پر چونے کے بدلے سفید قسم کی مٹی پھیری جاتی ہے جسے پنڈول کہتے ہیں، اس پر پانی چھڑکنے سے سوندھی سوندھی خوشبو نکلتی ہے؛

نوکر اور نوکرانیاں وغیرہ:

مکان کی دیکھ بھال، صفائی اور زینت کے لئے یا زینت کو برقرار رکھنے کے لئے نوکروں اور نوکرانیوں کا ہونا ضروری ہے، ان کاموں کے علاوہ بچوں کی نگہداشت اور دوسرے بہت سے چھوٹے چھوٹے کاموں کو کرنے کے لئے خادموں اور خادماؤں کی ضرورت پڑتی ہے، قدیم زمانے میں محل کی حفاظت اور نگہبانی کے لئے محل دار ہوا کرتے تھے، اس ضمن میں خواجہ سرا کی اہمیت بھی مسلم تھی، اسے محلی بھی کہا جاتا تھا، کیونکہ اس کا تعلق محل اور محل سرا سے ہوتا تھا، اس کا کام محل سراؤں میں بطور دربان یا چوبدار حاضر رہنا اور احکام رسانی کی خدمت بجا لانا تھا، خواجہ سراؤں نے بعض دوسرے ملکوں کی طرح ہندوستان میں بھی تاریخ کے بعض ادوار

میں، خصوصاً مغلوں کے آخری دور میں بڑا اقتدار حاصل کر لیا تھا، ان دونوں کے علاوہ پاسبان یا دربان بھی ہوتے تھے، نیلی وردی والے دربان کو نجیب کہا جاتا تھا، یہ نام یا الفاظ محل کے ساتھ مخصوص تھے، اب نہ وہ محل رہے نہ وہ محل دار اور نہ نجیب رہے، لیکن یہ الفاظ اردو میں داخل ہو چکے ہیں، عام مکان کی نگہبانی کرنے والے کو عموماً دربان، چوکیدار، باریدار، پہرے دار وغیرہ کہا جاتا ہے،

محلوں کے اندر جو نوکرانیاں ہوا کرتی تھیں ان کے لئے ان کے کاموں کے لحاظ سے مختلف الفاظ یا نام تھے، مثلاً، محل دارنی، حبشن، ترکن، قلماقنی وغیرہ، پہرا دینے والی خادمائیں تھیں، شاہی محل میں خبر یا حکم احکام پہنچانے والی خادمہ کو جسولینی (یسولینی)، اور اردا بیگنی کہا جاتا تھا، امور خانہ داری کا اہتمام کرنے والی مغلانی کہلاتی تھی، لیکن اب اس کا مفہوم بدل گیا ہے، اب رئیسوں کے گھروں میں سینے پرونے والی خادمہ کو مغلانی کہا جاتا ہے، امور خانہ داری سے متعلق خادمائیں اپنی اپنی مخصوص ذمے داریوں کے لحاظ سے الگ الگ ناموں سے یاد کی جاتی تھیں، مثلاً توشے خانے والیاں، خاصے والیاں، خاصے کی داروغہ، آبدار خانے والیاں، چلمچی آفتابے والیاں، آفتاب چی، بھنڈے خانے والیاں، دوا خانے والیاں، وغیرہ ان مخصوص ذمے داریوں کی خادمائیں، اب نہیں رہیں، مگر یہ الفاظ اردو زبان کی زینت بن چکے ہیں، ان خادماؤں کے علاوہ خواص، پرستار، اصیل، مہری، ماما، آیا، دایہ، دوا، انا، کھلائی، مانی وغیرہ تھیں، ان میں سے بعض آج بھی اعلیٰ اور متوسط طبقے کے گھروں میں پائی جاتی ہیں، ملازماؤں کے سلسلے میں انا، چھوچھو اور دانا ہیو کو فراموش نہیں کیا جا سکتا،

نوکرانی کے لئے اردو میں خادمہ، ملازمہ، کنیز، لونڈی، باندی وغیرہ الفاظ استعمال ہوتے تھے، کسی لکھنوی شاعر کا شعر ہے:

ہمارے گھر کی لونڈی ہے، ہمارے گھر کی باندی ہے
کوئی اردو کو کیا سمجھے گا، جیسا ہم سمجھتے ہیں،

اب عموماً خادمہ صرف یا ملازمہ کہا جاتا ہے،

مرد نوکر کو خادم، خدمتگار، ملازم، نوکر چاکر کہا جاتا ہے، آدمی کا لفظ بھی ملازم کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، قدیم اردو میں یتیم کا لفظ بھی نوکر کے معنی میں استعمال ہوتا تھا،

شاہی محل کی کنیزوں کے نام دلچسپ اور شگفتہ ہوتے تھے، وہاں سے نکل کر یہ امرا اور رؤسا کے گھروں میں بھی پہنچے، نیچے چند نام دئے جاتے ہیں،

گل بہار، نو بہار، سبزہ بہار، چنپا، چنبیلی، گل چمن، نرگس، مان کنور، نند کنور، چنچل کنور، مبارک قدم، نیک قدم، سنبل، صنوبر، سوسن، شمشاد، دلشاد، دل آرام، زعفران، انار کلی وغیرہ

مندرجہ بالا ناموں کے علاوہ آخری دور میں اس قسم کے نام بھی ملتے ہیں،

دھنیا، پینیا، بنیا وغیرہ،[1]

مولانا عبد الحلیم شرر لکھنوی نے خادموں اور خادماؤں کے سلسلے میں ایک خاص بات یہ لکھی ہے کہ:

"لکھنؤ میں زنانے اور مردانے نوکروں اور اندر باہر کے تمام ملازموں کے لئے جو خاص خاص لباس مقرر ہو گئے تھے وہی ان کی اصلی وضع قرار پا گئی، مثلاً جیسے ڈیوڑھیوں کے پہرے والے سپاہیوں اور چوبداروں، ہرکاروں وغیرہ کی خاص اور جداجدا وضعیں تھیں ویسے ہی زنانی محل سراؤں میں محل داروں، مغلانیوں اور کہاریوں کی وضعیں اس قدر ممتاز تھیں کہ دور سے دیکھتے ہی انسان سمجھ جائے گا کہ یہ عورت محل دار ہے، یہ خواص ہے، یہ مغلانی ہے، اور یہ کہاری ہے، اور پھر لطف یہ کہ

[1] مولانا عبد الحلیم شرر لکھنوی، گذشتہ لکھنؤ، ص ۲۶۸،

ان کے لباس میں وردی کی شان نہیں پیدا ہونے پائی[1]

بھشتی :

مکان کے ضمن میں بھشتی کا ذکر بھی ضروری ہے، موجودہ دور میں اس کی ضرورت اور اہمیت نسبتہً کم ہو گئی ہے، کیونکہ اب پائپ بہت زیادہ لگ گئے ہیں، بھشتی سقے کی عرفیت ہے جس کا کام گھروں میں پانی پہنچانا ہے، اسے دراصل بہشتی کہا جاتا ہے، کثرت استعمال سے وہ بھشتی بن گیا، میر انیس نے بہشتی استعمال کیا ہے،

طوفاں سے خدا پیاسوں کی کشتی کو بچا لے　　　　اللہ، سکینہ کے بہشتی کو بچا لے

سکینہ کے بہشتی سے حضرت عباس مراد ہیں جو ان کے چچا تھے:

اسے بہشتی کہنے کے دو سبب ہو سکتے ہیں، ایک تو اس کی غیر معمولی منفعت اور دوسرا اس کا بازاروں میں لوگوں کو پانی پلانا جو ثواب کا کام ہے بعض مقامات میں اسے خواجہ بھی کہا جاتا ہے[2]، اس کے کام کی مناسبت سے اسے پنہیارا (پنہارا) بھی کہتے ہیں، سقے کے گھر کی عورتیں بھی پانی لانے کا کام کرتی ہیں، انہیں سقن، سقنی، پنہیارن (پنہارن) اور بھشتن کہتے ہیں،

پانی بھیڑ یا بکرے کی کھال کے ایک لمبے تھیلے میں لایا جاتا ہے، جسے مشک کہتے ہیں، چھوٹا مشک مشکیزہ اور غیر معمولی بڑا مشک پکھال کہلاتا ہے، پکھال گائے یا بھینس کی سالم کھال کے بنے ہوئے تھیلے ہوتے ہیں، یہ تھیلے جوڑی کی شکل میں ہوتے ہیں، جوڑی کو پکھال کہتے ہیں اور ہر فرد آکھا کہلاتی ہے، پکھال میں پانی بھر کر اسے بیل کی پشت پر لے جاتے ہیں، پکھال استعمال کرنے والے کو بھشتی کے علاوہ پکھالی بھی کہا جاتا ہے، پکھال کنایۃً بڑے پیٹ کو کہتے ہیں[3]

---

[1] مولانا عبد الحلیم شرر لکھنوی، گذشتہ لکھنو، ص ۲۴۳ [2] ظفر الرحمٰن دہلوی، فرہنگ اصطلاحات پیشہ وراں جلد اول،

پکھالی پٹیا یا پکھالی پیٹو سے مراد بست کھانے والا ہے، جسے صرف پیٹو بھی کہا جاتا ہے،

قدیم زمانے میں جب پردے کا رواج زیادہ تھا مسلمان گھروں میں سقہ منہ پر نقاب ڈال کر جاتا تھا، اس نقاب کو اصطلاحاً اندھیری کہتے ہیں[1] اندھیری اس چمڑے یا کپڑے کو بھی کہتے ہیں جو شتر و گھوڑوں کی آنکھوں پر ڈالا جاتا ہے،

سقوں کی برادری کا ہر فرد سقوں کی اصطلاح میں لنگی بند بھائی کہلاتا ہے[2]،

حلال خور:

مکان کی خوبصورتی اور زینت صفائی کے بغیر قائم نہیں رہ سکتی، اسی لئے ہر گھر میں جھاڑو بہارو کا انتظام ہوتا ہے، اس عام صفائی کے علاوہ بیت الخلا (سنڈاس) کی صفائی خصوصاً اہمیت رکھتی ہے، یہ کام بھنگی کرتا ہے، جس کا خاندانی پیشہ یہی ہے، اسے باہر والا بھی کہا جاتا ہے، چونکہ یہ گرا ہوا کام ہے اور عموماً بیچارے بھنگی کو حقیر سمجھا جاتا تھا اس لئے اس کی دلداری کی خاطر اسے مہتر، حلال خور اور جمعدار کہا جانے لگا، اس کی عورت کو مہترانی، حلال خورن اور جمعدارن کہا جاتا ہے، اردو نے بھنگی اور بھنگن کے ساتھ ساتھ ان لفظوں کو بھی اپنا لیا، بلکہ مہذب طبقے میں بھی یہ الفاظ زیادہ استعمال ہوتے ہیں، بھنگی اور بھنگن صرف عوام بولتے ہیں، دلجوئی ہی کے خیال سے مہتر کے کام کے لئے کمانا کا لفظ استعمال ہوتا ہے، کمانا مشقت کی نشانی یا دلیل ہے،

جب کسی مہتر کی جھائی جسے اصطلاحاً ٹھکانا کہتے ہیں، زیادہ ہو جاتی ہے تو وہ کسی کو نوکر رکھ لیتا ہے، اس نوکر کو کمیرا کہتے ہیں، بعض لوگ اپنے یہاں شام کو بھی صفائی کرتے ہیں، اس خدمت کو اصطلاحاً دو وقتی کہا جاتا ہے، میلے اور کوڑے کرکٹ کو گاڑی میں

---

[1] ظفر الرحمٰن دہلوی، فرہنگ اصطلاحات پیشہ وراں، جلد اول [2] ایضاً۔

بھر کر لے جاتے ہیں، اس گاڑی کو کراچی کہا جاتا ہے، وہ چیز (پنجرے کی بنی ہوئی) جس سے میلا اٹھاتے ہیں، پنجہ کہی جاتی ہے، اور جس جگہ میں میلا اور کوڑا کرکٹ ڈالتے ہیں، وہ ڈلاؤ کہلاتی ہے۔

مہتر کا ایک ساتھی بھی ہے جسے خاک روب کہتے ہیں، وہ عمارتوں کا کوڑا کرکٹ صاف کرنے کے علاوہ سڑکوں کا کوڑا کرکٹ بھی صاف کرتا ہے۔ خاک روب کی عورت کو خاک روبن کہتے ہیں، کوڑا کرکٹ ڈالنے کا ایک خاص ظرف ہوتا ہے، جسے سفلدان کہا جاتا ہے،

خیمے اور شامیانے:

محلات اور مکانات مستقلاً رہنے کے لئے ہیں، ان کے علاوہ عارضی مکانات یعنی خیمے اور شامیانے بھی ہماری معاشرتی زندگی کا ایک اہم جزو رہ چکے ہیں، خیمے کو بمبو (تنبو) بھی کہتے ہیں، جو عورتوں کی زبان کا لفظ تھا، لیکن اب عام طور پر بولا جاتا ہے، قدیم زمانے میں میدان جنگ میں خیمے لشکریوں کا گھر ہوتے تھے، امرا اور رؤسا جب سفر پر جاتے تو خیمہ و خرگاہ نہ صرف ان کی آسایش کے لئے بلکہ شان و شوکت کے اظہار کے لئے بھی ان کے ساتھ ہوتے، فارسی کا ایک مشہور شعر ہے جو اسی خیمہ و خرگاہ کی شان و شوکت سے متاثر ہو کر کہا گیا تھا:

منعم بکوہ و دشت و بیاباں غریب نیست ہر جا کہ رفت خیمہ زد و بارگاہ ساخت

(سعدی)

خیمے ایک طرف شاہان وقت اور امرا و رؤسا کی شان و شوکت کے اظہار کا سامان تھے، تو دوسری جانب خانہ بدوشوں اور غریب لوگوں کی زندگی کا سہارا تھے، اور آج بھی کسی حد تک ہیں، اقبال کے مندرجہ ذیل شعر میں اسی کی طرف اشارہ ہے، مسولینی اپنے حریفوں (خصوصاً انگریزوں) کو مخاطب کر کے کہتا ہے،

تم نے لوٹے بے نوا صحرا نشینوں کے خیام
تم نے لوٹی کشتِ دہقاں تم نے لوٹے تخت و تاج

خیمے اور شامیانے کا چلن ہر ملک اور ہر زمانے میں رہا ہے، ہندوستان میں مسلمانوں کے آباد ہو جانے کے بعد اس کا رواج بھی زیادہ ہوا، اور اس میں تنوع اور نفاست بھی پیدا ہوئی، خود ان کے نام اپنے مالک یا موجد کا پتا دیتے ہیں۔ "ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی جلوے" کے مصنف نے صحیح کہا ہے کہ "جن چیزوں کے نام فارسی، عربی و ترکی ہیں، ان کو مسلمانوں کی آوردہ یا وضع کردہ یا تصرف کردہ سمجھنا چاہیے، اور جن چیزوں کے نام ہندی ہیں، وہ ہندوستانی ہیں، جن کو مسلمانوں نے رضا و رغبت کے ساتھ قبول کر کے استعمال کیا، اور اپنے ذوق کی بنا پر ان کی وضع و قطع اور تراش خراش میں کچھ ترمیمیں کرتے رہے"۔[1]

کثرت استعمال کی وجہ سے خیموں کی مختلف قسمیں وجود میں آئیں، ان میں سے بعض یہ ہیں: بارگاہ، خرگاہ، خوابگاہ، دہلیز، سراچہ، سراپردہ، دو آشیانہ، قلندری، بخاری، عجائی، چار طاق، کلال بار، دل بادل، راوٹی، چھولداری، ڈیرا وغیرہ،

جو خیمہ ایک چوب پر تانا جاتا ہے اس کو ایک چوبہ کہتے ہیں اور جو دو چوب پر کھڑا کیا جاتا ہے، وہ دو چوبہ کہلاتا ہے،

چھولداری کا چلن آج بھی عام ہے، لیکن اظہار شان و شوکت کے لئے نہیں بلکہ ضرورتاً، بڑے شہروں، قصبوں اور دیہاتوں میں بھی اور آبادی سے دور، میدانوں میں بھی چھولداریاں مزدوروں کے عارضی گھر کا کام دیتی ہیں، یہ اسٹور روم کا بھی کام دیتی ہیں،

خیمے کی ہماری معاشرتی زندگی میں اہمیت کا اندازہ اس سے بھی ہو سکتا ہے کہ اس کی بنیاد پر محاورے بن گئے ہیں، مثلاً: پیش خیمہ، خیمہ اکھاڑنا، خیمہ کھڑا کرنا، خیمہ باہر نکالنا، (سفر کی تیاری سے پہلے اہتمام خیمہ کی روانگی کا ہونا) وغیرہ،

---

[1] سید صباح الدین عبد الرحمن، کتاب مذکور، ص ۱۴۲۔

خیمے ہی سے ملتا جلتا شامیانہ ہے، جس کا استعمال آج بھی شادی کے موقع پر عموماً ہوتا ہے، اس کی بھی مختلف قسمیں ہیں، جن میں سے چند نیچے دی جاتی ہیں:

شامیانہ، پال، آٹھ کھمبا (کھنبہ)، ہنڈل، نمگیرہ، شبنمی وغیرہ۔

خیمے اور شامیانے سے متعلق چند اصطلاحیں بھی اردو میں عموماً استعمال ہوتی ہیں، مثلاً مندرجۂ ذیل اصطلاحیں:

طناب، بالا، میخ، چوب، بلینڈا (کمر بلا) قنات، سراپردہ، گلو، ٹوپی، بادربہ وغیرہ۔ خیمے کے لوازم رکھنے کے لئے جو بڑا تھیلا ہوتا ہے، اسے خلیطہ (شلیتہ) کہتے ہیں، در اصل یہ خریطے کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔

سواریاں

سواری اولاد آدم کی ضرورتوں میں بھی داخل ہے، اور شان و شوکت کے اظہار کا ایک ذریعہ بھی ہے، لباس، مکان وغیرہ کی طرح سواری میں بھی اس نے کافی تنوع پیدا کیا، پہلے وہ جانور کی پشت پر سوار ہوتا تھا، کچھ آرام کے لئے اور کچھ زینت کی خاطر اس نے جانور کی پشت پر رکھنے کے لئے کچھ سامان بنائے، مثلاً زین، ہودج وغیرہ اور ترقی کی تو گاڑی بنائی، جس کو جانور کھینچتے تھے، پھر موٹی اور بھدی گاڑی میں نفاست پیدا کی، سائنس کی ترقی نے اس کے لئے بائسکل، موٹر بائسکل، ریل، موٹر، ہوائی جہاز وغیرہ ایجاد کئے، ان سواریوں کے ذریعہ اردو زبان کے ذخیرہ میں نئے نئے الفاظ اور ترکیبوں کا اضافہ ہوا جن کا ذکر نیچے کیا جاتا ہے،

گھوڑا:

قدیم زمانے میں جانوروں کی سواری میں گھوڑے، ہاتھی، اونٹ، گدھے، خچر اور ٹٹو کا استعمال زیادہ تھا، ان میں گھوڑے کی سواری خصوصاً زیادہ پسندیدہ اور مقبول تھی، گھوڑا اپنی افادیت کے علاوہ اپنے حسن اور شان اور دبدبے کے لحاظ سے بھی اہمیت رکھتا ہے، وہ اپنے آقا کا وفادار بھی ہے، ان وجوہ سے اس کی اہمیت اور قدر و قیمت اور زیادہ ہوگئی ہے، وہ آدمی کو بہت عزیز ہے، گھوڑے کی ساخت، رنگت اور طبیعت یا استعمال کے لحاظ سے اس کی مختلف قسمیں بنائی گئی ہیں، اور ان کے دلچسپ نام رکھے گئے ہیں، نیچے چند نام مثالاً

درج کئے جاتے ہیں :

آدم چشم، آہو شکم، ابلق، شب دیز، ابیض، فقرہ، ادہم، ختگی، بالو ترا، پچکلیاں، پریشان گوش، تیر گوں، تختہ گردن، جے منگل، در شک منگل، دم کس، دندان گیر، زین پشت، سبزا، سرنگ، سمند، سنجاب، شیر دم، کمیت (کمید)، گاؤ شانہ، گل دار سبزہ، گلدست، لدرا، ماہرو، مرغ پا وغیرہ،[1]

گھوڑے یا گھوڑے کی سواری کے ضمن میں بھی بعض الفاظ اور ترکیبیں ملتی ہیں، جو دلچسپ ہیں، مثلاً،

آنسو ڈھال، وہ بھونری جو گھوڑے کی آنکھ کے کونے کے قریب ہوتی ہے،

دیوبند، دیومن، گھوڑے کی گردن کے نیچے چھاتی کے سرے پر کی بھونری،

دھج بل، گھوڑے کے بازو کے نیچے کی بھونری،

سانپ ناگن، گھوڑے کے ایال کی جڑ کے قریب کی بھونری،

ساعزی، اہل لکھنؤ کی اصطلاح میں گھوڑے کی مقعد کو کہتے ہیں،

ستارا، گھوڑے کی پیشانی پر سفید بالوں کی چتی،

کھیت، وہ مقام جو گھوڑے کے جنم بھوم، پرورش اور نسل کی ترقی کے لئے مخصوص و مشہور ہو،

گل خور، اگاڑی،

کنکھاپاٹ، کنکھجورے کے شکل کی گھوڑے کے پیٹ پر تنگ بندھنے کی جگہ کی بھونری،

ہمیان زر، گھوڑے کی ایک بھونری کا نام جس کو کنٹھ اور کنٹھی بھی کہتے ہیں[2]

گھوڑے کی سواری میں استعمال ہونے والی چند چیزیں، مثلاً چابک، کوڑا، لگام، دہانہ،

---

[1] ان کی وضاحت کے دیکھئے، ظفر الرحمن دہلوی، فرہنگ اصطلاحات پیشہ وراں، جلد پنجم [2] ایضاً

رکاب، ہمیز، چار جامہ، نمدا، فتراک، زین، کاٹھی، زیر تنگ، بالا تنگ، گردنی، چنور، جہوزی، مکھنا وغیرہ عام ہیں، ان کے علاوہ بھی چند چیزیں استعمال ہوتی ہیں، جیسے،

اندھیری، اندھیاری، گھوڑے کی نگاہ کو یکسو رکھنے کے لئے چمڑے کے بنے ہوئے دہانے،

آفتابی، سائباں، راکب پوش سوار کے سر پر سایہ کرنے کی اوٹ،

آویزہ، گھوڑے کے چہرے کے ساز میں ماتھے پر لٹکنے والا مخروطی شکل کا آویزہ،

کلغی، گھوڑے کے چہرے کے ساز کا زیور،

سینہ بند، گھوڑے کے سینے کا ساز،

اوگی، لمبا گاؤدم کی شکل کا چابک جو نئے گھوڑے کی سدھائی میں استعمال ہوتا ہے،

ہنسلا، گھوڑے کی چھاتی کا ساز،

بنگلہ، گھوڑے کے ساز کا وہ حصہ جو کمر پر کسا جاتا ہے،[1]

گھوڑے کے رہنے کی جگہ کے لئے مختلف الفاظ استعمال ہوتے ہیں، جیسے اصطبل، طویلہ، گھڑ تھان، گھڑ سال وغیرہ، جہاں باندھا جاتا ہے، اسے تھان کہتے ہیں، اسی سے محاورہ بنا ہے، تھان کا بڑا گھوڑا، یعنی وہ گھوڑا جو کسی کو تھان کے قریب نہ آنے دے، محاورے میں بد دماغ یا تنگ مزاج آدمی کو کہتے ہیں، گھوڑے کے کھانے کے لئے توبڑا بنایا گیا ہے، جہاں اس کی فروخت ہوتی ہے، اسے گھڑ منڈی یا نخاس کہتے ہیں،

گھوڑے کی نگہبانی اور پرداخت کے لئے آختہ بیگی، داروغہ اصطبل، اور سائیس ہیں،

گھوڑوں کی چراگاہ کا افسر میر آخور کہلاتا ہے،

چنا گھوڑے کی پسندیدہ خوراک ہے، دلے ہوئے چنے یا جو کے راتب کو جو گھوڑے کو

---

[1] ظفر الرحمٰن دہلوی، فرہنگ اصطلاحات پیشہ وراں، جلد پنجم،

دیا جاتا ہے، اسپلا یا ارداد کہتے ہیں،

گھوڑا جہاں اپنی رعنائی، چستی، چالاکی اور وفاداری کے لئے مشہور ہے، وہیں وہ اپنی مختلف انداز کی چالوں کے لئے بھی پسند کیا جاتا ہے، نیچے اس کی چند چالوں کے نام مع تشریح دئے جاتے ہیں:

شہ گام — ایک عمدہ چال جس میں گھوڑا لمبا اور زمین سے ملا ہوا قدم اٹھاتا ہے،

فلک سیری، پوئیا، } تیز رفتار چال،
سرپٹ چوکڑی، } "

دلکی، } دھیمی چال،
راہوار، روند، } دھیمی چال،

کودیتی، — دھیمی چال،

دحالی، — نہایت دھیمی چال،

لنگوری، — پوئیا چال کے مشابہ، نمائشی چال،

لنگڑی، — تین پیروں سے چلنے کی نمائشی چال[۱]،

گھوڑے کی افادیت، اہمیت اور مقبولیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس کے تعلق سے بہت سے محاورے بن گئے، مندرجہ ذیل محاورے عام ہیں،

آٹھوں گانٹھ کمیت، پانچوں عیب شرعی، باگ ڈور یا باگ ڈور سنبھالنا، دولتی جھاڑنا، کنوتیاں بدلنا (جھاڑنا دبانا)، الف ہونا، اگاڑی پچھاڑی تڑا کر بھاگنا، گھوڑے بیچ کر سونا، گھوڑے دوڑانا وغیرہ،

---

[۱] ظفر الرحمٰن دہلوی، فرہنگ اصطلاحات پیشہ وراں، جلد پنجم،

مذکورۂ بالا عام محاروں کے علاوہ چند اور محاورے نیچے نقل کئے جاتے ہیں، جو گھوڑے کے ساتھ مخصوص ہیں،

گھوڑا لانگنا، نئے گھوڑے پر پہلی بار سوار ہونا،

گھوڑا ابھر جانا، گھوڑے کا بند بند تھک جانا،

گھوڑا پھینکنا، گھوڑے کو کسی چیز کے پیچھے دوڑانا،

گھوڑا جمنا، گھوڑے کا کودنے کے واسطے رگ جانا،

گھوڑا چمکانا، گھوڑے کو تیز رو کرنا،

گھوڑے کی شادی کرنا، گھوڑے کو بیچنا،[۱]

گھوڑی کی نسبت سے بھی چند محاورے ہیں، مثلاً

گھوڑی چڑھنا، تندرست ہو کر کسی مقدس مقام پر دھوم دھام سے شکریۂ صحت ادا کرنے جانا،

گھوڑی چڑھانا ختنے کی رسم ادا کرنا،[۲]

گھوڑے کی اساس پر بنی ہوئی چند کہاوتیں،

گھوڑا، گھڑسال ہی میں قیمت پاتا ہے،

گھوڑوں کو گھر کتنی دور،

گھوڑے جوڑے کی خیر،

گھوڑے کو لات اور آدمی کو بات،

گھوڑے گھوڑے لڑیں اور موچی کا زین ٹوٹے،

---

[۱] ظفر الرحمٰن دہلوی، فرہنگ اصطلاحات پیشہ وراں، جلد پنجم [۲] ایضاً،

ہاتھی:

ہاتھی سواری سے زیادہ شانِ امارت کے اظہار کا ایک ذریعہ تھا، اب اس کا استعمال بہت کم ہو گیا ہے، اس کے مختلف وصفی نام رکھے جاتے ہیں، جو اس کے مزاج، عادت اور خو بو کے تعلق سے ہوتے ہیں، مثلاً، بال، بامن، برہمن مزاج، بمزاج کھتری، دیو مزاج، گندھرب مزاج، سود مزاج، راجھس مزاج، ساریہ بھوم وغیرہ۔[1]

قدیم زمانے میں ہاتھی کی آرایش کے لئے ان کو زیورات پہنائے جاتے تھے جن کے نام یہ تھے:

چوراسی، قطاس، بتیا، گھنٹی، پائے رنجن، بنگری۔[2]

سر اور مونڈ کی آرایش کے لئے ایک خوبصورت جامہ ہوتا، جس کو پاکھر کہا جاتا، پاکھر کے اوپر ایک مرصع پوشش ڈالی جاتی، جس کو گج جھنپ کہتے، ان میں ایک پیشانی بند ہوتا، جو زربفت جیسے قیمتی کپڑے سے تیار کیا جاتا، اس کے دامن میں مور چھل لٹکتے رہتے، جو ہوا میں ہلنے کی وجہ سے بہت خوشنما نظر آتے، ہودج کے نیچے جھولیں لٹکی رہتیں، جو قیمتی کپڑوں کی بنائی جاتیں۔[3]

ہاتھی کے لئے مختلف قسم کی ہلکی اور وزنی زنجیریں استعمال ہوتی تھیں، جن کے نام حسبِ ذیل ہیں:

دھرنہ، انڈو، بیڑی، گدھ بیڑی، لوہ لنگڑی وغیرہ۔[4]

مختلف ڈوریاں بھی استعمال ہوتی تھیں، جیسے کلاوہ، لٹھی، ڈوڑ، بچھوہ وغیرہ۔[5]

ہاتھی کی سواری میں ذیل کی چیزیں بالعموم استعمال ہوتی ہیں:

آنکس، مہاوت کے ہاتھ کا بھالے نما آہنی ٹکڑا، جس کی نوک سے ہاتھی کی رفتار کو

---

[1] ظفر الرحمٰن دہلوی، فرہنگ اصطلاحات پیشہ وراں، ج ۵ [2] سید صباح الدین عبد الرحمٰن تمدنی جلوے، ص ۱۳۴، [3] ایضاً، [4] ایضاً، [5] ایضاً،

قائم رکھنے کے لئے اس کی گردن پر اور کانوں کے برابر گدیا جاتا ہے،

بان انداز — سواری میں ہاتھی کے ساتھ رہنے والے ملازم جو اپنے ساتھ آتشی تیر رکھتے ہیں، تاکہ سواری کے موقع پر راستے میں اگر ہاتھی مست ہو جائے یا مستی کے آثار معلوم ہوں، تو یہ گروہ آتشی تیروں سے اس کو ڈرا کر قابو میں رکھنے کی کوشش کرے،

گجباگ — ہاتھی کی باگ ڈور،

گج بندھن، — ہاتھی کو باندھنے کی رسی،

چرخی مار، — جنگلی اور وحشی ہاتھی سدھانے والے ملازم[1]،

ہاتھی کی مناسبت سے چند محاورے بھی بن گئے ہیں،

دروازے پر ہاتھی جھولنا، ہاتھی کے ساتھ گنڈا چوسنا، یا ہاتھیوں سے گنے کھانا، ہاتھی کے دانت بٹھانا، (ناممکن کام کرنا) وغیرہ،

چند مثلیں جو اس قوی الجثہ جانور نے اردو زبان کو دی ہیں،

ہاتھی پھرے گانو گاؤں جس کا ہاتھی اس کا ناؤں، ہاتھی کے پاؤں میں سب کے پاؤں، ہاتھی کے دانت دکھانے کے اور ہیں، کھانے کے اور، ہاتھی نکل گیا دم اٹکی رہ گئی، ہاتھی مرے پہ بھی سوا لاکھ کا، ہاتھی ہزار لٹے پھر بھی لاکھ من کا،

اونٹ:

اونٹ عموماً ریگستانی علاقوں میں پایا جاتا ہے، ہندوستان میں راجپوتانے میں ہوتا ہے یہ زیادہ تر بار برداری کے کام آتا ہے لیکن سواری کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے اور گاڑی بھی

---

[1] ظفر الرحمن دہلوی، فرہنگ اصطلاحات پیشہ وراں، جلد پنجم،

کھینچتا ہے، اب اونٹ گاڑی کا چلن نہیں رہا، اونٹ کی سواری کرنے والے کو شتر سوار اور اونٹنی سوار، اور سانڈنی سوار کہا جاتا ہے، تیز رفتار اونٹ کو سانڈ کہتے ہیں، سانڈنی اس کا مونث ہے، اونٹ ہانکنے والے کو شتربان اور ساربان کہتے ہیں، اونٹ کے بچے کو بوتا کہا جاتا ہے، اونٹ کی رفتار کو تیز یا تیز تر کرنے کے لئے ترنم کے ساتھ اشعار پڑھے جاتے ہیں، اسے عربی میں حدی کہتے ہیں، یہ لفظ اردو میں بھی مستعمل ہے، حدی پڑھنے والے کو حدی خواں کہتے ہیں،

اونٹ پر بیٹھنے کے لئے جو نشست بنائی جاتی ہے، اسے کجاوہ اور رحل کہا جاتا ہے، کجاوے کی ایک بہتر صورت محمل ہے، جو اردو میں بہت عام ہے، محمل نشیں بھی اسی قدر عام ہے،

اونٹ کی سواری کے ضمن میں مہار، نکیل، دامن (اونٹ کے پیر میں باندھنے کی رسی)، کاٹھی وغیرہ، عام طور سے مستعمل ہیں، شتر بے مہار، مشہور محاورہ ہے، جو آزاد اور بے فکرے آدمی کے لئے استعمال ہوتا ہے،

گھوڑے اور ہاتھی کی طرح اونٹ کے تعلق سے بھی بہت سی کہاوتیں مشہور ہوگئی ہیں، مثلاً،

اونٹ رے اونٹ تیری کونسی کل سیدھی، اونٹ کے منہ میں زیرا، اونٹ دیکھئے کس کل (کروٹ) بیٹھے (بیٹھتا ہے)، اونٹ کے گلے میں بلی، اونٹ سے بڑے اور نام چھوٹے خاں وغیرہ،

بہل (بہلی):

اب اسے بیل گاڑی بھی کہتے ہیں، بلکہ یہی نام زیادہ رائج ہے، قدیم زمانے سے اس کا رواج رہا ہے، اسے دو بیل کھینچتے تھے، ایک بیل کی بھی بہلی ہوتی ہے، لیکن کم، اسی کی ایک شکل چھکڑا بھی ہے، جو نسبتہً چھوٹی ہوتی ہے، پہلے بہلی کو دوسرے جانور بھی کھینچتے تھے، نظیر

اکبر آبادی نے گھوڑے، ہاتھی، اونٹ، ہرن اور بکری کے نام لئے ہیں:

گھڑ بہل فیل بہل، شتر بہل راہ دار ۔۔۔ ہرنوں کی بہل، بکری کی بہل گھنگھرو دار

مالک چڑھا جو موت کی ڈولی پر ایک بار ۔۔۔ پھر بہلیاں نہ بہل نہ جھنکار نے پکار

جب چار کاندھے پر ہوئیں ہماری سواریاں

جھک مارتی یہ رہ گئیں ساری سواریاں

رتھ:

بہلی کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے، اس کے اوپر ایک برجی بنی ہوتی ہے۔ اسے بیل بھی کھینچتے تھے، اور گھوڑے بھی، سفر کے علاوہ رتھ جنگ میں بھی کام آتی تھی، رتھ کا استعمال دیہاتوں میں اب بھی ہے، لیکن بہت کم۔

گاڑی اور رتھ کے ہانکنے والے گاڑی بان اور رتھ بان سے ہر شخص واقف ہے،

دوسری قسم کی گاڑیاں:

زمانے کی ترقی اور ہندوستان میں انگریزوں کی آمد کے ساتھ نئی نئی قسم کی گاڑیاں وجود میں آئیں،

اکا، یکہ، یکا، جھٹکا، تانگا، بگھی، پالکی گاڑی، سیج گاڑی، شکرم، بگھی، ریگی، فٹن، ٹم ٹم، لینڈو، وکٹوریا، کھڑکھڑی وغیرہ، عام بول چال کے علاوہ اردو نثر و نظم دونوں میں اپنی مستقل جگہ بنا چکی ہیں، ان گاڑیوں نے جہاں آدمی کے جسم کو آرام پہنچایا، وہیں اردو زبان کے خزانے میں قیمتی لفظی سکوں کا اضافہ کیا، جیسے مثال کے طور پر الفاظ یا اصطلاحیں دی جاتی ہیں،

بنگلہ ۔۔۔ رتھ کی برجی نما چھتری یا چھت،

بھونرا ۔۔۔ وہ لکڑی جس میں پٹیلے کا دھرا بٹھایا جاتا ہے،

جوڑی — بیلوں یا گھوڑوں کی جوڑی، مراد گاڑی۔

خنجری — پہیے کے مرکزی حصے کے منہ پر خوبصورتی اور مضبوطی کے لئے کسی چمکدار دھات کا لگا ہوا حلقہ

خواصی — بگی یا کسی گاڑی کے پیچھے گاڑی کے نگہبان یا خادم کے بیٹھنے کو بنی ہوئی جگہ۔

ٹھوکر — پائدان، رکاب: گاڑی کے پہیوں سے اڑنے والی کیچڑ سے بچاؤ کی آڑ۔

چھاج — گھوڑا گاڑی میں گاڑی کے ہانکنے والے کے بیٹھنے کی جگہ کے سامنے کی آڑ۔

دوسری سواریاں:

مذکورۂ بالا گاڑیوں کے علاوہ پہلے ایسی سواریاں بھی تھیں جنھیں آدمی اٹھا کر چلتے تھے اور ان کی قسمیں کافی تھیں۔ ان میں سے بعض کا استعمال اب بھی تھوڑا بہت پایا جاتا ہے، ذیل میں ان کے نام دیئے جاتے ہیں:

پالکی، ڈولی، میانہ (فینس)، تام جھام، چنڈول (چوڈول)، چوپہلا، سکھپال، محافہ، میانہ، بوچہ، ڈنڈی، ڈولی، مہاڈول، سنگھاسن، ہوادار، تخت رواں وغیرہ۔

پالکی، ڈولا، سکھپال وغیرہ کے اوپر ایک مخصوص قسم کا کپڑا ڈال دیتے ہیں، اسے اوہار کہا جاتا ہے۔ اس خیال سے کہ پردہ نشین ہوا سے اڑنے نہ پائے اس کے گرد ایک رسی باندھ دیتے ہیں، اسے تور کہا جاتا ہے۔

مذکورۂ بالا سواریوں میں ڈولی خصوصاً زیادہ استعمال ہوتی تھی، یہ اہل دہلی کی ایجاد ہے، ابتدا میں یہ عورتوں کے لئے مخصوص تھی، آگے چل کر مرد بھی اسے استعمال کرنے لگے، اب اس کا چلن تقریباً ختم ہو چکا ہے، لیکن یہ ہماری معاشرتی زندگی کی ایک اہم چیز بن گئی تھی، چنانچہ دہلی میں ڈولی روزمرہ بن گیا تھا، جو مرض علاج بتاتا تھا، نشاط کے مندرجہ ذیل شعر سے بھی اندازہ ہوتا ہے، کہ ڈولی عورتوں میں کس قدر مقبول تھی۔

کچھ نہیں معلوم کونسا میلا ہے آج جاتیاں ہیں جو کچا کچ ڈولیوں پر ڈولیاں

پالکی، نالکی، چوپہلا، ڈولی وغیرہ نے ایک طرف مردوں اور عورتوں کو آرام و آسائش پہنچائی تو دوسری طرف اس کی بدولت اردو زبان کے ذخیرے میں نئے نئے الفاظ داخل ہوئے ذیل میں کہاروں کی چند اصطلاحات دی جاتی ہیں،

بیساکھی کہاروں کی لکڑی جو ڈولی یا پینس اٹھاتے وقت وہ ہاتھ میں رکھتے ہیں،

جوڑی دار پالکی اٹھانے والا ساتھی کہار،

چمک کسی خطرے سے آگاہ کرنا،

چوماسی، کیچڑ،

دھمک، معمولی گڑھا،

سری گوبر،

لوٹن، راستے میں پڑی ہوئی بے ڈول چیز،

کشتی:

کشتی کسی زمانے میں آدمی کی مقبول اور مفید سواریوں میں تھی، اس کی مقبولیت و افادیت کا اندازہ اس کی متعدد قسموں سے لگایا جاسکتا ہے، نیچے چند قسموں کے نام لکھے جاتے ہیں،

آبدوز، ڈبکنی کشتی، اُتنا، اگن بوٹ، الانگ، بادبانی کشتی، بجرا، پلوار، پن سوار، ڈونگا، ڈونگی، ڈبنگی، مچھوا، مور پنکھی، نواڑا وغیرہ،

کشتی کے متعلقات کے نام بھی دلچسپ ہیں مثلاً

بادبان، چپو، پون پرچھا، سکان، سہارا، عرشہ، مستول، لنگر، لوہ لنگر، ہتھل بیڑا، بندرگاہ، گھاٹ باری، ناخدا، اکاس ڈیوٹ وغیرہ۔

ے ظفر الرحمٰن فرہنگ مذکور جلد پنجم

کشتی بانی کی چند اصطلاحیں:

اَچل، دریا کے چڑھاؤ کی طرف کشتی رانی،

بند پانی، جھیل یا تالاب کا پانی،

مینڈھا، بہاؤ کے مخالف ہوا سے اٹھتی ہوئی لہر،

پار (پاڑ) کشتی کے ڈھانچے کی تختہ بندی ؎

جدید سواریاں:

یورپ کی سائنسی ترقی کے ذریعے جو نئی نئی گاڑیاں وجود میں آئیں، وہ ہندوستان میں انگریزوں کی آمد کے بعد یہاں بھی پہنچیں، ان سواریوں کے نام اردو نے بجنسہٖ قبول کر لیے، مندرجۂ ذیل سواریوں کے نام اردو میں عام ہیں،

ریل، ٹرین، ہوائی جہاز، ایرپلین، ہیلی کاپٹر، موٹر، کار، ٹیکسی، اسکوٹر، بائسکل، موٹر بائیسکل، رکشا، آٹو رکشا وغیرہ،

ریل یا ٹرین کے ضمن میں میل (ڈاک گاڑی)، ایکسپریس گاڑی، پسنجر گاڑی، لوکل گاڑی وغیرہ ہر اردو داں کی زبان پر ہیں،

انجن کی تین قسمیں ہیں، (۱) اسٹیم انجن (۲) الکٹرک انجن (۳) ڈیزل انجن، اردو نے ان لفظوں کو اپنے اندر جذب کر لیا ہے،

ریل یا ٹرین کے متعلقات کے مندرجۂ ذیل نام بھی اردو میں ضم ہو چکے ہیں:

اسٹیشن، پلیٹ فارم، ٹکٹ، پاس، انجن، سگنل، ڈرائیور، موٹر مین، گارڈ، [illegible]

؎ ظفر الرحمن دہلوی، فرہنگ اصطلاحات پیشہ وراں، جلد پنجم۔

ٹی سی، ٹی ٹی آئی، گنڈکٹر، سیٹ، برتھ، تھرڈ کلاس، ٹائم ٹیبل، اسٹیشن ماسٹر، اسسٹنٹ اسٹیشن ماسٹر، بکنگ آفس، بکنگ کلرک وغیرہ،

جہاز کے قلی، خلاصی، کپتان، کیبن، ڈیک، لائٹ ہاؤس، وغیرہ اب اردو الفاظ بن چکے ہیں،

ہوائی جہاز کا ایرڈروم، پائلٹ، ایر ہوسٹس، کنٹرول ٹاور وغیرہ بھی اردو کے لئے بیگانے نہیں ہیں۔

شعراء نے بھی بہت سے انگریزی الفاظ کا استعمال کیا ہے، مثلاً

خالی از فیض نہ دیکھی تری خدمت بھتی
ہووے سلطان جہاں جس کو تو دلیے پرمٹ
(مصحفی)

ترے رخسار تاباں کا کبھی جو عکس پڑتا ہے
فریم آئینے کی بنتی ہے ہالہ ماہ کامل کا
(ناسخ)

الٰہی جان کی خیر کرنا — فرنگی زاد دیکھے فیر کرنا
(واجد علی شاہ)

جس طرف دیکھئے بیلے کی کھلی ہیں کلیاں — لوگ کہتے ہیں کہ کرتے ہیں فرنگی کونسل
(محسن کاکوروی)

بانیٔ مدرسہ وہ سید والا گہر — وہ مینجنگ کمیٹی کے معزز ممبر
(شبلی)

یہ ٹیلیفون پہ دی سالِ نو کی تہنیت کس نے
تمنا رقص کرتی ہے، تخیل گنگناتا ہے

(سردار جعفری)

مشاعرے:

مشاعرے ہندوستان کی تمدنی زندگی میں خاص اہمیت کے حامل رہ چکے ہیں، کسی زمانے میں ہر امیر کا دیوان خانہ علم و ادب کی محفل ہوتا تھا معاصرانہ چشمکیں، حاضر جوابی، بدیہہ گوئی، مجلس کی رونق کو بڑھانے کا سامان تھیں، پہلے سے مراختہ یا مجلس ریختہ کہا کرتے تھے، مولوی عبدالحق نے مشاعرے کی اہمیت پر حسب ذیل روشنی ڈالی ہے،

وہ اس زمانے (انیسویں صدی) کی سب سے بڑی علمی اور مہذب مجلسیں مشاعرے تھے، جن کے لئے بڑے بڑے اہتمام کئے جاتے تھے، اس کے خاص خاص آداب تھے.... باکمال سخنوروں کو دل کھول کر داد دی جاتی تھی، کبھی کبھی بحث مباحثے ہوتے ہوتے لڑائی جھگڑے ہو جاتے اور تھکا فضیحتی تک نوبت پہنچ جاتی تھی، نوجوان ان مشاعروں میں شریک ہوتے اور اپنے کانوں سے تحسین و آفرین کے نعرے سنتے تھے جو شعرا کے لئے بڑی داد اور سب سے بڑا انعام تھا، تو ان کے دل میں بھی امنگ پیدا ہوتی تھی، کسی استاد کے پاس حاضر ہوئے، شاگرد ہو گئے، اور شعر کہنا شروع کر دیا..... یہ مشاعرے درحقیقت شاعر گر تھے [۱]۔

مشاعرے شعرا کی حاضر جوابی اور بدیہہ گوئی کے ذریعے مجلس کی رونق کو بڑھاتے تھے، بدیہہ گوئی کی دو مثالیں نیچے لکھی جاتی ہیں:

مولوی عبدالحق نے بساتین السلاطین کے حوالے سے لکھا ہے کہ ایک دن بادشاہ (علی

---

[۱] میرزا علی لطف، گلشن ہند، مقدمہ، ص ۲۰ - ۱۹،

عادل شاہ) محل میں رونق افروز تھے اور حوض میں فوارہ عجب بہار دے رہا تھا، بادشاہ کی زبان سے بے ساختہ یہ مصرع نکلا:

اڑتا سو یو فوارہ پانی کا کیا چھل ہے،

ملا نصرتی نے فوراً جواب میں یہ مصرع کہا:

تجھ شاہ پر اڑانے موتی کا مورچھل ہےؔ،

بہادر شاہ موسم برسات میں قطب شاہ گئے، مرزا فخرو اور استاد ذوق ساتھ میں تھے، چاندنی رات تالاب کے پانی کو سیمیں بنا رہی تھی، مرزا فخرو نے کہا،

چاندنی دیکھے اگر وہ مہ جبیں تالاب پر

ذوق سے مصرع لگانے کی فرمائش ہوئی، انھوں نے کہا:

تاب عکس رخ سے پانی بھر دئے مہتاب پر

ؔ نصرتی، گلشن عشق، ص ۱۹ - ۲۰،

رسم و رواج

۱۔ ولادت، بچپن وغیرہ کی رسمیں:

ہر قوم کی معاشرتی زندگی کی ایک اہم اور نمایاں خصوصیت اس کی رسمیں ہیں جو متوسط اور نچلے طبقہ میں خصوصاً انہیں زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ اہل ہند کے یہاں بھی بیسیوں رسمیں ہیں، مسلمان اس ملک میں وارد ہوئے، تو اپنے ساتھ اسلام کا سیدھا سادہ طریق زندگی لے کر آئے، لیکن یہاں آباد ہو جانے کے بعد انھوں نے بھی آہستہ آہستہ برادران وطن کی بہت سی رسموں کو اپنا لیا، بہت سی رسمیں ان کی اصل شکل میں لیں، اور بہت سی رسموں میں رد و بدل یا اضافے کئے۔ مثلاً ہندوؤں میں مذہباً یہ طریقہ ہے کہ مردے کی جلی ہوئی ہڈیوں اور راکھ کو تیسرے دن گنگا میں بہا دیتے ہیں، اس سے مسلمانوں نے فاتحہ سوم کو رواج دیا، فاتحۂ سوم کو پھول بھی کہا جاتا ہے، کیونکہ اہل ہنود مردے کی جلی ہوئی ہڈی کو پھول بھی کہتے ہیں، شادی بیاہ کی ساری رسمیں ہندوانہ ہیں، بچے کی ولادت کے سلسلے میں جتنی رسمیں ہیں، سب ہندوانہ ہیں، صرف عقیقہ ایک اسلامی رسم ہے، تو ہمات کے ضمن کی ساری رسمیں ہندوانہ ہیں، میلے، تہوار وغیرہ خالص ہندوستانی ہیں، جن میں مسلمانوں نے بھی اپنی معاشرت میں جذب کر لیا ہے، سید احمد دہلوی نے دونوں قوموں کے اس لطیف و خوشگوار اتحاد کے چار سبب بتائے ہیں، جنھیں ذیل میں اختصار کے ساتھ دیا جاتا ہے۔

پہلا سبب :۔ مسلمان یہاں مجرد آئے، اور یہاں کے نومسلموں سے شادیاں کیں، ان نومسلم عورتوں کی گھٹی میں ہندوانہ رسمیں پڑی تھیں، اس لئے ان کی اولاد نے بھی ان رسموں کو قبول کیا،

دوسرا سبب :۔ آدمی جہاں رہ پڑتا ہے، وہیں کی باتیں، رسم ورواج، بول چال، طور طریق یہاں تک کہ کھانا، اور لباس بھی وہیں کا اختیار کر لیتا ہے، اس لئے مسلمانوں نے اہل ہند کی بہت سی باتیں اختیار کر لیں،

تیسرا سبب :۔ اکبر نے استحکام سلطنت اور خلوص و محبت بڑھانے کی خاطر ہندی مراسم کو اختیار کر لیا تھا،

چوتھا سبب :۔ اکبر نے راجپوتوں سے ناتا بھی کر لیا تھا، اس لئے ہندی (ہندوانہ) رسمیں برابر جاری ہیں[1]

ابن آدم کی بنائی ہوئی رسموں کے بارے میں مذہبی نقطۂ نگاہ سے چاہے جو رائے قائم کی جائے، انھوں نے بہر حال اردو الفاظ کے ذخیرے میں اضافہ کیا ہے،

بچے کی ولادت سے لے کر اس کے سن بلوغ کو پہنچنے تک، بہت سی رسمیں ادا کی جاتی ہیں، چند رسمیں ولادت سے پہلے کی بھی ہیں، مثلاً ستوانسا، جب ساتواں مہینہ ہوتا ہے تو دودھیا عورت کو نہلا دھلا کر اور خوب بنا سنوار کر اس کی گود میں منڈیں، سات ترکاریاں، میوہ، ناریل، دو طاقی بہنوں کے نیگ کے روپے وغیرہ ڈال دیتی ہیں، اس سے غرض یہ ہوتی ہے کہ اس کی گود بال بچوں سے ہری بھری رہے، اور اس کو اچھا پھل ملے[2]، اس رسم کو گود بھرنا کہتے ہیں،

---

[1] رسوم دہلی، تمہید ص ۳۹ - ۳۸، [2] ایضاً۔

نوماسا:

جب نواں مہینہ شروع ہوتا ہے، تو دولھن کے میکہ سے دولھن کا جوڑا، کنگھی، مسی، وغیرہ میوہ پنجیری کے روپے وغیرہ بھیجے جاتے ہیں، رشتے دار عورتیں جمع ہوتی ہیں، اور ستواسے کی طرح دو جیا عورت کی گود بھری جاتی ہے، بعض جگہوں میں یہ رسم ہے، کہ زچگی سے پہلے دولھن دودن کے لئے میکے چلی جاتی ہے، اسے پالو بھرنا کہا جاتا ہے،

مریم کا پنجلہ:

ایک جنگلی جڑی جس کو بچہ پیدا ہونے کے وقت پانی میں بھگویا جاتا ہے، اس خیال سے کہ اس کے اثر سے بچہ آسانی اور جلدی سے پیدا ہو جاتا ہے،

کالا دانہ:

ایک قسم کے پودے کے بیج جو زچہ خانہ میں جلائے جاتے ہیں، ان کا دھواں ہوا کو صاف کرتا ہے،

کلاوہ:

بچے کے پیدا ہوتے ہی اس کے نال کو کلاوے سے باندھ کر کاٹ دیتے ہیں، اور کلاوہ گردن میں لٹکا دیتے ہیں، کلاوہ سرخ اور زرد رنگ کا گنڈے دار رنگا ہوا، سوت ہے، جو شادی بیاہ میں تھیلیوں، مٹکوں وغیرہ پر باندھا جاتا ہے،

آنول نال:

کٹا ہوا نال گھر میں گاڑا جاتا ہے، لیکن جب عورت کے بچے نہیں جیتے وہ گھر سے باہر بھی دبا دیتی ہے،

جاپ:

ایک رسم جس میں ہندو عورتیں مٹھائی، ترکاری اور بچے کے پوتڑے

لے کر گاتی بجاتی ہوئی آتی ہیں،

قصابہ:

جب بچہ پیدا ہوتا ہے، تو پہلے اسے نہلایا جاتا ہے، پھر سر کو چاروں طرف سے دبا کر گول کر دیتے ہیں، اور ایک سموسہ نما رومال اسے باندھ دیتے ہیں، اس رومال کو قصابہ کہتے ہیں،

اذان، تھالی:

قصابہ باندھنے کے بعد مسلمان بچے کے داہنے کان میں اذان دی جاتی ہے، اور بائیں کان میں اقامت کہی جاتی ہے، ہندوؤں کے یہاں تھال بجائی جاتی ہے،

گھٹی:

نہلانے اور اذان دینے کے بعد بچے کو شہد چٹایا جاتا ہے، اور اس کے بعد پیٹ صاف کرنے کی غرض سے گھٹی ایک مرکب دوا پلائی جاتی ہے، جسے گھٹی کہتے ہیں، اسی سے محاورہ بنا ہے' فلاں بات تو اس کی گھٹی میں پڑی ہے،

جچا گیری (زچہ گیری):

ہندوستان کے بعض علاقوں خصوصاً دہلی میں جس دن بچہ پیدا ہوتا ہے، زچے کو رات میں سونے نہیں دیا جاتا، تاکہ خون مستانہ جائے، عورتیں رات بھر جاگتی اور گاتی ہیں اس گیت کو جچا گیری کہا جاتا ہے[1]،

گیت:

ولادت کے تیسرے دن بچے کی پھوپھی زچے کی چھاتی اور بالوں کی لٹ دھوتی ہے، جس کا اسے نیگ ملتا ہے، اس موقع پر دوھالی بہن کی طرف سے گیت گایا جاتا ہے، مثلاً۔

---

[1] سید احمد دہلوی، رسوم دہلی، ص ۴۹،

بیرن بھیا میں تیری ماں جائی ہو لڑ سن کر بدھاوا لے کر آئی

بیرن بھیا میں تیری ماں جائی

چھاتی دھوئی کٹوری لوں گی تو نبادہ لائی ربیا

پانو دھلن کو چیری لوں گی تو خصم چڑھن کو گھوڑا ...

بدھاوا:

بچہ پیدا ہونے کی مبارک باد اور مبارک باد کے گیت کے علاوہ مختلف رشتہ داروں کو جو انعام دیا جاتا ہے، اسے بدھاوا کہتے ہیں،

چھٹی:

پیدائش کے چھٹے دن زچے اور بچے کو چھٹی نہلاتے ہیں، اس دن بڑی خوشی منائی جاتی ہے،

محل میں ہوئی جو چھٹی کی خوشی لبِ بام پر کوسِ عشرت بجا (مصحفی)

عقیقہ:

اسلامی رسم بلکہ سنت ہے، چھٹی کے دن بچے کا سر مونڈا جاتا ہے اور اس کے بالوں کے وزن کے برابر چاندی یا سونا مسکینوں کو تقسیم کیا جاتا ہے، لڑکی ہو تو ایک بکرا، اور لڑکا ہو تو دو بکرے قربان کئے جاتے ہیں:

تارے دکھانا:

چھٹی نہانے کے بعد زچے کو رات میں تارے دکھائے جاتے ہیں، وہ بچے کو گود میں اور قرآن شریف سر پر رکھ کر آسمان کی طرف دیکھتی اور چوکی پر کھڑی ہو کر سات تارے گنتی ہے،

سلہ سید احمد دہلوی، رسوم دہلی، ص ۸ ـــ ۴۴،

مرگ مارنا:

دہلی کی رسم ہے، زچہ تارے دیکھنے جاتی ہے، تو بچے کا باپ تیر کمان لے کر زچہ کے پلنگ پر کھڑا ہو جاتا ہے، اور بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھ کر چھت میں تیر لگا کر گویا فرضی مرگ (شیر) مارتا ہے۔[1]

شاہ نصیر نے ایک موقع پر جب بہادر شاہ کے یہاں شہزادہ پیدا ہوا تو اس طرح اس رسم کو ادا کیا۔

دہیں پھر شاہ نے یہ رسم کی واں پھپر کھٹ سر قدم رکھ ہو کے شاداں

ادا کر حرف بسم اللہ سارا کمان و تیر لے کر مرگ مارا[1]

چوبہ چکھانا:

یہ بھی دہلی کی رسم ہے، زچہ تارے دیکھنے کے بعد پلنگ پر آ بیٹھتی ہے، پلنگ کے آگے دستر خوان بچھایا جاتا ہے، اور ایک چوکی پر تورہ چنا جاتا ہے، اس میں پکی ہوئی سات ترکاریاں اور مختلف طرح کے کھانے ہوتے ہیں، سات سہاگنوں کے ساتھ مل کر زچہ ذرا ذرا سا چکھ لیتی ہے، اسے چوبہ چکھانا کہتے ہیں۔[2]

رت جگا:

عورتوں نے خوشی کے موقع پر جاگنے کا نام رت جگا رکھ لیا، چھٹی کے موقع پر بھی رت جگا کرتی ہیں، لکھنؤ میں اسے خدائی رات کہا جاتا ہے،

بگیر بچہ:

دہلی کی رسم ہے جو مغلوں سے لی گئی ہے، چھٹی کے دن زچے کو تارے دکھانے کے بعد ادا کی جاتی ہے، دہلی کے شاہی خاندان میں یہ رسم اس طرح ادا کی جاتی تھی کہ سوا پانچ سیر کا میٹھا روٹ زمین لال کر کے پکاتے تھے، روٹ کے بیچ سے خالی کر کے صرف گردہ رہنے دیتے، اور اس کے اوپر

---

[1] سید احمد دہلوی، رسوم دہلی، ص ۵۸ [2] ایضاً ص ۵۹

ننگی تلواریں اور دائیں بائیں تیر باندھ کر لٹکا دیتے، سات سہاگنیں حلقہ باندھ کر کھڑی ہو جاتیں، ایک عورت روٹ کے گردے میں سے بچے کو دیتی اور کہتی، بگیر بچہ، دوسری اللہ نگہبان بچہ کہہ کر لے لیتی اور اپنی ٹانگوں میں سے بچے کو نکال کر تیسری سے کہتی، بگیر بچہ، اسی طرح بچے کو روٹ کے حلقے اور ٹانگوں میں سے نکالتی تھیں۔[1]

چھوچھک:

مذکورہ بالا رسموں کے علاوہ ایک رسم یہ بھی ہے کہ چھٹی کے دن دولھن کے میکے سے کچھ سامان آتا ہے، اسے چھوچھک کہا جاتا ہے۔[2]

چلہ:

زچہ چالیسویں دن نہاتی ہے تو اسے چلہ کہا جاتا ہے، بعض علاقوں میں اس سے پہلے دسواں بیسواں، اور مہینے کا نہان بھی ہوتا ہے، ان کو چھوٹا چلہ کہتے ہیں، اس لئے چالیسویں دن کے نہان کو بڑا چلہ کہا جاتا ہے۔

چھوچھک:

بعض جگہوں میں زچگی کے چالیس روز بعد جو رسم ادا کی جاتی ہے، وہ چھوچھک کہلاتی ہے۔[3]

پانوں پھیرنے جانا:

اوپر لکھا جا چکا ہے کہ حاملہ عورت زچگی سے چند دن قبل دو روز کے لئے اپنے میکے چلی جاتی ہے اور اس رسم کو پانوں پھیرنا کہا جاتا ہے، یہ رسم زچگی کے بعد بھی ادا کی جاتی ہے، مثلاً نچے کا زچگی خانے سے باہر آنا اور چلہ نہا کر بچے کو لے کر ماں باپ کے یہاں جانا، ہندو عورتوں کا شادی کے دوسرے روز ماں باپ کے گھر جانے کی رسم کو بھی پانوں پھیرنا کہا جاتا ہے۔

---

[1] سید احمد دہلوی، فرہنگ آصفیہ جلد اول۔ [2] ظفر الرحمن، فرہنگ اصطلاحات پیشہ وراں ج ۱۔

کھیر چٹائی:

بچے کو پہلی مرتبہ غذا کھلانے کی رسم جو عموماً کھیر سے شروع کی جاتی ہے،

سال گرہ:

بچہ سال بھر کا ہو جاتا ہے تو جشن منایا جاتا ہے، اسے سال گرہ کہتے ہیں، بڑی عمر کو پہنچ کر بھی سال گرہ منائی جاتی ہے، اکثر شعرا نے اپنے ممدوحین کی سال گرہ پر نظمیں لکھی ہیں،

دودھ بڑھائی:

دو سوا دو برس کی عمر میں عموماً بچے کا دودھ چھڑا دیا جاتا ہے، اس موقع پر بھی خوشی منائی جاتی ہے،

ختنہ:

سنت ہے، لیکن اسے بھی ایک رسم بنا دیا گیا ہے اور شیرینی تقسیم کرنے کے علاوہ بعض اوقات خاصا جشن منایا جاتا ہے،

ناک کان چھدوانا:

ہندوانہ رسم ہے، بعض مسلمان بھی اسے ادا کرتے ہیں،

بسم اللہ خوانی:

بچے کو نہلا دھلا کر نیا لباس پہنا دیا جاتا ہے، اور بسم اللہ خوانی کے بعد حاضرین میں شیرینی تقسیم کی جاتی ہے،

ھدیہ:

بسم اللہ خوانی کے بعد بچے کو قرآن شریف شروع کرایا جاتا ہے، جب وہ ختم ہو جاتا ہے، تو خوشی منائی جاتی ہے، اور اعزہ اور دوست احباب میں شیرینی تقسیم کی جاتی ہے، اس رسم کو ہدیہ کہتے ہیں،

روزہ کشائی:

جب بچہ ذرا سیانا ہو جاتا ہے تو اس سے روزہ رکھواتے ہیں۔ شام کو افطار کے وقت اس کی تقریب منائی جاتی ہے۔

موچھوں کا کونڈا:

جب لڑکے کی مسین بھیگنے لگتی ہیں تو موچھوں کا کونڈا کیا جاتا ہے، یعنی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی نیاز دلوائی جاتی ہے، یہ نیاز سویوں پر ہوتی ہے کہ جس طرح سویوں پر بیل چڑھتی ہے اسی طرح موچھوں کی بیل چڑھے۔

مذکورہ بالا رسموں کے دلچسپ ناموں کے علاوہ زچگی کی مناسبت سے کئی دلچسپ اور بلیغ الفاظ اور محاورے وجود میں آئے، مثلاً

پوتڑوں کا امیر	پیدائشی امیر،
تالوا،	بچے کو پہنانے کا پہلا جوڑا جو عموماً ننھیال کی طرف سے آتا ہے،
چھوچھلا،	بچے کی ولادت کے زمانے کا عورت کا لباس،
ٹھیکرا اٹھانا،	آنول نال اور زچگی کی آلائش کا برتن اٹھا کرلے جانا،
پیٹ پونچھنا،	عورت کا آخری بچہ۔
پیٹ ٹھنڈا رہنا،	عورت کا اولاد کی طرف سے سکھ پانا،
پیٹ میں آگ لگنا،	اولاد سے دکھ پہنچنا،
جال پڑنا،	چھ سات روز کے بچے کے جسم پر خون پھیلنے کی علامت کا ظاہر ہونا،
دانتوں پر ہونا،	بچے کے دانت نکلنا،
تلا بچہ،	جس کے منہ میں پیدائشی دانت ہوں،

کچا بچہ، حمل کی مدت پوری گذرنے سے پہلے کا بچہ،
پائلی بچہ، وہ بچہ جس کی پیدائش پیروں کی طرف سے ہو،

ب۔ شادی بیاہ کی رسمیں

شادی بیاہ میں بیسیوں رسمیں ادا کی جاتی ہیں، ہندو مسلمان دونوں ان رسموں کو ادا کرتے ہیں اور یہ ان کی معاشرتی زندگی کا ایک لازمی جز بن گئی ہیں، ان رسموں کی بدولت اردو زبان کے خزانے میں کافی اضافہ ہوا ہے، ان کا ذکر ذیل میں کسی قدر تفصیل سے کیا جاتا ہے،

پیٹوں کا بچ:

قدیم ہندوستان میں بچپن کی شادی عام تھی، حد یہ ہے کہ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا کہ عورت امید سے ہوئی اور اس سے قول و قرار ہو گیا کہ اگر لڑکی ہوئی تو ہمارے فلاں لڑکے سے اس کا عقد ہوگا، اس کو پیٹوں کا بچ کہتے تھے، اب یہ طریقہ بہت کم ہو گیا ہے[1]؛

ٹھیکرے کی مانگ:

یہ بھی قدیم ہندوستان کی ایک رسم تھی، جس کا رواج اب کم ہو گیا ہے، لڑکی پیدا ہوتے ہی لڑکے والا نسبت کر دیتا، اس کی صورت یہ ہوتی کہ جب لڑکی پیدا ہوتی اور اسے ٹھیکرے یعنی کونڈے میں نہلاتے تو آپس کی رضامندی سے اس میں لڑکے کی ماں ایک روپیہ ڈال دیتی یا گھٹی میں مصری ملا دیتی، جس سے غرض یہ ہوتی کہ آج ہی سے یہ لڑکی ہماری منگیتر ہو گئی، اسے ٹھیکرے کی مانگ یا مولودی نسبت کہتے ہیں[2] اسی سے کہاوت بنی ہے "بیاہتا چھوٹے منگیتر نہ چھوٹے"۔

---

[1] سید احمد دہلوی، رسوم دہلی، ص ۱۸ [2] ایضاً

بات یا بیاہ مانگنا:

جب لڑکا سیانا ہو جاتا ہے یا لڑکی بیاہنے کے لائق ہو جاتی ہے تو لڑکے کی طرف سے لڑکی کے لئے یا ہندوؤں میں لڑکی کی طرف سے لڑکے کے لئے پیغام جاتا ہے، اسے بات یا بیاہ مانگنا یا نسبت کرنا کہتے ہیں، اہل ہنود میں ٹیکا کرنا بھی مستعمل ہے، یہ بات رقعہ کے ذریعے بھی طے پاتی ہے، اس رقعہ کو اسم نویسی بھی کہتے ہیں، اور پیلی چٹھی بھی، پیلی چٹھی اس لئے کہ یہ عموماً پیلے کاغذ پر لکھی جاتی ہے، ہندوؤں میں بات یا نسبت کے لئے اچھی گھڑی یا ساعت دیکھی جاتی ہے جسے شبھ گھڑی یا شبھ ساعت کہتے ہیں، نظیر اکبر آبادی نے "مہادیو کا بیاہ" کے عنوان سے ایک نظم لکھی ہے، راجہ ہماچل اپنے دربار کے پروہتوں کو بلوا کر انہیں اپنی لڑکی گورا کی سگائی کے لئے بھیجتا ہے،

ہیں جتنے شہر پھر وان میں اور سیر کرو ملک اور نگر
جس دیس میں دیکھو راج پتی اونچا گھر اور سندر
ٹھہراؤ سگائی گورا کی شبھ ساعت سے تم اس کے گھر
جب ٹھہر چکے واں خوبی سے، دو اس کی ہم کو آن خبر

سگائی ٹھیک ہو جانے کے بعد راجا کو کچھ غلط فہمی ہوتی ہے۔

تب راجا نے بھی ترش ہو کر دربار پروہت بلوائے
جب آئے تو یہ بات کہی، کیسا ٹیکا کر آئے؟

بر دکھائی (دکھوا):

جب لڑکے کا پیام کسی گھر میں جاتا ہے تو اکثر لڑکا اپنے چند عزیزوں اور مخلص دوستوں کے ساتھ وہاں جاتا ہے اور اسے ایسی جگہ بٹھایا جاتا ہے کہ عورتیں بھی اسے تاک جھانک کر دیکھ لیں، اس رسم کو بر دکھائی یا بر دکھوا کہا جاتا ہے۔

منگنی:

شادی کی سب سے پہلی اہم رسم منگنی ہے، ہندوستان میں یہ رسم دھوم دھام سے منائی جاتی ہے، اس میں دولھا کے یہاں سے چند مرد اور چند عورتیں دولھن کے یہاں جاتی ہیں، دہلی میں صرف عورتیں جاتی ہیں،[1] مہمان عورتوں کو پان کا بیڑا کھلانے کے بعد دولھن سے اس کے دونوں ہاتھوں کی لپ بنوا کر اس میں روپے رکھتے ہیں، قدیم زمانے میں اشرفیاں بھی رکھتے تھے، اس رسم کو رکھ درشن کہتے ہیں، اسے منہ دکھائی یا دیدار نمائی بھی کہتے ہیں،[2]

منگنی کے دن دولھا کی طرف سے دولھن کے یہاں جو مٹھائی (بالوشاہی اور مصری کے لڈو سے گیارہ تنک کونڈے) جاتی ہے، کہاروں، چماروں وغیرہ کی مزدوری دولھن والے دیتے ہیں، اس رسم کو نشان چڑھانا کہتے ہیں، جب دولھا والے اپنے گھر پہنچ جاتے ہیں، تو دولھن کی طرف سے دولھا کے یہاں مٹھائی، مصری اور چند اور چیزیں بھیجی جاتی ہیں، اس رسم کو بھی نشان چڑھانا کہا جاتا ہے،[3] سودا نے اپنے ایک مرثیے کے ایک بند میں اس کا ذکر کیا ہے،

غرض جب وقت منگنی کا نشاں اس شہ کو آیا تھا | اسے شربت کی جا قسمت نے خون دل پلایا تھا
عوض مصری کے دولھن نے جگر کا لخت کھایا تھا | اور اس کے بیاہ ساچق کا یہ ساماں کر دکھایا تھا

کہ ایسا کچھ نہ دیکھے گا کوئی پھر ہر دو عالم سے

وسط ہند میں منگنی طے پانے کو پاندان ہونا کہتے ہیں،[4]

جنوبی ہند میں منگنی کے بعد ایک خاص رسم ادا کی جاتی ہے، دولھن والے ایک بڑی رقم دولھا والوں کے لئے بھیجتے ہیں، اسے پنڈی کہا جاتا ہے،[5]

---

[1] سید احمد دہلوی، رسوم دہلی، ص ۸۸ [2] ایضاً ص ۹۱ ۹۰، [3] ایضاً ۹۲-۹۱، [4] ظفر الرحمٰن دہلوی، فرہنگ مذکور، جلد ہفتم [5] نصیر الدین ہاشمی: دکنی کلچر، ص ۳۲۲۔

منگنی قرار پانے کی نشانی رسماً چاندی کا چھلا ہوتا ہے، جسے قول کا چھلا کہا جاتا ہے۔ اسے نشانی کا چھلا بھی کہتے ہیں، منگنی ہو جانے کے بعد طرفین سے تہواروں کے موقع پر تحفے تحائف بھیجے جاتے ہیں، ساون کا مہینا ہندوستان میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس مہینے میں جگہ جگہ گھم گوتے ہیں، اور جھولے پڑتے ہیں اور نوجوان لڑکیاں بڑی امنگوں کے ساتھ جھولا جھولتی ہیں، اس لئے ساون میں ساونی بھی جاتی ہے، یعنی جھولے کے رنگین کھم، ریشمی رسے، لال لال پڑیاں چاندی کی کھڑادیں، لال جوڑا، چوڑی، مہندی، آم، اندر سے دولھا کی طرف سے بھیجے جاتے ہیں، اور دوسری طرف سے مردانہ چیزیں آتی ہیں[۱]۔

لگن دھرنا:

جب طرفین سے شادی کی تیاری ہو جاتی ہے، تو شادی کی تاریخ مقرر کی جاتی ہے۔ اس رسم کو شادی کی لگن دھرنا کہتے ہیں، صرف لگن دھرنا بھی کہتے ہیں، میر حسن کا شعر ہے

کدھر ہے تو اے ساقیِ گلبدن　　　دھری آج اس شمع رو کی لگن

یہ تاریخ زبانی بھی طے ہوتی ہے، اور رقعہ کے ذریعے بھی،

دن ٹھہرایا بیاہنے کا شبھ ساعت شادی لگن دھری
تب راجا نے شیو شنکر کو اس بات کی پتری لکھ بھیجی
(نظیر اکبرآبادی)

دہلیز کدوانا:

اگر منگنی کے بعد کسی وجہ سے شادی ملتوی کرانا پڑتی تو ایسی صورت میں ایک رسم ادا کی جاتی ہے، اسے دہلیز کدوانا کہتے تھے، اب یہ متروک ہے،

مانجھے بٹھانا (بیٹھنا) یا لوں بٹھانا (بیٹھنا):

---

[۱] سید احمد دہلوی، رسوم دہلی، ص ۹۲۔

شادی سے سات یا گیارہ دن پہلے دولھن کو زرد جوڑا پہنا کر، ایک کمرے میں بٹھا دیا جاتا ہے، اس کا کمرے سے نکلنا اور مردوں کے سامنے ہونا بند کر دیا جاتا ہے، مانجھا پنجابی زبان کا لفظ ہے، جس کے معنی پلنگ یا چارپائی ہیں، چونکہ دولھن کو چارپائی پر بٹھایا جاتا ہے، اس لئے مانجھا بٹھانا کہا جاتا ہے، کثرت استعمال سے "مایوں بٹھانا (بیٹھنا)" بن گیا، اس دن سے دولھن کو ابٹنا (اپٹن) ملا جاتا ہے، تاکہ اس کے حسن میں نکھار پیدا ہو،

دولھا کو بھی مایوں بٹھایا جاتا ہے، لیکن صرف چار دن کے لئے، اسے بھی زرد لباس جسے مانجھے کا جوڑا کہتے ہیں، پہنایا جاتا ہے،

اہل ہنود میں اس رسم کو بال بٹھا بھی کہتے ہیں،

سہاگ، گھوڑیاں:

جس دن دولھن مایوں بیٹھتی ہے اس دن سے دولھن کے گھر میں اور جس روز دولھا مایوں بیٹھتا ہے، اس دن سے دولھا کے گھر میں لڑکیاں اور عورتیں مل مل کر خوشی کے گیت گاتی ہیں، جن کو سہاگ یا گھوڑیاں کہتے ہیں،

ابٹنا کھیلنا:

دولھا اور دولھن کو مایوں بٹھانے کے بعد، نیز ساچق کے دن گھر کے اندر عورتیں اور باہر مرد ابٹنا کھیلتے ہیں، بقول سید احمد دہلوی، بالکل ہولی اور رنگ پاشی کا سماں بندھ جاتا ہے[۱]

بری یا ساچق:

شادی سے ایک دن پہلے کچھ ٹھلیاں، شیرینی، دولھن کا لباس وغیرہ دولھا کے گھر سے بھیجا جاتا ہے، اسے بری یا ساچق کہتے ہیں، دولھا کے کپڑے جو دولھن کے گھر سے آتے ہیں،

---

[۱] رسوم دہلی، ص ۱۰۱۔

انھیں بھی بری یا بری کا جوڑا کہا جاتا ہے،

ریت کا جوڑا :۔ وہ کپڑے جو دولھن کے لئے دولھا کی طرف سے بھیجے جائیں، ریت کا جوڑا کہلاتے ہیں،

سہاگ پڑا :۔ دولھن کے سامان کا پڑا جو شادی کے دن یا دو ایک دن پہلے دولھا کی طرف سے بھیجا جائے،

مہندی :۔ ساچق کے دن دولھا کے یہاں سے بری کے ساتھ دولھن کے واسطے دولھا کی جھوٹی مہندی آتی ہے، پھر اس کے بعد دولھن کی بہنیں دولھا کے گھر مہندی لے کر جاتی ہیں[1]۔ مولانا عبدالحلیم شرر کے بیان کے مطابق "اس میں دراصل دولھن والوں کی طرف سے دولھا کے لئے وہ جوڑا جاتا ہے، جسے پہن کر وہ بیاہنے آئے گا[2]"

شاہانہ :۔ دولھا کے جوڑے کو شاہانہ یا شہانہ جوڑا کہتے ہیں، اسے تشریفی جوڑا بھی کہا جاتا ہے، اس گیت کو بھی شاہانہ یا شہانہ کہتے ہیں، جو ڈومنیاں اس وقت گاتی ہیں جب دولھا کے ہاتھوں میں مہندی رچائی جاتی ہے،

بندھوار :۔ یہ دراصل بن دھن روار کا مخفف ہے، اسے بندل باری اور بندل واری بھی کہتے ہیں، دولھا، دولھن کے گھروں کے دروازوں پر آم کے پتوں اور پھولوں کا ہار نیک شگون کے لئے لٹکاتے ہیں، سودا نے اپنے ایک مرثیے میں اس کا ذکر کیا ہے،

یہ بندھوار شادی کی بندھی دولھا دولھن کے گھر
قبیلہ کٹ گیا زنجیر میں دونوں کا سراسر

تھاپا :۔ شادی کے موقع پر گھر کی دیوار پر ہلدی کے رنگ سے ہاتھ کے چھاپے لگائے جاتے ہیں،

---

[1] رسوم دہلی، ص ۷۰، ۷۱، [2] گذشتہ لکھنؤ، ص ۲۸۴۔

شاید اسی سے ہاتھ پیلے ہونا (شادی کی خوشی منانا) محاورہ بنا ہے،

کلاوہ :۔ سرخ اور زرد رنگ کا گنڈے دار رنگا ہوا سوت جو شادی بیاہ میں ٹھلیوں اور مٹی کے دوسرے برتنوں پر باندھتے ہیں،

کاٹا ہوا وہ سر تھا جو سا حق کا جا دا گردن خط زخم تھا شکے کا کلاوہ (سودا)

آبچمن :۔ ہندوؤں میں دولھا کو منڈوے میں بٹھا کر ہاتھ پیر دھلوائے جاتے ہیں، اور چلو سے پانی پلایا جاتا ہے، یہ گویا شادی کا قول وقرار ہے،

تیل چڑھانا :۔ شادی کے دن دولھا کو گرم پانی سے نہلانے سے پہلے اس کے بدن پر تیل ملا جاتا ہے، یہ رسم تیل چڑھانا کہلاتی ہے، سودا نے اپنے ایک مرثیہ میں اس کا بھی ذکر کیا ہے،

منڈھا یہ تھا کہ غم چھا گیا آفاق کے دل پر چڑھا یا تیل دولھا کو لہو سر تا قدم مل کر

تیل بان :۔ دولھن کے جسم پر ابٹنا اور تیل ملنے کی رسم ہے،

شادی کا ڈورا، کنگن :۔ تیل چڑھانے کے بعد دولھا کے ہاتھ میں کنگن رکنگنا، باندھا جاتا ہے، اسے شادی کا ڈورا کہتے ہیں، سودا کے ایک مرثیے کا شعر ہے دولھن کی زبان سے،

باندھا کنگن تیرے سکھ کرنے کو ہاتھ کیا میں جانتی تھی کہ یوں بچھڑے گا ساتھ

ایک دوسرے مصرع میں سودا نے شادی کے ڈورے کا ذکر کیا ہے،

یارو سنو تو یہ ستم چرخ کہن کا بٹھا ہے عجب طرح سے بیاہ ابن حسن کا
سنجوگ یہ کچھ باندھا ہے دولھا سے دولھن کا جو تار کفن کا ہے سو ڈورا ہے لگن کا

منڈمرا :۔ دولھا کو شادی کا لباس پہنانے سے پہلے نائی اسے نہلاتا ہے، اس مقصد کے لئے منڈوا تیار کیا جاتا ہے، دولھا کے اترے کپڑے نائی لے لیتا ہے،

سہرا :۔ نہا چکنے کے بعد دولھا کو کپڑے پہنائے جاتے ہیں، اور پھر اس کے سر سے سہرا

باندھا جاتا ہے۔ اس سہرے نے اردو شاعری کو صنفِ سہرا عطا کیا، سہرا باندھنے والوں کو نیگ کی رسم کے مطابق انعام دیا جاتا ہے، اب دولھا نوشہ بن جاتا ہے، اس کا چھوٹا بھائی یا کوئی اور (رشتے کا بھائی) جو کم عمر لڑکا ہوتا ہے، شہ بالا بنتا ہے،

آرتی:۔ ہندوؤں میں شادی کے موقع پر چراغوں کی ایک مقررہ تعداد تھال میں رکھ کر دولھا کے منہ کے سامنے گھماتے اور سر سے پیر تک چکر دیتے ہیں، یہ رسم آرتی اتارنا کہلاتی ہے، اس موقع پر عورتیں گیت گاتی ہیں، اسے آرتی گانا کہتے ہیں،

صحنک:۔ یہ مسلمان عورتوں کی مقبول رسم ہے، اور بڑی عقیدت کے ساتھ اس کا اہتمام کیا جاتا ہے، یہ حضرت فاطمہؓ کی نیاز ہے، اسے بی بی کا دانہ بھی کہتے ہیں، اس کے کھانے کے واسطے پاک دامن اور نہایت پارسا عورتیں مخصوص کی جاتی ہیں، جنھیں بیوی زینن کہتے ہیں، خاص کر سیدانیوں کا زیادہ حق سمجھا جاتا ہے[1]، یہ نیاز شادی کے دن صبح کو دی جاتی ہے، یہ جہانگیر کی راجپوت بیگم جودھا بائی کی ایجاد ہے، اس کی ایجاد رسوم دہلی کے مصنف کے الفاظ میں اس طرح ہوئی،

"نور جہاں جو بادشاہ کی آنکھ لگائی بیوی تھی، اس راجپوت زادی (جودھا بائی) کو ہر بات پر چھیڑا کرتی تھی، کبھی کہتی کہ تو تو نری گنواری پھوہڑ ہے، کبھی کہتی کہ تو تو ہندو بچی ہے، تجھے ہمارا سلیقہ میسر ہے؟ کبھی کہتی کہ مارواڑوں کو بھی دن لگے، جودھا بائی آخر تھی رئیس زادی اور راجکماری، یہ باتیں سنتی اور خون کے سے گھونٹ پی کر خاموش ہو رہتی، جب اس نے دیکھا کہ یہ کسی طرح باز نہیں آتی.... تو اس نے اس کے ذلیل کرنے کے واسطے یہ ترکیب سوچی کہ ایک روز تمام بیگمات کی دعوت کی اور کہا کہ مَنّت میں

---

[1] سید احمد دہلوی، رسوم دہلی، ص ۱۱۰۔

حضرت فاطمہؓ کی نیاز دلواؤنگی، سب کو اس متبرک نیاز میں شریک ہو کر ثواب دارین حاصل کرنا چاہئے، غرض تمام شاہزادیاں، بیگمیں اور عزت دار خاندانی عورتیں، ......
اس میں شریک ہونے آگئیں، اس نے نیاز کا دہی خشکہ پکوایا، کورے کورے کونڈوں میں رکھا عطر اور پھولوں سے دستر خوان کو مہکایا، سات ترکاریوں سے سجایا، جب سب عورتیں جمع ہو گئیں تو آواز بلند فرمایا کہ بی بیو! اس متبرک اور پاک صحنک کو وہی بیوی زن کھا سکتی ہے، جس نے دوسرا خاوند نہ کیا ہو، ہمیشہ پارسا اور پاک دامن بنی رہی ہو، چونکہ نور جہاں شیر افگن خاں کے بعد جہانگیر کے نکاح میں آئی تھی، وہ نہایت شرمندہ ہوئی، اور اس روز سے بڑا بول بولنا چھوڑ دیا، پس اب یہ نیاز ہر ایک تقریب اور شادی و مراد کے موقع پر ہونے لگی[1]،

برات:۔ برات کو روانگی سے دو چار دن پہلے نائی یا چھپے ہوئے رقعہ کے ذریعے مردوں کو برات میں چلنے کی دعوت دی جاتی ہے، برات کی روانگی کا منظر بڑا دلچسپ اور دلخوش کن ہوتا ہے، میر حسن نے اپنی مثنوی سحر البیان میں شہزادہ بے نظیر کی برات کی روانگی کا سماں دکھایا ہے اور بعض جزئیات تک دی ہیں، دولھا کا گھوڑے پر سوار ہونا، براتیوں کا اپنی سواریوں کے لئے پریشان ہونا، اسلحوں کا کھٹکنا، باجوں کی خوش آیند صدائیں، جگمگاتی روشنی، آتش بازی کا چھٹنا، تماشائیوں کی کثرت، طوائف کا راگ اور ناچ، طوائف کے ناز و انداز وغیرہ، نیچے چند منتخب اشعار نقل کئے جاتے ہیں۔

وہ دولھا کے اٹھتے ہی اک غل پڑا	لگا دیکھنے اٹھ کے چھوٹا بڑا
کوئی دوڑ گھوڑوں کو لانے لگا	کوئی ہاتھیوں کو بٹھانے لگا

---

[1] سید احمد دہلوی، رسوم دہلی، ص ۱۱۱ - ۱۱۰،

لگا کہنے کوئی ادھر آئیو — ارے رتھ شتابی مری لائیو
کوئی پالکی میں چلا ہو سوار — پیادوں کی رکھ اپنے آگے قطار
سپر اور تبیغے کھڑکنے لگے — سواروں کے گھوڑے بھڑکنے لگے
نکورے وہ نوبت کے اور ان کے بعد — گرجنا وہ دھونسوں کا مانند رعد
وہ شہنائیوں کی سہانی دھنیں — جنھیں گوشِ زہرہ معفصل سنیں
وہ طبلوں کا بجنا اور ان کی صدا — وہ گانا کہ "اچھا بنا لاؤ لا"
وہ نوشے کا گھوڑے پہ ہونا سوار — وہ موتی کا سہرا، جواہر کا ہار
وہ فانوسیں آگے زمرد نگار — کہ ہو سبز مینا جنھوں پر نثار
دو رستہ جو روشن چراغاں ہوئے — پتنگے خوشی سے غزلخواں ہوئے
براتی ادھر اور ادھر جوق جوق — وہ آواز سرنا اور آواز بوق
وہ آرائش اور گل کئی رنگ کے — وہ ہاتھی کہ دو دیو تھے جنگ کے
وہ ابرک کے گنبد، وہ مینے کے جھاڑ — کہے تو کہ تنکے کے او جھل پہاڑ
وہ رنگین کنول اور وہ شمع و چراغ — کھلے جس طرح لالۂ نورِ باغ
اناروں کا دغنا چھچھے کا زور — ستاروں کا چھٹنا پٹاخوں کا شور
اڑایا ستاروں کو جو آگ نے — تو ہاتھی لگے بن کو پھر بھاگنے
وہ مہتاب کا چھوٹنا بار بار — کہ ہر رنگ کی جس سے دونی بہار
دھواں چھپ گیا نور میں نور ہو — سیاہی اڑی شب کی کافور ہو

برات دولھن کے یہاں پہنچتی ہے، وہاں کا عالم یہ ہے،

جب آئی وہ دولھن کے گھر پہ برات — کہوں واں کے عالم کی کیا تجھ سے بات

ہوا واں کی صحبت کی رشک بہشت
دھرے کھلنے گر دعنبر سرشت

کھڑے بادلوں کے وہ خیمے بلند
کریں عالم نور جس کو پسند

عجب مسند اک جھلمگی اور فرش
تمامی کے عالم کا جو کور فرش

بلوریں دھرے شمع واں بے شمار
چڑھیں بتیاں موم کی چار چار

نئے رنگ کے اور نئے طور کے
دھرے ہر طرف جھاڑ بلور کے

وہ دولھا کا مسند پہ جا بیٹھنا
برابر رفیقوں کا آبیٹھنا

گھر چڑھی (گھوڑ چڑھی) :۔ دولھا گھوڑے پر سوار ہو کر دولھن کے گھر جاتا ہے، یہ رسم اب تقریباً متروک ہے،

دھنگانا:۔ یہ رسم بھی اب تقریباً متروک ہے، جب برات دولھن کے دروازے پر پہنچ جاتی تھی، تو رشتے کی عورتیں دولھا کو اندر جانے سے روکتی تھیں اور پھولوں کی چھڑیوں سے اسے مارتی تھیں، سودا نے اپنے ایک مرثیے میں اس کا ذکر کیا ہے،

ریت و رسم میں دی جان بنے نے تس پہ
دیکھنا اس کو بنو کا نہ ملا بھر کے نظر

نیگ میں جاکے دھنگا کے دیا اپنا سر
لینے والوں نے کہا خرم و شاداں ہو کر

بتو ایں ہمتِ مردانہ مبارک باشد
گفت جود کریمانہ مبارک باشد

آتش بازی :۔ آتشبازی برات کا ایک اہم جز ہے، برات کی روانگی کے ساتھ ہی چھوٹنا شروع ہوتی ہے، لیکن معمولی طریقے پر منزل مقصود پر پہنچ کر دل کھول کر چھوڑی جاتی ہے، اور براتیوں اور تماشائیوں کے لئے خاص دلچسپی کا باعث بنتی ہے، میر حسن نے "شادیٔ آصف الدولہ" کے عنوان سے ایک مختصر مثنوی لکھی ہے، اس میں روشنی کا سماں

دکھانے کے بعد آتشبازی کا نظارہ یوں دکھایا ہے،

بیچ میں جب اس کے چھٹتے تھے انار	نور کی سی لہر تھی فوارہ وار
ہاتھی آتشبازی کے چھٹتے تھے جب	نور کو طور تھا قطروں میں تب
مور اس کے اس میں چھوٹے اس نمط	چھوٹتی ہیں جس طرح دریا میں بط
جس کو گھن چکر کہے ہیں وہ نہ تھا	وجد میں آتش کا دل تھا بر ملا
بسکہ چھٹتے تھے ستارے بے شمار	آسماں کی سی زمیں پر تھی بہار
پھلجھڑی، منہ پھول گلریز اور انار	کرتے جاتے تھے طبق گل کے نثار
جس طرف جاتی تھی واں دو نگاہ	جوش گلناری سے پاتی تھی نہ راہ

برات کو اتارنے کا حسب استطاعت معقول انتظام کیا جاتا ہے، دیہات میں عموماً آبادی سے دور کسی باغ میں اتارا جاتا ہے اور براتیوں کے سونے کے لئے چارپائی کا انتظام ہوتا ہے، قصبے اور شہروں میں تمبو، شامیانے، بانات، قناتیں، لنگیرے وغیرہ کا اہتمام کیا جاتا ہے، براتیوں کی خاطر تواضع کے لئے گلاب پاش، عطردان، کستوری، عنبر، پان کے بیڑے الائچی اور لونگ کے تھال وغیرہ رکھوائے جاتے ہیں، اہل ہنود کے یہاں اس ضمن میں دھرم شالے کو بھی اہمیت حاصل ہے،

ٹٹیاں (پھولوں کی)،۔ شادی بیاہ کے موقع پر بانس یا سرکنڈوں کا ایک تخت تیار کیا جاتا تھا جس کو پھولوں سے سجاتے تھے، اس پر باجے تاشے والے بیٹھ کر نوبت بجاتے تھے، اب اس کا رواج بہت کم ہو گیا ہے،

رقص و سرود،۔ رقص و سرود شادی کا ہمیشہ سے ایک جز رہا ہے، میر حسن نے سحرالبیان میں اس کا سماں یوں دکھایا ہے،

طوائف کا اٹھنا اک انداز سے　　دکھائی وہ آ صورتیں ناز سے

کروں راگ اور ناچ کا کیا بیاں　　قدیمی کسی وقت کا سا سماں

وہ اربابِ عشرت کا آپس میں مل　　جمانا کھڑے راگ کا دیکے دل

وہ ایمن کی لہریں ادھر اور ادھر　　ملے سر طنبوروں کے با یک دگر

اور اس صف سے اک چھوکری کا نکل　　جتانا ہنر اپنا پہلے پہل

اٹھانا دوپٹے کا دے دے کے تال　　وہ بوٹا سا قد اور وہ گھنگھرو کی چال

کبھی ہر ملو میں دکھانی ادا　　کہ جوں لوٹ کر ہوئے بجلی ہوا

کبھی گت سری ناچنا ذوق سے　　کہ تیورا کے عاشق گرے شوق سے

ادھر کی تو یہ گت اور اس کا بھاؤ　　ادھر اوٹ میں نایکا کا بناؤ

وہ شادی کی مجلس وہ گانے کا رنگ　　وہ جی کی خوشی اور وہ دل کی ترنگ

نکاح:- نکاح یا عقد رسم نہیں، بلکہ حکم شرعی ہے، جس کے بغیر شادی نہیں ہو سکتی۔ شرعاً نکاح کوئی بھی پڑھا سکتا ہے، لیکن رسماً قاضی صاحب پڑھاتے ہیں، نکاح سے پہلے خطبہ پڑھا جاتا ہے، دولہا دولھن کے نام، مہر کی مقدار، مہر مؤجل یا معجل کی وضاحت، تاریخ نکاح وغیرہ ایک رجسٹر میں درج کی جاتی ہیں، اس کاغذ یا دستاویز کو کابین نامہ کہتے ہیں اسے مہرنامہ بھی کہا جاتا ہے،

شب گشت، بازگشت:- دولہا اور براتی دولھن کے مکان پر جو نکاح کے لئے جاتے ہیں، اسے دکن میں شب گشت کہا جاتا ہے، اور واپسی (جہیز کے سامان کے ساتھ) کو بازگشت کہتے ہیں۔[1]

---

[1] نصیر الدین ہاشمی، دکن کلچر، ص ۱۳۳،

پھیرے : ہندوؤں میں پھیرے لگائے جاتے ہیں یعنی دولہا اور دولھن کا پلو ایک ساتھ باندھ دیتے ہیں اور وہ ہوم کے گرد پھیرے لگاتے ہیں،

آنچل گانٹھ : دولھا اور دولھن کے دامنوں یا پلوؤں کے سروں کو جو گرہ لگائی جاتی ہے اسے آنچل گانٹھ کہتے ہیں، یہ گویا شادی ہو جانے کا اعلان ہے،

انگ ملائی : آنچل گانٹھ سے پہلے دولھا اور دولھن کو آئینے کے سامنے کھڑا کیا جاتا ہے اور ایک دوسرے کو دکھایا جاتا ہے، اس کو انگ ملائی کہتے ہیں،

پٹیا پھیرنا : دولھا دولھن کی نشستوں کو بدلا جاتا ہے یعنی دولھن کو دائیں طرف سے بائیں طرف بٹھایا جاتا ہے،

نکاح یا پھیرے کے بعد پھر رسموں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے، حاضرین مجلس کو پھول پیش کئے جاتے ہیں، چھوہارے تقسیم ہوتے اور لٹائے جاتے ہیں، شربت پلایا جاتا ہے، پان تقسیم کئے جاتے ہیں، اس فہرست میں کولڈ ڈرنک (COLD DRINK) اور آئسکریم (ICE CREAM) کا اضافہ کر لینا چاہئے، جو انگریزی تہذیب سے ہمارے یہاں آئی ہیں، کہیں کہیں نکاح کے بعد دولھا کو شربت پلاتے ہیں، اور اس کا جھوٹا شربت دولھن کو بھیجتے ہیں، یہ ایک طرح کا ٹوٹکا ہے،

سہرا : نکاح ہونے کے بعد سہرا گایا پڑھا جاتا ہے ڈومنیاں سہرا گاتی ہیں، بعض اوقات شعرا اس خاص موقع کے لئے سہرا لکھ کر لاتے اور پڑھتے ہیں یا کسی خوش گلو سے پڑھواتے ہیں، اردو میں غالب اور ذوق کے سہرے بہت مشہور ہیں، سہرا ہماری تمدنی زندگی میں اس قدر اہمیت اختیار کر چکا ہے کہ اس کی بنیاد پر محاورے بن گئے ہیں، مثلاً

سہرا بندھنا، (باندھنا) دولھا بننا، شادی ہونا،

سہرا دکھانا، شادی دیکھنے کا موقع نصیب کرنا،

سہرا دیکھنا، بیاہ دیکھنا،

سہرا سر ہونا (بندھنا) امتیاز ملنا، فخر حاصل ہونا،

سہرے کے پھول کھلنا، بیاہ کا وقت آنا،

سہرے جلوے کی، بیاہتا بیوی،

سلامی:۔ نکاح ہونے کے بعد دولھا حاضرین مجلس کو سلام کرتا ہے، اسے سلامی کہتے ہیں، اس کے بزرگ، عزیز، رشتے دار، دوست احباب اسے اپنے اپنے حسب مقدور روپے دیتے ہیں، اسے سلامی کے روپے کہا جاتا ہے، انگریزی تہذیب کے اثر سے چیز کی شکل میں تحفے تحائف بھی دیئے جاتے ہیں، بعض جگہ اس موقع پر سمدھیوں کو شربت پلایا جاتا ہے، ہر سمدھی شربت پیتا اور شربت پلائی، شربت کی تھالی میں ڈالتا جاتا ہے، یہ سب روپیے دولھن کے گھر بھیج دیئے جاتے ہیں، [1]

جہیز:۔ باپ اپنے مقدور کے مطابق بیٹی کو ضروریات زندگی کی چیزیں دیتا ہے، اردو میں دہیز بھی کہتے ہیں، دان دہیز بھی روزمرہ ہے، جہیز کی چیزیں عموماً نمائشی ہوتی ہیں، اسلئے جو چیزیں معمولی ہوتی ہیں، انھیں جہیز و دہیز کہا جاتا ہے، غریب باپ اپنی بیٹی کو معمولی چیز دیتا ہے، اسے گرنا یا سنوارنا کہتے ہیں،

بھوڑے کا کھانا:۔ پہلی رخصتی کے وقت میکے سے عروس کے ساتھ جو کھانا جاتا ہے، اسے بھوڑے کا کھانا کہتے ہیں،

خوشنما تھا جہیز آ جانا ڈولیوں میں بھوڑے کھانا
(دبیر لکھنوی)

وار پھیر، بکھیر:۔ دولھا، دولھن کے سر سے وار کر کے جو رقم ڈومنیوں کو دی جاتی ہے، اسے وار پھیر یا بکھیر کہا جاتا ہے،

---

[1] سید احمد دہلوی، رسوم دہلی ص ۲۱۱

ریت رسم :۔ رخصت ہونے سے پہلے دولھا کو گھر کے اندر بلایا جاتا ہے، اسے ریت رسم کہتے ہیں، بقول مصنف رسوم دہلی ان رسموں کی ادائگی کو "ہفت خوان رستم یا ہفت خوان اسفندیار" سے کم نہیں سمجھنا چاہئے، اس میں دولھا کو کوٹھری کی دہلیز میں بٹھا کے کالے تل اور کھانڈ دولھن کے ہاتھ پر رکھ کر منہ سے چنواتے ہیں، جس سے غرض یہ ہوتی ہے کہ وہ ہمیشہ دولھن کا تابعدار بنا رہے، اسی رسم سے ایک مثل بنی ہے، "ہم نے ایسے ہی تمھارے کالے تل چابے ہیں، جو تم سے نیچی آنکھ کریں، اسی طرح مشاطہ عروس کے ہر عضو پر مصری رکھتی ہے اور دولھا اس کو اپنے منہ سے کھاتا ہے، عورتیں اس کو نباتیں چنوانا کہتی ہیں، بعض جگہ دولھن کے دامن پر دولھا سے نماز پڑھواتے ہیں، اسی طرح اور بھی طرح طرح کی رسمیں ادا کی جاتی ہیں، آخری رسم جلوے یا آرسی مصحف کی ہے،

جلوہ :۔ آرسی مصحف دکھانے کی رسم کو جلوہ کہتے ہیں،

آرسی مصحف :۔ مسلمانوں کی مشہور اور عام رسم ہے، دولھا اور دولھن کو آمنے سامنے بٹھاتے ہیں، بیچ میں تکیہ اور تکیے پر قرآن مجید رکھا جاتا ہے، دولھا اس میں سے سورۂ اخلاص پڑھ کر دولھن پر دم کرتا ہے، قرآن شریف پر آئینہ رکھ کر دولھا اور دولھن دونوں کے اوپر کپڑا ڈال دیتے ہیں، آئینے میں دولھا دولھن ایک دوسرے کی شکل دیکھتے ہیں، قرآن شریف نظر بد سے بچنے اور خیر و برکت کے حصول کے لئے رکھا جاتا ہے،

میر حسن نے مندرجۂ ذیل اشعار میں جلوے کی اچھی عکاسی کی ہے،

دکھا مصحف اور آرسی کو نکال	دھرا بیچ میں سر پہ آنچل کو ڈال
عجب قدرتِ حق نمایاں ہوئی	جسے آرسی دیکھ حیراں ہوئی
وہ جلوے کا ہونا وہ شادی کی دھوم	وہ آپس میں دولھا دولھن کی رسوم

کسی نے پسائی سر وتج آن کر | کوئی گالی ہی دے گئی جان کر
گئی کوئی واں گال سے کچھ لگا | گئی کوئی دو دلھن کی جوتی چھوا
وہ شیریں جو بیٹھی تھی شیریں بنی | بنات اس کی جینے بنے کو بنی
جنائی بنات اس کو اس گھات سے | کہ ڈھکا دیا ہر گھڑی بات سے
زبس دل تو تھا اس کا ہر جا پہ بند | سبھی جا سے اس نے چنی کر پسند
اٹھائی ڈلی اس کی آنکھوں سے یوں | کریں نوش بادام شیریں کو جوں
ڈلی وہ جو ہونٹھوں کی تھی اب ملی | وہ مصری کی منہ سے اٹھائی ڈلی
ذرا پانوں پر اٹھلاتے اڑا | نہیں اور ہاں کا عجب غل پڑا
عجب کی طرح رنگ رلیاں ہوئیں | کہ باتیں وہ مصری کی ڈلیاں ہوئیں

اکیس پان کا بیڑا :۔ پان ہندوستان کی خاص چیز ہے، تقریبات میں خصوصاً اس کا استعمال ہوتا ہے۔ آرسی مصحف دکھانے کے بعد دولھے کو اکیس پان کا بیڑا کھلایا جاتا ہے،

سمدھنوں کی ہنسی مذاق :۔ سمدھن کا رشتہ اہم بھی ہے اور دلچسپ بھی اس لئے ان کی آؤ بھگت بھی ہوتی ہے، اور آپس میں ہنسی مذاق بھی ہوتا ہے، میر حسن نے سمدھنوں کے ہنسی مذاق کی عکاسی اس طرح کی ہے،

اترنے کی واں سمدھنوں کی پھبن | کھلیں پھول جیسے چمن در چمن
گلوں میں پہننا وہ ہنس ہنس کے ہار | تڑاتڑ وہ پھولوں کی چھڑیوں کی مار
دکھانا وہ بن بن کے اپنا بناؤ | وہ آپس کی رمزیں وہ آپس کے چاؤ
قہقہے، ہنسی، شور و غل، تالیاں | سہانی سہانی نئی گالیاں

رخصتی :۔ بڑا دلدوز منظر ہوتا ہے، گھر کی آبادی رخصت ہوتی ہے، گھر کی یچھی بدا ہوتی ہے

گھر کی رونق جاتی ہے، دولھن کی ماں بہن چچی وغیرہ کے علاوہ اس کی سب سہیلیاں اور ہمجولیاں اس سے مل مل کر روتی ہیں، اسی حالت میں رخصت کا گیت گایا جاتا ہے، جسے منڈھا کہتے ہیں۔ بابل میرا نیہر چھوٹا جائے، ایسے ہی موقع کا ایک مشہور گیت ہے۔ دولھا، دولھن کو اپنی گود میں اٹھا کر جوڈول میں سوار کرتا ہے اور خود گھوڑے پر سوار ہوتا ہے، آگے آگے وہ ہوتا ہے اور پیچھے پیچھے دولھن کی سواری، دولھا کے گھر والے جوڈول پر بطور نچھاور پیسے پھینکتے ہیں،

بار رکائی:۔ جب دولھن دولھا کے گھر پہنچتی ہے، تو دولھا کی بہنیں دوپٹے سے بار روک کر کھڑی ہو جاتی ہیں، اور دولھا سے اپنا نیگ لیتی ہیں، اسے بار رکائی کہتے ہیں،

نیگ اس عطیے کو کہتے ہیں جو شادی کے موقع پر کسی رسم کی انجام دہی پر بڑے چھوٹوں کو دیں،

منہ دکھائی:۔ جب دولھا دولھن گھر کے اندر پہنچ کر مسند پر بیٹھتے ہیں، تو خاندان والے دولھن کو دیکھتے ہیں، اور اسے اپنی استطاعت کے مطابق روپے یا کوئی چیز دیتے ہیں، اسے منہ دکھائی کہتے ہیں،

ست کورے کی کھیر:۔ منہ دکھائی کے وقت کھیر آتی ہے، اور دولھا دولھن کو سات لقمے کھلاتا ہے، پھر کوئی عورت دولھن کا ہاتھ پکڑ کر اس کے ہاتھ سے دولھا کو سات نوالے کھلاتی ہے،

سہاگ کی رات:۔ کھانا کھا کر جب دولھا دولھن علیحدہ مکان میں سوتے ہیں تو ڈومنیاں یا دولھا کے گھر کی عورتیں گیت گاتی ہیں، اس رات کو سہاگ کی رات یا تخت کی رات کہا جاتا ہے،

دعوت ولیمہ:۔ شادی کے دن یا دوسرے دن رشتے داروں اور دوست احباب کی دعوت کی جاتی ہے، اسے دعوت ولیمہ کہتے ہیں، یہ سنت مؤکدہ ہے،

کندوری:۔ شادی کے بعد دولھن کی طرف سے جو دعوت ہوتی ہے، اسے کندوری کہا جاتا ہے،

پکی :۔ کایستھوں کے یہاں شادی کے موقعہ پر پوری، کچوری اور مٹھائی کی جو دعوت ہوتی ہے، وہ پکی کہلاتی ہے،

تقسیم پان :۔ شادی بیاہ میں کھانے کے بعد پان کی تقسیم بھی ہندوستان کے سبھی صوبوں میں لازمی سمجھی جاتی ہے اور مان اور عزت کی نشانی خیال کی جاتی ہے، نصرتی نے گلشن عشق میں اس کا نقشہ یوں کھینچا ہے،

اگھانا ہوا خلق جب کھا کے کھان ۔۔۔ دھلا تب دئے مان کے سب کو پان
عجب کیوڑے کیا بچہ بھنکیاں سے سج ۔۔۔ جو ہو وے کلی لالہ جس تی او بیج
دسیں پان کھاتے دسن رنگ دھر ۔۔۔ کیا پاچ الماس کوں لعل تر

چوتھی :۔ شادی کے دوسرے دن دولھن کے بھائی مٹھائی کے خوان یا ٹوکریاں لے کر بہن کو لینے آتے ہیں، انھیں شربت پلایا جاتا اور ناشتا کرایا جاتا ہے، وہ شربت پلائی دیتے ہیں، بھائی دولھن کو گھر لے جاتے ہیں، وہ نہا دھو کر چوتھی کے بھاری جوڑے پہنتی اور بناؤ سنگار کرتی ہے، تیسرے پہر کو دولھا اور دولھا والیاں یعنی سمدھنیں چوتھی کھیلنے جاتی ہیں، دولھا کی سالیاں اس کی جوتی چھپا دیتی ہیں، اور اس سے اپنا نیگ لیتی ہیں، اسے جوتی چھپائی کا نیگ کہتے ہیں، بعض جگہ شادی کے چوتھے دن یہ رسم منائی جاتی ہے اور دولھا اور دولھن کے گھر کی عورتیں رنگ کھیلتی ہیں، جسے ہولی کھیلنا کہتے ہیں،

اور کوئی کسی پہ ڈال کے رنگ ۔۔۔ کہتی تھی اے بوا نہ ہو دل تنگ
ہولی کے کھیلنے میں اب اس دم ۔۔۔ میں تو تھک گئی مجھے علی کی قسم

دہلی میں چوتھی کھیلنے سے پہلے دولھا، دولھن ایک دوسرے کو کھیر کھلاتے ہیں، اس کے بعد دولھا دولھن کے آہستہ آہستہ پھولوں کی سات چھڑیاں لگاتا ہے، ڈومنی دولھن کے ہاتھ سے

[1] زبان

پھولوں کی چھڑیاں پکڑ کر دولھا کے شامت لگواتی ہے، پھر ایک دوسرے کی طرف پھولوں کی گیند پھینکتے ہیں، اس کے بعد سمدھنیں چوتھی کھیلتی ہیں، کوئی جلو ترا کھینچ مارتی ہے۔ کوئی گھٹا پھینک مارتی ہے، کوئی رنگترے سے کسی کی پیٹھ لال کر دیتی ہے، کوئی آم سے دوپٹے کا ناس کر دیتی ہے، غرض چوتھی کیا خاصی ہولی کھیلی جاتی ہے[1]۔

پھولوں کی چھڑی:۔ چوتھی کے دن دولھا والوں کی طرف سے دوسری چیزوں کے ساتھ پھولوں کے گہنے اور پھولوں کی چھڑیاں بھی بھیجی جاتی ہیں جن سے عورتیں چوتھی کھیلتی ہیں انشاء نے اپنی بعض غزلوں میں اس کا ذکر کیا ہے، مثلاً[2]

چل رہی ہیں خوب سی پھولوں کی چھڑیاں باہم	نو عروسان چمن کا دیکھیے گا اختلاط
کہ کبھی کھینچ کے گر تیغ بھی دشمن مارے	فضل حیدر سے جہاں میں ہوں میں بے دھڑک تو
چھڑی پھولوں کی کوئی جیسے کہ سمدھن مارے	تو مجھے کچھ نہ ہو معلوم مگر اتنا ہو
بوئے گل لیکے جو پھولوں کی چھڑی مجھ سے لڑی	کوئی سی حور یہاں کھیلنے جو چوتھی آئی

سیٹھنیں:۔ خاطر مدارات اور دوسری رسمیں ہو جانے کے بعد سمدھنیں ایک دوسرے کو گالیاں دیتی ہیں، ان کو سیٹھنیں کہا جاتا ہے، ذیل میں اس کی ایک مثال دی جاتی ہے۔

سات سکھیوں میں ایسا لاگے جیسے بسنت کا گڑوا	سمدھی تیرے گھر آیا ڈالوں وا کے گلے میں ہروا

جیسے ہولی کا بھڑوا[3]

دولھن کا نام:۔ چوتھی کھیل لینے اور نہانے اور کھیر کھا لینے کے بعد دولھن کا خسر یا گھر کا اور کوئی بڑا دولھن کا گھونگھٹ اٹھا کر اسے مناسب حال خطاب دیتا ہے، اور سسرال والے بجائے نام کے اسی خطاب سے بلاتے ہیں، مثلاً شہزادی دولھن، آفتاب دولھن، مہتاب دولھن،

[1] سید احمد دہلوی، رسوم دہلی، ص ۱۳۶ [2] ایضاً [3] ایضاً ص ۱۳۶

اقبال دولھن وغیرہ، مغلوں میں سکندر زمانی، سردار بیگم، امراؤ دولھن، اختر زمانی، بہو بیگم، اقبال زمانی وغیرہ خطاب دیئے جاتے تھے۔[۱]

چکٹ اترّوائی: یہ رسم بھی چوتھی کے دن ادا کی جاتی ہے، بیاہ کے کاموں کی مصروفیت کی وجہ سے دولھن کی ماں کو کپڑے بدلنے کی فرصت نہیں ملتی، اور وہ میلے چکٹ ہو جاتے ہیں، چوتھی کے دن اس کے میکے والیاں اس کے کپڑے بدلواتی ہیں، دولھن کے نانا، نانی، ماموں، یا خالہ کی طرف سے دولھن کی ماں کو جوڑا پہنایا جاتا اور حسب حیثیت کچھ نقدی دی جاتی ہے۔[۲]

چالا: نئی دولھن کا سسرال سے اول چار مرتبہ میکے جانا چالا کہلاتا ہے، کل چار چالے ہوتے ہیں، ہر پھیرے میں جوڑا اور کچھ نقدی دیتے ہیں،[۳] پہلا چالا ماں، دوسرا چالہ خالہ یا پھوپھی تیسرا نانی اور چوتھا دادی کرتی ہے، اگر کوئی نہ کرے یا مذکورہ بالا رشتے دار نہ ہوں تو باپ کو چاروں چالے کرنے پڑتے ہیں،[۴] یہ رسم دہلی اور لکھنؤ وغیرہ کی طرف زیادہ ہے،

گونا: ہندوستان میں بچپن ہی میں شادی کر دینے کا رواج تھا، مسلمانوں نے بھی اس طریقے کو اپنا لیا، چونکہ لڑکا لڑکی بہت چھوٹے ہوتے اور شادی کے مفہوم سے نا آشنا ہوتے، اس لئے لڑکی کی رخصتی نہ ہوتی، جب وہ بالغ ہو جاتے تو لڑکی کو رخصت کیا جاتا، اس موقع پر بھی جشن منایا جاتا، اور جہیز کے طور پر اپنے مقدور کے مطابق سامان دیا جاتا، اس رسم کو گونا کہا جاتا ہے، اب یہ تقریباً متروک ہے،

چند اور رسمیں: مذکورۂ بالا رسمیں شادی کے موقع پر یعنی شادی سے چند دن قبل عین شادی کے دن اور شادی کے فوراً یا چند دن بعد ادا کی جاتی ہیں، اور ان میں سے ہر حصہ

---

[۱] سید احمد دہلوی، رسوم دہلی، ص ۱۰۶، [۲] ایضاً ص ۷، ۳۔ ۱۳۶، نیز حاشیہ ۳ نور الحسن نیر، نور اللغات حصہ دوم، [۴] سید احمد دہلوی، رسوم دہلی ص ۱۳۷

لینے والے کے لئے دلچسپی اور خوشی کا باعث ہوتی ہیں۔ لیکن بعض رسمیں ایسی بھی ہیں، جو عمر بھر ادا کی جاتی ہیں۔ ان کے مختلف مواقع ہیں، مثلاً

عیدی: رمضان کے مہینے میں کسی وقت دولھا کے میکے سے اس کے لئے عیدی بھیجی جاتی ہے، اس میں حسبِ استطاعت کپڑا اور چند اور چیزیں ہوتی ہیں، سویاں اور سویوں کا مسالا عیدی کے لازمی اجزا ہیں،

جڑا اول: پہلے جاڑے کے موقع پر دولھن کے لئے جاڑے کے کپڑے جس میں رضائی بھی شامل ہوتی ہے بھیجے جاتے ہیں،

ساونی:۔ مٹھائی، آم، ترکاریاں، میوے وغیرہ ساون کے مہینے میں جھولے کے سامان کے ساتھ دولھا کے گھر سے دولھن کے لئے بھیجے جاتے ہیں۔ اس رسم کو ساونی کہا جاتا ہے، اس رسم کی ادائی منگنی کے بعد ہی سے شروع ہو جاتی ہے،

اگہنی:۔ شمالی ہند میں اگہن کے مہینے میں، جوڑا، لائی، موسمی ترکاریاں وغیرہ دولھن کے میکے سے بھیجی جاتی ہیں

بدھاوا: شادی بیاہ کی تقریبوں میں صاحبِ تقریب کے گھر جو جوڑا بھیجے ہیں، اسے بدھاوا کہا جاتا ہے،
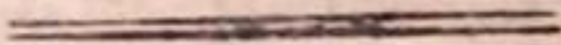
ج: میت کی رسمیں

موت اور زندگی لازم و ملزوم ہیں۔ موت کے بغیر زندگی مکمل نہیں ہو سکتی، میت کے ضمن میں جہاں چند شرعی یا مذہبی احکام پر عمل ہوتا ہے، وہیں ابن آدم کی بنائی ہوئی بہت سی رسمیں بھی ادا کی جاتی ہیں، ان رسموں کے ذریعے بھی اردو الفاظ کے ذخیرے میں اضافہ ہوا ہے، ان کا ذکر ذیل میں کیا جاتا ہے،

خود مرنے کے لئے متعدد الفاظ اور محاورے استعمال ہوتے ہیں، مثلاً گذرنا، انتقال کرنا، وفات پانا، فوت ہونا، دنیا سے منہ موڑنا، دنیا کو خیرباد کہنا، وصال ہونا یا فرمانا، داغِ مفارقت دینا، داغ جدائی دینا، اللہ کو پیارا ہونا، رحلت کرنا وغیرہ،

تکفین و تدفین:۔ مسلمانوں کے یہاں مردے کو دفن کیا جاتا ہے، دفن کرنے سے پہلے غسل دیا جاتا اور کفن پہنایا جاتا ہے، غسل دینے والے کو غسّال بھی کہتے ہیں، اور مردہ شو بھی، غسّال میت کو غسل دینے کے وقت ہاتھ میں کپڑے کی تھیلی پہن کر مردہ کا جسم دھوتا ہے، اس تھیلی کو کیسا کہتے ہیں، غسل دینے کے بعد مردے کے جسم میں ایک خوشبو لگائی جاتی ہے جو حنوط کہلاتی ہے، اس کے بعد مردے کو کفن پہنایا جاتا ہے جسے تکفین کہتے ہیں، کفن میں مردوں کے لئے تین کپڑے سنت ہیں۔ (۱) لفافہ (۲) ازار (۳) قمیص،

جس چادر میں پورے جسم کو لپیٹا جاتا ہے، اسے لفافہ کہتے ہیں، اور اس کے اوپر تہبند کی طرح جو چادر بچھائی جاتی ہے، وہ ازار کہلاتی ہے، قمیص وہ کفنی ہے، جس میں کلیاں، آستینیں،

وغیرہ نہیں ہوتیں،

عورتوں کے لئے پانچ کپڑے سنت ہیں۔ (۱) لفافہ (۲) ازار (۳) خرقہ (۴) درع، (۵) خمار،

جیسے مردوں کو قمیص یعنی کفنی پہنائی جاتی ہے، عورتوں کو درع پہناتے ہیں جو چادر ہے، اسے سینے کے اوپر سے چاک کر دیتے ہیں، خمار اوڑھنی کو کہتے ہیں، اوڑھنی کو دامنی بھی کہا جاتا ہے،

تکفین کے بعد جنازہ تیار ہو جاتا ہے، اور اسے چارپائی کی طرح کی ایک چیز پر جسے تابوت کہتے ہیں اور نعش بھی کہتے ہیں اور جو خاص اسی مقصد کے لئے تیار کیا جاتا ہے، رکھ کر دفن کے لئے لے جاتے ہیں، دیہاتوں میں چارپائی ہی استعمال ہوتی ہے، زنانہ میت کا بعد وار ڈولا جس میں لاش بھی رہتی ہے، گورکنوں کی اصطلاح میں گہوارہ کہلاتا ہے، تابوت یا چارپائی کو مردے کے عزیز، رشتہ دار، دوست احباب کاندھوں پر رکھ کر لے جاتے ہیں، اسے کاندھا دینا کہتے ہیں،

دفن کرنے سے پہلے نماز جنازہ پڑھائی جاتی ہے، جب نماز جنازہ ہو جاتی ہے تو میت کا وارث یا گھر کا بڑا بوڑھا کہتا ہے کہ نماز ہو چکی، اب جو لوگ چاہیں جا سکتے ہیں، اسے اذنِ عام کہتے ہیں،

اب دفن کرنے کی منزل آتی ہے، اس کے لئے قبر کھود کر تیار رکھی جاتی ہے، قبر دو طرح کی ہوتی ہے بغلی اور صندوقچی۔ ایک لمبا گڑھا کھود کر اس کے پہلو میں قبلہ رخ قبر بنا کر اسمیں مردے کو لٹا دیتے ہیں اور اسے دیوار کی طرح چن دیتے ہیں، پھر گڑھے کو بھر کر اوپر سے نشان بنا دیتے ہیں، ایسی قبر کو بغلی قبر کہتے ہیں، صندوقچی قبر میت کے قد کے برابر لمبی اور قدِ آدم کے برابر گہری ہوتی ہے، جس بغلی گڑھے میں مردے کو رکھا جاتا ہے، اسے لحد کہتے ہیں،

قبر کے لئے اردو میں تربت، گور، مدفن، مزار، مرقد، مقبرہ وغیرہ بھی مستعمل ہیں، تربت دراصل کچی قبر ہے، لیکن ہر قسم کی قبر کے لئے یہ لفظ استعمال ہوتا ہے، بزرگانِ دین اور قابلِ احترام

شخصیتوں کے مقبروں کو، روضہ کہا جاتا ہے، روضے کے معنی ہیں ہرا بھرا باغ،

جس جگہ میں مردے کو دفن کیا جاتا ہے یا بہت سی قبریں ہوتی ہیں، اسے قبرستان گورستان

وغیرہ کہا جاتا ہے، قبرستان کے سناٹے کی مناسبت سے اسے شہر خموشاں بھی کہتے ہیں،

اب آخری منزل آتی ہے، یعنی مردے کو قبر میں اتارا جاتا ہے اور اوپر سے گیلی مٹی

رکھی جاتی ہے، اسے تدفین کہتے ہیں، گورکنوں کی اصطلاح میں اسے گل درگل کرنا کہتے ہیں،

اس کے بعد جو لوگ موجود ہوتے ہیں، وہ مٹھیوں سے خشک مٹی قبر کے گڑھے میں ڈالتے ہیں

اسے مٹی دینا کہتے ہیں،

مٹھیوں میں خاک لے کر دوست آئے وقتِ دفن　　زندگی بھر کی محبت کا صلہ دینے لگے

مٹی ٹھکانے لگنا مشہور محاورہ ہے جو اسی سے بنا ہے،

مردے کے دفن کرنے کو تدفین اور پورے عمل کو تکفین و تدفین کہا جاتا ہے، تجہیز و تکفین

بھی اس مفہوم میں استعمال ہوتا ہے، کفن کا ٹھٹی کرنا بھی کہتے ہیں،

کفن چور مشہور محاورہ ہے، جو موذی چور کے لئے استعمال ہوتا ہے،

دفن کرنے کے بعد جب تربت یا قبر اپنی مکمل صورت میں آجاتی ہے، تو بعض جگہوں میں

اس کے سرہانے ایک پتھر لگا دیا جاتا ہے، تاکہ معلوم ہو کہ یہاں قبر ہے، اسے شاہد کہا جاتا ہے وہ

پتھر جو تربت پر رکھنے کے لئے بنایا جاتا ہے، تعویذ کہلاتا ہے، تعویذ کی مختلف شکلیں ہوتی ہیں، اور

اس کے مختلف اصطلاحی نام ہیں، مثلاً پلنگ کی شکل کے تعویذ

کو پلنگڑی کہا جاتا ہے، وہ تعویذ جس کی سطح پر پانی بھرنے کو چھوٹی سی ہودی بنی ہو، ہودی کا

تعویذ کہلاتا ہے، اس تعویذ کو جس کا اوپر کا حصہ محراب دار ہو، محرابی یا گولے کا تعویذ کہتے

ہیں، زنانی قبر کے تعویذ کو جس کے اوپر وسط میں تکیے نما شکل بنادی جاتی ہے، گہوارے کا

تعویذ کہا جاتا ہے، قبر کے سرہانے پتھر کی جو سل لگائی جاتی ہے، اسے لوح یا لوحِ مزار یا لوحِ تربت کہتے ہیں، اس پر میت کا نام، تاریخ وفات وغیرہ کندہ ہوتا ہے،

سرداب، سرداوا:- قبر کے ضمن میں اس کا ذکر بھی ضروری ہے، سرداب اس خالی قبر کو کہتے ہیں جو کسی کے لئے اس کے مرنے سے پہلے تیار کی گئی ہو یا وہ جگہ جو کسی کی قبر کے لئے مخصوص کر دی گئی ہو،

چراغاں:- مردے کی قبر کے سرہانے بعض لوگ چراغ جلاتے ہیں، انھیں چراغاں کہا جاتا ہے،

طاقِ مزار:- قبر کے سرہانے چراغ رکھنے کو بنی ہوئی برجی کو طاقِ مزار کا شاعرانہ نام دیا گیا ہے،

توشہ:- بعض جگہوں میں ایک رسم یہ بھی ہے کہ میت کے ساتھ حلوا روٹی بھیجتے ہیں جو تدفین کے بعد کسی فقیر کو کھلا دی جاتی ہے، اسے توشہ کہتے ہیں،

حاضری:- میت کو دفن کر کے لوگ اس کے مکان پر آکر فاتحہ پڑھتے ہیں، بعض جگہوں میں انھیں کھانا کھلایا جاتا ہے، جسے حاضری کہتے ہیں، اسے کڑوی روٹی یا کڑوی کھچڑی بھی کہا جاتا ہے، چونکہ میت کے گھر کے لوگ غم کی حالت میں ہوتے ہیں، اور ان کے یہاں کھانا نہیں پک سکتا، اس لئے ان کے اعزہ سوگ کے تین دن تک ان کے یہاں باری باری سے کھانا بھیجتے ہیں، اسے بھی حاضری کہتے ہیں، بھاتی بھی کہتے ہیں، اور کڑوا بھی،

تعزیت:- کسی کے یہاں میت ہو جاتی ہے تو اس کے اعزہ، احباب وغیرہ اسے تسلی دینے اس کے گھر پر جاتے ہیں، اسے تعزیت یا پرسا کہتے ہیں، اگنا کرنا بھی کہتے ہیں،

فاتحہ سوم:- اسے پھول، پھولوں کی رسم، پھولوں کا دن، اور تیجے کے پھول بھی کہا جاتا ہے، یہ ہندوؤں سے لی ہوئی رسم ہے، ہندوؤں کے یہاں مردے کی جلی ہوئی راکھ اور

ہڈیوں کو پھول کہتے ہیں، جنھیں تیسرے دن گنگا میں بہا دیا جاتا ہے، اسے دیکھ کر مسلمانوں نے فاتحہ سوم ایجاد کی، اسے سویم اور تیجا بھی کہتے ہیں، دکن میں اس رسم کو زیارت کہا جاتا ہے، یہ عموماً وفات کے تیسرے دن ہوتی ہے، شعرا نے بھی پھولوں کی رسم کا ذکر کیا ہے، مثلاً:

کہیں بیاہ کا دیکھا ہے یہ معمول کہ شہ کی چوتھی کہ تیجے کے ہوں پھول

قبر پر بھی یہ پھول چڑھائے جاتے ہیں،

مرے مزار پہ رکھ دو بجھو منہدی کہ میں شہید ہوں اس پنجۂ حنائی کا

گل کھا موئے تھے جن کے لئے جسم زار پر دو پھول بھی نہ لائے کبھی وہ مزار پر (مصحفی)

ارگجا: ایک مرکب خوشبو ہے، جو تیجے کے دن ایک پیالے میں بھر کر محفل میں رکھتے ہیں، ہر فاتحہ خواں پیالے میں ایک پھول ڈال دیتا ہے، وہ پھول قبر پر چڑھائے جاتے ہیں،

بھتی، حلوائے مرگ: عورتوں میں گھر کے اندر حلوے پر مردے کی نیاز دلوائی جاتی ہے، اسے بھتی یا حلوائے مرگ کہتے ہیں،[1]

دسواں، بیسواں، چالیسواں وغیرہ: مرنے کے دسویں، بیسویں اور چالیسویں دن مردے کی روح کو ثواب پہنچانے کے لئے فاتحہ کی جاتی ہے، کہیں کہیں مہینے یا تیسویں دن کی بھی فاتحہ ہوتی ہے، چالیسویں کو چہلم بھی کہتے ہیں، چہلم کے موقع پر عزیز و اقارب اور احباب کو کھانا کھلایا جاتا ہے، اسے روٹی کرنا کہتے ہیں،

عرفہ: بعض علاقوں میں جس سال آدمی کا انتقال ہوتا ہے، اس سال کی شب برات کو فاتحہ نہیں دلواتے بلکہ عرفہ کو یعنی شب برات کے ایک روز پہلے نیاز دلواتے ہیں، شب برات کے پہلے دن کو عرفہ کہتے ہیں،

سہ ماہی، چھ ماہی، برسی: مرنے کے تین مہینے، چھ مہینے اور سال بھر بعد تاریخِ وفات پر نیاز دلوائی جاتی ہے،

---

[1] سید احمد دہلوی: رسوم دہلی ص ۱۵۱

دیسا : مرنے کے دو برس بعد تاریخِ وفات پر نیاز دلوائی جاتی ہے، اس رسم کو دیسا کہتے ہیں،

تبارک : تبارک قرآن مجید کی ایک سورت ہے، اس کے لفظی معنی بزرگ کے ہیں، اس کی ایک خصوصیت یہ بتائی جاتی ہے، کہ اس کا ورد رکھنے والا قبر کے عذاب اور حشر کی سختیوں سے محفوظ رہے گا، اس مناسبت سے بعض جگہوں میں مرنے کے بعد رجب کا مہینہ آتا ہے تو جمعرات یا جمعہ کے دن مردے کی روح کو ثواب پہنچانے کے لئے کم سے کم اکتالیس مرتبہ سورہ تبارک پڑھ کر بخشتے ہیں،

قل : تکیے داروں کی اصطلاح ہیں قبر پر حاضر ہو کر مردوں کے لئے دعائے خیر کرنے کو کہا جاتا ہے،

دستار بندی : بعض علاقوں میں اگر کسی کا باپ مرجاتا ہے تو اسے جائز وارث قرار دینے کی غرض سے ننہال والوں کی طرف سے پگڑی بندھوائی جاتی ہے، اس رسم کو دستار بندی کہا جاتا ہے، سب سے بڑے لڑکے کو باپ کا جانشین قرار دیا جاتا ہے، باقی لڑکوں کو دستار بندی میں ایک ایک پگڑی اور کچھ نقدی دی جاتی ہے، دستار بندی کے بعد ان دیگوں پر نیاز دی جاتی ہے جن میں مہمانوں اور غریبوں کو کھلانے کے لئے کھانا پکایا جاتا ہے[1]،

ہندوؤں کی رسمیں مسلمانوں سے مختلف ہیں، جو رسمیں اردو میں مستعمل ہیں، ان کا ذکر ذیل میں کیا جاتا ہے،

پنچ رتنی : مرتے وقت آدمی کے منہ میں مونگا، موتی، سونا چاندی اور تانبے کے اجزاء ڈالتے ہیں، اس رسم کو پنچ رتنی کہا جاتا ہے[2]،

ارتھی : ہندو اپنی میت کو بانس کی بنائی ہوئی ٹٹی پر لے جاتے ہیں، اسے ارتھی کہتے ہیں، اسے ٹٹری یا ٹھٹری بھی کہتے ہیں،

---

[1] سید احمد دہلوی، رسوم دہلی ص ۵۳-۱۵۲ [2] ظفر الرحمٰن دہلوی، فرہنگ مذکور، جلد ہفتم،

یمان :۔ ایک خاص قسم کی ارتھی ہے،

مرگھٹ : ہندو جس جگہ اپنے مردوں کو جلاتے ہیں، اسے مرگھٹ کہا جاتا ہے، اسے شمشان بھومی بھی کہتے ہیں،

کرپال :۔ جب لاش جلاتے ہیں تو مردے کی کھوپڑی پھوڑی جاتی ہے، اس رسم کو کرپال کہتے ہیں اور لاش کا وارث اس رسم کو ادا کرتا ہے،

بھدرا :۔ ارتھی اٹھنے سے پہلے مردے کے وارث سر کا، داڑھی اور مونچھوں کے بال منڈواتے ہیں، جس کو بھدرا کہتے ہیں۔

پیح رس - کریا کرم :

مردے کے نام پر پانچ چیزیں لڑ، گھی، تیل، روئی، نمک مع جوڑا دان کرتے ہیں، اس رسم کو کریا کرم بھی کہتے ہیں،[1]

پنڈ : مردے کے نام لڈو جو عموماً چاول کے بنے ہوئے ہوتے ہیں، دان کیے جاتے ہیں، ان کو پنڈ کہا جاتا ہے،

اٹھاؤنی ہونا :۔ مردے کے وارث کو پگڑی باندھنے یعنی اس کے قائم مقام بنانے کی رسم ہے، جو تیجے کے دن ادا کی جاتی ہے،[2]

مسلمانوں کے قبرستان اور ہندوؤں کے مرگھٹ کے ساتھ زرتشتیوں کے دخمے کو بھی یاد کر لینا چاہیے، زرتشتی اپنے مردوں کو نہ دفن کرتے ہیں اور نہ جلاتے ہیں، بلکہ کنوئیں کی شکل کے بنے ہوئے ایک تہ خانے میں ڈال دیتے ہیں، جسے دخمہ کہا جاتا ہے،

بعض رسمیں ایسی ہیں جو ملک میں عام ہیں، مثلاً،

---

[1] ظفر الرحمن دہلوی : فرہنگ مذکور جلد ۶ صفحہ [2] ایضاً

بین یا بین کرنا:۔ عورتیں مردے کی خوبیوں کا بیان کر کر کے روتی ہیں۔ اسے بیان یا نوحہ بھی کہتے ہیں،

منہ ڈھانکنا:۔ ماتم دار عورت کو ہر پرسا دینے والی عورت کے ساتھ رونا پڑتا ہے، اسے منہ ڈھانکنا اور پرسا لینا کہتے ہیں،

اخیر دان:۔ اگر کسی کی بیاہی بیٹی مر جاتی ہے تو اس کے والدین یا سگا یا سوتیلا بھائی کفن دفن اور دفنانے کا سارا خرچ اٹھاتا ہے۔ اسے اخیر دان کہتے ہیں[1]،

رنڈسالہ:۔ بیوہ عورتوں کو ایک خاص قسم کا لباس پہنایا جاتا ہے، جسے رنڈسالہ کہتے ہیں[1]،

رنڈسالہ لائے اس کو شبِ عقد کی صبح ۔۔۔ سامان یہ حسینؑ کی دختر کے واسطے (مصحفی)

شادی اور غمی کے موقع پر جو کھانا کھلایا جاتا ہے۔ اسے روٹی کرنا کہا جاتا ہے،

---

[1] سید احمد دہلوی، رسوم دہلی ص ۲۰۰۔۲۰۴،

د: توہمات کی بنیاد پر رسمیں

توہم پرستی ہندوستان میں عام ہے، مسلمان بھی جس کا ایمان توحید پر ہے، اس مرض میں گرفتار ہے، ٹونے ٹوٹکے، بلیات، ارواحِ خبیثہ وغیرہ پر عوام خصوصًا ان پڑھ مردوں اور عورتوں کا اعتقاد ہے، اور اس ضمن میں کچھ احتیاط کی خاطر اور کچھ مدافعت کے لئے رسمیں ادا کی جاتی ہیں، اردو زبان میں ان کے اظہار کے لئے مناسب الفاظ محاورے وغیرہ ملتے ہیں، نیچے ان میں سے چند کا ذکر کیا جاتا ہے،

تعویذ اور گنڈا:۔ بیماری سے شفا پانے کے لئے، زچگی میں آسانی ہونے، دشمن کو زیر یا رام کرنے کی خاطر، غرض ہر قسم کی حاجت برآری کے لئے تعویذ اور گنڈے کا استعمال کیا جاتا ہے، روشنائی کے علاوہ بعض تعویذ زعفران کے عرق سے، بعض سفید مرغ کے خون سے، بعض ہدہد کے خون سے لکھے جاتے ہیں، تا کہ اثر جلد اور زیادہ ہو، تعویذ کو موم جامہ کر کے عام طور سے نیلے یا لال ڈورے میں باندھ کر گلے میں لٹکایا جاتا یا بازو پر باندھا جاتا ہے، اسی سے گلے کا تعویذ ہونا محاورہ بنا ہے، تقریبًا اسی مفہوم میں کسی چیز کو تعویذ کرنا بھی محاورہ ہے، قمیص کا تعویذ بھی یہیں سے آیا ہے، قبر کے تعویذ کا ذکر اوپر آچکا ہے، شعرا نے بھی اپنی غزلوں میں گنڈے اور تعویذ کا ذکر کیا ہے، یہاں تک کہ بعض اوقات تعویذ کو ردیف بنا کر پوری پوری غزل لکھ دی ہے، انشا کی ایک غزل کے چند منتخب اشعار نیچے نقل کئے جاتے ہیں،

لکھ دو آخون جی صاحب کوئی ایسا تعویذ	کہ مرے منہ سے لگے اس کے گلے کا تعویذ

دل دھڑکنا ترے عاشق کا نہ جاوے ہرگز — گرچہ سو لاکھ طرح لکھ دے مسیحا تعویذ

گرچہ سیانوں نے پڑھا افسوں بہت اگوا کے دن (ق) — خونِ ہدہد سے مرے واسطے لکھا تعویذ

جی جلا اپنا سا پھونکا کئی لونگ اور اسپند — مشک سیندور اگر مرچ، فلیتا، تعویذ

جس پری کا مجھے سایہ تھا نہ اترا لیکن — کام آیا نہ کسی شخص کا گنڈا تعویذ

چند مفرد اشعار:

تعویذ بغل سے گی نہ پھرے گھمنڈ پر — ایک نیلا ڈوریا باندھیے اس گوورے ڈنڈ پر
(انشا)

اب کوئی ہما ہو تو اسے ذبح کریں ہم — تعویذ بہت لکھ چکے ہدہد کے لہو سے
(انشا)

تم کبھی گور غریباں پر گزر کرتے نہیں — قبروں کے تعویذ اتنا بھی اثر کرتے نہیں
(رشک)

سرمہ منظور نظر ٹھہرا ہے چشمِ یار کو — نیل گوں گنڈا پہنایا مردم بیمار کو
(آتش)

تعویذ سے جس طرح محاورے بنائے گئے ہیں، اسی طرح اس سے تشبیہ کا بھی کام لیا گیا ہے، مثلاً کبوتر کی مختلف قسمیں ہیں، ان میں سے ایک قسم وہ ہے جس کی گردن میں سفید پر تعویذ کی شکل کے ہوتے ہیں، ایسے کبوتر کو تعویذیا کہتے ہیں، پان کا مربع یا چوکھا بیڑا چونکہ تعویذ کی شکل کا ہوتا ہے، اس لئے اسے تعویذی گلوری کہا جاتا ہے،

گنڈے سے بھی چند محاورے بنائے گئے ہیں، جیسے گنڈے دار یعنی حلقے دار، دھاری دار بے سلسلہ ناغہ کر کے، گنڈے دار آواز یعنی وہ آواز جو تان لگاتے وقت کسی جگہ سے ٹوٹ جائے اور گویا خوبصورتی سے اسی جگہ کوئی دوسرا پہلو پیدا کر کے اس کو آخر تک پہنچائے وغیرہ،

تعویذ اور گنڈے کے ضمن میں اسپند، مور کا پنکھ، سونے کا چھلا وغیرہ بھی استعمال ہوتے ہیں، شعرا نے بھی اس کا ذکر کیا ہے، مثلاً انشا کہتے ہیں،

سونے کا چھلا مور کا پر ہی نہیں فقط — ایک زرد پوٹلی میں بھی تھوڑی سپند باندھ

آسیب اور دوسری بلاؤں سے بچنے کے لئے شیر کے ناخن کا بھی استعمال کیا جاتا ہے،

شیر کے ناخن تنگ میں تو الا جینے کو تجھ بیکل ہیں — موت کے رو بہ سے نہ کیا پر آن کے تو اس گل میں

تعویذ کا نام لیتے ہی موم جامہ خود بخود سامنے آجاتا ہے، اس کے بغیر تعویذ کی تکمیل (مسودہ) عموماً نہیں ہوتی،

ارواحِ خبیثہ:۔ جاہل مرد اور عورتیں دونوں جن، بھوت، پریت، چڑیل وغیرہ پر اعتقاد رکھتے ہیں، انھوں نے ان بھوتوں اور جنوں کے نام بھی رکھ لئے ہیں، مثلاً شیخ سدو، زین خان، ننھے میاں، شاہ دریا، میاں سکندر شاہ وغیرہ، اسی طرح چڑیلوں کے نام بھی رکھتے ہیں، جیسے لال پری، سبز پری، آسمان پری، دریا پری وغیرہ، یہ نام جہلا خصوصاً عورتوں کی زبان پر اکثر رہتے ہیں، شعرا نے بھی انھیں نظر انداز نہیں کیا ہے، شاید اس لئے کہ ان کی بدولت اولادِ آدم کی زندگی میں کچھ دیر کے لئے سہی، ایک ہلچل مچ جاتی ہے، نیچے صرف دو شعر مثالاً نقل کئے جاتے ہیں،

کیا ترے سر آچڑھے چاروں کے چاروں الاماں — شاہ دریا، شیخ سدو، زین خاں، ننھے میاں

نہ یہ حال لال پری سے کہہ نہ تو زین خاں وہی ہم — ارے انشا اپنے ہی جی سے کہہ کسی پہ دل نہ دھرے (انشا)

جادو یا سحر: اس کی بنیاد پر بہت سے محاورے وجود میں آئے، مثلاً جادو اتارنا، جادو اترنا، جادو الٹ جانا، جادو جگانا وغیرہ، جادو کا پتلا، جادو نظر، جادو نگاہ، جادو نفس (کنایۃً معشوق) جادو بیان، جادو بھری آواز وغیرہ دلچسپ صفتیں ہیں، جن کا استعمال اردو میں عام ہے، اسی طرح جادو وہ جو سر پر چڑھ کے بولے مشہور مثل ہے، سحر چلنا، سحر کر دینا مشہور محاورے ہیں، سحر آمیز (مرغوب) سحر بیان وغیرہ صفت کے طور پر عموماً استعمال ہوتے ہیں، سحرِ حلال (فصیح اور مؤثر کلام) شعر میں اکثر استعمال ہوتا ہے،

بچھا ور اتارنا:۔ رفع بلا کے لئے بچھاور اتاری جاتی ہے اور اسے محتاجوں اور مسکینوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے، شعرا نے بھی اسے اشعار میں استعمال کیا ہے، مثلاً،

کیا فقظان کے نچھاور کے لئے اے انشاؔ
اپنی مٹھی میں ہر ایک غنچہ نے زر لیتا ہے

بلائیں لینا: عورتیں جب کسی عزیز کو مدت کے بعد دیکھتی ہیں، یا گھر سے رخصت کرتی ہیں؛ یا کوئی خوشی کا موقع ہوتا ہے تو اس کے سر پر اپنے دونوں ہاتھ پھیر کر اپنی کنپٹیوں پر انگلیوں کو چٹخاتی ہیں گویا اس پر قربان ہوتی ہیں، اس فعل کو بلائیں لینا یا جٹ چٹ بلائیں لینا کہتے ہیں، آتشؔ کا ایک شعر ہے،

ٹھہرے ہے اس کے صرف نہ بلبل نے غش کیا
جٹ چٹ بلائیں غنچوں نے لیں بلبل نے غش کیا

بلائیں لینا محاورے کے طور پر استعمال ہوتا ہے، بڑا مشہور شعر ہے،

اے مصور ترے ہاتھوں کی بلائیں لے لوں
خوب تصویر بنائی مرے بہلانے کو

ماتھے پر ٹیکا لگانا: نظر بد سے بچنے یا بچانے کے لئے ماتھے پر ٹیکا لگایا جاتا ہے، اس کا استعمال بھی نثر و نظم دونوں میں ہوتا ہے،

چھینکنا: اگر کوئی شخص کسی کام کے ارادے سے گھر سے نکل رہا ہو یا نکلنے والا ہو اور کسی کو چھینک آجائے، تو ہندوستان میں سے بدشگونی سمجھا جاتا ہے، مصحفیؔ کا شعر ہے،

اے مصحفیؔ نہ دیکھا روئے وطن پھر آخر
شاید کہ چھینکتے تو اے یار گھر سے نکلا

چیچک: ہندو چیچک یا سیتلا کو دیوی کی حیثیت سے پوجتے ہیں، اسی لئے اسے ماتا مائی کہتے ہیں[۱]، ہندوستانی مسلمان بھی اس توہم میں گرفتار ہیں،

پا تراب: سفر کی منزل کے طور پر نیک ساعت میں ایک مکان سے دوسرے مکان میں چلا جانا[۲]

چاپ: جب کوئی عزیز سفر سے واپس آتا ہے تو اس کے کنبے والے دھوئے ہوئے تل چاول، اور شکر سینوں میں لگا کر بھیجتے ہیں[۳]،

۱؎ سید احمد دہلوی، رسوم دہلی ۲؎ ۳؎ نور الحسن نیر، نور اللغات حصہ دوم،

تہوار جشن وغیرہ

آدمی کو سماجی جانور کہا گیا ہے، وہ تنہا زیادہ دیر تک نہیں رہ سکتا، وہ خود بولنا چاہتا ہے اور دوسروں کی باتیں سننا پسند کرتا ہے، دوسروں سے ملنے جلنے اور ہنسنے بولنے سے اس کی تفریح ہوتی ہے، یہ تفریح کبھی اس کی خوشی کا باعث ہوتی ہے اور کبھی اس کے غم کو دور کرنے کا سبب بنتی ہے، وہ جب کام سے فارغ ہوتا ہے، تو خصوصاً دوست احباب میں بیٹھ کر خوش طبعی کرنا پسند کرتا ہے، اس کی یہ تفریح انفرادی سے بڑھ کر اجتماعی شکل اختیار کر لیتی ہے، دنیا کی ترقی کے ساتھ ساتھ اس کی تفریح اور اس کے ذرائع میں اضافہ اور تنوع ہوتا گیا، کبھی اس نے اپنے کسی بزرگ کی پیدائش کے دن خوشی منائی، کبھی اپنے کسی پرکھے کی فتح کا جشن منایا، کبھی کسی مقدس موقع پر نماز دوگانہ ادا کی، کبھی موسم کی خوشگوار تبدیلی پر رقص و سرود کی محفل گرم کی، رفتہ رفتہ یہ خوشیاں، یہ جشن اور یہ جلوس آدمی کی معاشرتی زندگی کا ایک اہم جزبن گئے اور میلے اور تہوار کے نام سے موسوم ہوئے، میلے اور تہوار دنیا کے ہر ملک اور ہر قوم میں منائے جاتے ہیں، لیکن ہندوستان اس میدان میں دوسرے ملکوں سے آگے ہے، اہل ہنود کے یہاں خصوصاً تہواروں کی کثرت ہے، جیسے یہ تہوار دلچسپ ہیں، ویسے ہی ان کے نام بھی دلچسپ ہیں، اردو نے یہ نام بعینہٖ اپنے اندر جذب کر لئے ہیں، نیچے چند نام ہندوستانی یا ہندو تہواروں اور میلوں کے دیئے جاتے ہیں، جو اردو میں عام طور سے استعمال ہوتے ہیں،

چیت نومی، رکھشا بندھن، ہریالی تیج، درگا پوجا، جنم اشٹمی، کنھیا جی کی راس، دسہرہ، دیوالی

رام نومی، رام لیلا، شیوراتری، کچھڑمی، بلدیوجی کا میلہ، کمبھ کا میلا، بہتے کا میلا، بسنت، ہولی، آٹھوں کا میلا وغیرہ۔

مذکورۂ بالا تہواروں میں رکھشا بندھن، جنم اشٹمی، دسہرہ، دیوالی، شیوراتری، بسنت، ہولی وغیرہ خصوصاً اہم ہیں۔ ان میں سے اکثر پر شعرائے نظمیں کہی ہیں۔ میر تقی میر نے ہولی کو وہی اہمیت دی ہے، جو ایران میں جشن نوروز کو حاصل ہے۔

جشنِ نوروزِ ہند ہولی ہے   راگ رنگ اور بولی ٹھولی ہے

لنگوٹی میں پھاگ کھیلنا مشہور محاورہ ہے، جو اسی راگ رنگ کی بنیاد پر بنا ہے۔

قمقمے گلال اور عبیر اس تہوار کی خاص چیزیں ہیں۔ ان کی مقبولیت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ غزلیہ اشعار میں ان کا ذکر پایا جاتا ہے۔ طوالت کے خیال سے مثالیں دینے سے گریز کیا جاتا ہے۔

آٹھوں کا میلہ: ہولی کے آٹھ دن بعد ہوتا ہے، اسی لئے اس کا یہ نام پڑا۔ اس میلے نے بھی زبان سے گذر کر شعر و ادب میں اپنی جگہ بنالی ہے، مثلاً

پھبن اگر جھب، نگاہ سج دھج، چال طرازِ خرام آٹھوں

نہ ہو دیں اس بت کے گر پجاری تو کیوں ہو میلے کا نام آٹھوں

آٹھ آٹھ آنسو نہ اب کیونکر پڑے روئیں ہم   چھوڑ تنہا ہمیں آٹھوں کے چلے میلے میں تم (انشا)

زیب دیتا ہے تماشا گاہِ عالم گر کہوں   جس طرف گذرے ہر اک محو تماشا ہو گیا

غمزہ و انداز و ناز و کبر و مہر و لطفِ حسن   سات یہ اور ایک تم آٹھوں کا میلہ ہو گیا (جرأت)

مسلمان اپنی تقریبات جو تعداد میں بہت کم ہیں، اپنے ساتھ لے کر آئے، یہ تقریبات (جتری) زیادہ تر دینی ہیں نیچے ان کا ذکر کیا جاتا ہے۔

عیدین:۔ مسلمانوں کی سب سے اہم تقریبات ہیں، ایک کو عید الفطر کہا جاتا ہے، اور دوسری عید اضحیٰ کہلاتی ہے، ہندوستان میں انہیں تہوار کے طور پر منایا جاتا ہے، اس دن مسلمان صبح سویرے نہا دھو کر اور اپنی حیثیت کے مطابق اچھے اچھے کپڑے پہن کر نماز ادا کرتے ہیں، اس نماز کو نماز عید کے علاوہ دوگانہ بھی کہتے ہیں، یہ مسجد میں بھی ادا کی جا سکتی ہے، لیکن عموماً یہ ایک ہر طرف سے کھلی ہوئی بے چھت کی عمارت میں ادا کی جاتی ہے، جو بستی سے باہر ہوتی ہے، اسے عید گاہ کہتے ہیں، نماز ختم ہونے پر لوگ آپس میں مصافحہ کرتے یا گلے ملتے ہیں، جسے معانقہ کہا جاتا ہے، اسے عید ملنا بھی کہتے ہیں، شہروں میں عید کی شام کو یا عید کے دوسرے یا تیسرے دن جشن عید منانے کے لئے جلسہ ہوتا ہے اسے عید ملن کہا جاتا ہے، اس موقع پر عطر سوئیاں، شیر خرما، قربانی وغیرہ کی بھی اہمیت ہے، عید کی بنیاد پر چند محاورے بھی بن گئے ہیں، مثلاً عید کا چاند ہونا یا نکلنا، چاند مبارک، عید ہونا، عید کے پیچھے ٹر وغیرہ مشہور کہاوتیں ہیں، اس پُرمسرت موقع پر بچوں کو عیدی دیتے ہیں، جو روپے پیسے کی شکل میں ہوتی ہے، قربانی عید اضحیٰ میں ہوتی ہے،

عید کے موقع پر شعراء اپنے آقایانِ ولی نعمت کی خدمت میں تہنیت پیش کیا کرتے تھے مثلاً میر حسن نے اپنے مربی جواہر علی خاں کی خدمت میں "تہنیت عید" کے عنوان سے ایک مختصر مثنوی پیش کی تھی، اس کے چند منتخب اشعار نیچے نقل کئے جاتے ہیں،

کدھر ہے تو اے ساقیٔ لالہ فام	مے تہنیت سے پلا مجھ کو جام
کہ آیا ہے دن عید کا میری جاں	خوشی ہر طرف ہے ترقی میں یاں
نماز جماعت کی ہونی قطار	گلستانِ دینِ نبی کی بہار
گھٹاؤں کا ہونا ادھر سے طلوع	مبارک سلامت کی ادھر شروع
پئے تہنیت مومنوں کا ہجوم	ہر اک دم میں اٹھ اٹھ کے ملنے کی دھوم

لگا عطر ہر ایک کو بخشنا | اس انداز سے واں کر اصل تعلی
مبارک ہو نواب ناظر کے تئیں | کہ حجت نہیں اس میں حافظ کے تئیں
موافق رہیں سب ملے یک دگر | سویوں میں جس طرح شیر و شکر

عید میلاد النبی:۔ ربیع الاول کی بارہ تاریخ کو رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش کا جشن منایا جاتا ہے، تسبیح و تہلیل کے علاوہ مولود خوانی بھی ہوتی ہے،

عید غدیر:۔ حجۃ الوداع سے واپسی کے موقع پر رسول اکرمؐ نے غدیر کے مقام پر قیام فرمایا تھا اور جو مسلمان اس وقت موجود تھے ان کو جمع کر کے خطبہ دیا، خطبے کے بعد آپؐ نے حضرت علیؓ کا شانہ پکڑ کر فرمایا کہ میں جس کا مولا ہوں، علیؓ اس کے مولا ہیں، جس نے علیؓ کو عزیز رکھا اس نے مجھے عزیز رکھا، جس نے ان سے دشمنی کی، گویا مجھ سے دشمنی کی، اس لئے یہ دن شیعہ حضرات کی نگاہ میں خوشی کا دن ہے، اور وہ اس دن جشن مناتے ہیں، بعض شعرا نے بھی اسے موضوعِ سخن بنایا ہے،

محرم:۔ محرم نے بھی ایک تقریب کی شکل اختیار کر لی ہے، اس تقریب کا اہم ترین جز تعزیہ یا تعزیہ داری ہے، بڑے بڑے شہروں سے لے کر چھوٹے چھوٹے دیہاتوں تک میں تعزیے بنائے اور بٹھائے جاتے ہیں، یہ تعزیے لکڑی اور رنگین کاغذ سے لے کر صندل، ہاتھی دانت، چاندی، انڈے وغیرہ تک کے بنائے جاتے ہیں، ان تعزیوں کو بجنہ کھلے ہوئے چوک پر رکھا جاتا ہے، تاکہ عقیدت مندان کی زیارت کر سکیں، تعزیے کے ضمن میں علم، پنجہ، نوبت، باجا، تاشا، بنوٹ، گتکا، چھری وغیرہ کی بھی اہمیت ہے،

امام باڑے:۔ محرم کے پہلے عشرے میں امام باڑوں میں نشستیں ہوتی ہیں، اور نوحے اور مرثیے پڑھے جاتے ہیں، جن میں شہدائے کربلا کی داستانِ غم کا ذکر ہوتا ہے اور ان کے مناقب

بیان کئے جاتے ہیں۔ ان نشستوں کو اصطلاحی طور پر مجلس عزا یا مجلس عزاداری یا مختصراً صرف مجلس کہتے ہیں، شہداء کی داستانِ غم اور مناقب بیان کرنے والے کو ذاکر کے لفظ سے یاد کیا جاتا ہے، ذاکر کی مختلف قسمیں ہیں، ان میں سب سے پہلے علمائے مجتہدین ہیں، پھر حدیث خواں ہیں، جو احادیث کو سنا کر ایسی پُر درد اور سوز و گداز کی آواز میں فضائل ائمۂ اطہار و مصائب آل رسول بیان کرتے ہیں کہ سامعین بے اختیار رونے لگتے ہیں، اور کیسا ہی سنگ دل ہو، ضبط گریہ نہیں کر سکتا[1]، ان کے دوسرے بھائی واقعہ خواں ہیں، جو واقعات و مصائب اہل بیت کو ایسے الفاظ اور ایسی فصیح عبارتیں سناتے ہیں کہ جی چاہتا ہے سنتے ہی رہیے اور روتے رہیے[2]، ان کے علاوہ مرثیہ خواں یا تحت اللفظ خواں ہیں، جو مرثیوں کو شاعرانہ انداز سے سناتے ہیں[3]، مرثیہ خوانوں کے بعد سوز خواں ہیں، یہ لوگ نوحوں اور مرثیوں کو اصول موسیقی کی پابندی سے گا کے سناتے ہیں[4]، اردو نثر کی ایک قدیم کتاب کربل کتھا کے وجود میں آنے کا سبب یہی مجلسیں ہیں۔

محرم کے مذکورہ بالا دنوں میں مختلف چیزوں خصوصاً شیرینی اور شربت پر فاتحہ دی جاتی ہے، علموں کے سامنے حلوے بھرے کونڈے رکھے جاتے ہیں، جو بعد میں غریبوں اور محتاجوں میں تقسیم کر دیئے جاتے ہیں، جگہ جگہ پانی اور شربت پلانے کا انتظام ہوتا ہے، اسے سبیل کہا جاتا ہے،

عاشورے کے دنوں میں امام باڑوں میں روشنی کی جاتی ہے، جسے چراغاں کہا جاتا ہے، الاؤ جلا کر ان پر کودنے اور ماتم کرنے کا بھی چلن تھا جو اب بھی لکھنؤ میں باقی ہے،

ساتویں محرم کو امام قاسم کی شادی کی یادگار میں جلوس نکلتا ہے، جو مہندی کا جلوس

---

[1] عبدالحلیم شرر لکھنوی، گذشتہ لکھنؤ، ص ۲۰۵ [2] ایضاً۔ [3] ایضاً۔ [4] ایضاً ص ۲۰۶،

کہلاتا ہے، دسویں محرم کو تعزیوں کو باجے گاجے کے ساتھ جلوس کی شکل میں کربلا لے جایا جاتا ہے، اور تالاب یا باولی میں دفن کر دیا جاتا ہے،

دسویں محرم کے ایک مہینہ دس دن گزرنے کے بعد چالیسویں دن چہلم کی رسم ادا کی جاتی ہے،

محرم کے ضمن میں محرم کے سپاہی کا ذکر بھی ضروری ہے، عورتیں منت مانتی ہیں، کہ اگر بچہ زندہ رہا تو اسے محرم کا سپاہی بنائیں گی، اسے لڑکپن میں سبز کپڑے پہناتی ہیں، یہی محرم کا سپاہی ہے، اس کو پیک بھی کہتے ہیں،

جو شخص ہمیشہ غمگین یا اداس رہتا ہے اس کی نسبت بولتے ہیں کہ اس کی محرم کی پیدائش ہے،

شب برات:۔ یہ ایک مقدس رات ہے، لیکن عام مسلمانوں میں اس نے تہوار کی حیثیت اختیار کر لی ہے، اس رات میں حلوے اور چپاتی پر خاندان کے مردوں کے نام کی فاتحہ دلائی جاتی ہے اور اسے محتاجوں اور مسکینوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے، اس میں آتشبازی بھی چھوڑی جاتی ہے، جو غالباً ہندوؤں کی دیوالی سے لی گئی ہے، انشا کا ایک شعر ہے،

شب برات جو آئی تو دیکھو انشا ؔ … کہ مچ رہی ہے پٹاخوں کی کیا چاخ پٹاخ

ہر روز روز عید اور ہر شب شب برات، مشہور مثل ہے، جو خوشی کے موقع پر کہتے ہیں،

نوروز:۔ ہندوستان میں جشن نوروز بھی منایا جاتا تھا، یہ ایران کا تہوار ہے اور وہاں موسم بہار کی آمد کی خوشی میں منایا جاتا ہے، اس کے علاوہ فصلوں کے بونے کا موسم بھی یہی ہے، اس لئے قدرتی طور پر اہل ایران اس کی آمد پر خوش ہوتے اور جشن مناتے ہیں، ایرانی تہذیب کے زیر اثر یہ ہندوستان میں بھی منایا جانے لگا، اورنگزیب نے اپنے عہد حکومت میں بند کر کے اس کی جگہ رمضان میں جشن منانا شروع کیا، جسے نشاط افروز کہا جاتا تھا،

اس کی وفات کے بعد پھر منایا جانے لگا، اور ۱۸۵۷ء تک اس کا سلسلہ جاری رہا، آخری مغلیہ تاجدار بہادر شاہ ظفر کے عہد میں ایک جشن کے موقع پر ذوق نے گیارہ اشعار کا ایک قطعہ تہنیت کہا تھا، جس کا پہلا شعر یہ ہے،

آج ہے بلبلِ تصویر تلک زمزمہ سنج
خسروا اس کے تماشا کردہ جشنِ نوروز

مغلیہ بادشاہوں کی تقلید میں نوابانِ اودھ کے یہاں بھی یہ جشن منایا جاتا تھا، وہاں بھی درباری شعرا اس دن تہنیت نامہ کہہ کر نواب کی خدمت میں پیش کرتے اور انعام پاتے،

پھول والوں کی سیر:۔ دہلی کا ایک مشہور میلا ہے۔ اس کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ اکبر شاہ ثانی کے لڑکے مرزا جہانگیر کو انگریزوں نے نظر بند کر کے الہ آباد بھیج دیا، ان کی والدہ ممتاز محل نے منت مانی کہ مرزا جہانگیر چھٹ کر آئیں گے تو حضرت خواجہ بختیار کاکی کے مزار پر انوار پر پھولوں کا چھپر کھٹ اور غلاف چڑھاؤں گی، جب مرزا جہانگیر چھٹ کر آئے تو ان کی والدہ نے منت پوری کی، پھول والوں نے چھپر کھٹ اور غلاف کے ساتھ اپنی ایجاد پھولوں کا ایک پنکھا بھی بنا کر لٹکا دیا، جب یہ مزار پر چڑھایا گیا تو کھانا بھی فقیروں کو کھلایا گیا، بادشاہ کی خوشی کی خاطر قلعہ کے لوگ اور شہر کی خلقت ٹوٹ پڑی، گویا ایک میلا لگ گیا، اکبر شاہ کو یہ میلا پسند آیا، اور اس نے ساون کے مہینے میں ہر برس کے لئے یہ میلا مقرر کر دیا۔[1]

جشنِ تولد پسر:۔ ہندو مسلمان دونوں میں اس کا چلن ہے، پہلے زمانے میں بادشاہوں اور نوابوں کی خدمت میں شعرا تہنیت نامے پیش کرتے اور انعام پاتے،

جشنِ سالگرہ:۔ امرا اور روسا اپنی سالگرہ کا جشن منایا کرتے تھے، شعرا قصیدے اور تہنیت نامے پیش کرتے اور انعام پاتے تھے، انگریزی تہذیب کے زیر اثر سالگرہ اور زیادہ

---

[1] سید احمد دہلوی، فرہنگ آصفیہ، جلد اول،

منایا جانے لگا، اور اس کا چلن آج تک ہے،

جشنِ غسلِ صحت:۔ طویل بیماری کے بعد صحت پاکر جشن منانے کا رواج پہلے عام تھا، جشن کے قطع نظر یہ لفظ یا ترکیب عام ہے۔

عرس:۔ بزرگوں کے مزار پر سالانہ عرس ہوتا ہے، خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ کا عرس تو ایک غیر معمولی حیثیت و اہمیت رکھتا ہے، ان کے علاوہ سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیاء، محبوب الٰہیؒ، خواجہ بختیار کاکیؒ، حضرت نصیر الدین چراغ دہلیؒ، امیر خسروؒ، حضرت اشرف جہانگیر سمنانیؒ، حضرت صابر کلیریؒ، حضرت سالار مسعود غازیؒ، حضرت وارث شاہ، خواجہ گیسو دراز، شاہ غوث گوالیاریؒ، شاہ عبد الحق توشہ ردولویؒ وغیرہ کے عرس بھی سارے ملک میں مشہور ہیں، اس ضمن میں غسل، چادر، پنکھا، چھڑی، میدنی، دھمال کھیلنا، دفالی، چراغ دیا، بتی، قل، بنیاد وغیرہ عرس کی مختلف کڑیاں ہیں، اور یہ الفاظ عقیدت مندوں کی نوک زبان پر رہتے ہیں،

بعض شعراء نے بھی ان چیزوں میں سے اکثر کو موضوعِ سخن بنایا ہے، مثلاً میر حسن نے اپنی ایک مثنوی گلزار ارم میں چھڑیوں اور ان کی روانگی کا منظر دکھایا ہے، چند منتخب اشعار نیچے نقل کئے جاتے ہیں؛

مگن ہو کر چھڑی چلتی تھی واں سے — اٹھے ہم ساتھ اس کے اس مکاں سے
مدار اس قافلے کا تھا چھڑی پر — چلے ہم واں سے چھڑیوں ساتھ مل کر
پہنچ آ کے جب منزل سرِ شام — اتر پڑا ہر اک واں بہ آرام
دفالی واں کھڑی کرتے تھے چھڑیاں — وہ چھڑیاں کیا بھلی لگتی تھیں کھڑیاں
زیادہ حاجی مائل تھے سب سے — رسوم اس کے بجا لاتے ادب سے
دیا باتی سرِ شب روز کرتے — دیئے چھڑیوں کے آگے لا کے دھرتے
بلندی میں ہر اک ایسی چھڑی تھی — کٹوری ماہ کی جس پر جڑی تھی

میدنی کی مقبولیت و اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ بعض شعرا نے اسے ردیف بنا کر پوری غزل کہی ہے، مثلاً انشا کی ایک غزل نیچے نقل کی جاتی ہے۔

یوں چلی مژگاں سے اشک خوں فشاں کی میدنی　　جیسے بہرائچ چلے بالے میاں کی میدنی

عاشقوں کے باغ دل میں شورشیں نالوں کی ہیں　　مجتمع اس جا پہ ہے آہ و فغاں کی میدنی

لخت دل سود غازی نیلے گھوڑے داغ ہے　　جلوۂ انوار سے کروبیاں کی میدنی

عافیت ہر جزو کو ملنا ہے اپنے کل کے ساتھ　　پھر وہیں جاوے گی آخر بے جہاں کی میدنی

اے بکن پور کی تمنا زور ہے کچھ شان ہے　　کھیلے ہے دھمال تیرے عاشقوں کی میدنی

رستمانہ دیکھ انشا کو قشون شاہ میں
لوگ کہتے ہیں کہ آئی سیستاں کی میدنی

فنونِ حرب کھیل تماشا وغیرہ

آدمی طبعاً تفریح پسند ہے، اس لئے روزانہ کے کاروبار سے فرصت پانے کے بعد وہ تفریح کا سامان تلاش کرتا ہے، شجاع قوموں کی تفریحات بھی شجاعانہ ہوتی ہیں، اس کی بزم بھی رزم کی شان سے خالی نہیں ہوتی، میدان جنگ میں وہ جو اسلحے استعمال کرتا ہے، ان میں سے بعض دلچسپ مشغلے کے طور پر بھی استعمال کرتا ہے، اس طرح تفریح کے لمحات میں بھی اس نے رزمیہ فنون کو برقرار رکھا، ہندوستان میں جن رزمیہ فنون کا رواج تھا، وہ حسب ذیل تھے،

لکڑی (لٹھ، لاٹھی، بھکیتی) پٹا، بانا، بنوٹ، مینٹھی، بانک، جل بانک، برچھا، تُم، کٹار، تیر اندازی، بکیتی، سیف اندازی، کشتی، .

لاٹھی ہندوستانی دیہاتوں کی بڑی کارآمد اور پسندیدہ چیز ہے، اس لئے یہ اکثر دیہاتیوں کے ہاتھ میں دیکھی جاتی ہے، فنی اہمیت کے علاوہ بھی اس کی افادیت مسلم ہے، کبیر کے مندرجۂ ذیل دوہے سے اس کی گوناگوں اہمیت و افادیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے،

لاٹھی میں گن بہت ہیں سدا رکھیے سنگ
گہری ندی نارا جہاں تہاں بچاوت انگ
تہاں بچاوت انگ جھپٹ کتے کو مارے
دشمن دوا گر ہوتے ہوں ان کو جھاڑے
کہے گردھر کبیر لے بات باندھو یہ گانٹھی
سب ہتھیار کو چھوڑ و ہاتھ میں رکھو لاٹھی

لاٹھی کی مقبولیت کا اندازہ اس سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ اس کی بنیاد پر محاورے اور کہاوتیں بن گئیں، مثلاً لٹھ لیکے پیچھے پڑنا، لٹھ باز، لٹھ مار، سو کی لاٹھی ایک کا بوجھ، جس کی لاٹھی اس کی بھینس وغیرہ،

اوپر آلاتِ جنگ کے ضمن میں بہت سے ہتھیاروں کے دلچسپ نام دیئے جاچکے ہیں، یہاں چند مزید ناموں کا اضافہ کیا جاتا ہے، جو مختلف فنونِ حرب میں استعمال ہوتے ہیں،

بانک، ہلالی شکل کی چھوٹی چھری،

بچھوا، بچھوے کے ڈنک کی شکل کا چھرا،

راگ، آہنی موزہ جو پوری پنڈلی اور گھٹنے کو ڈھکے رہے،

سنگین، بے دھاری، سیدھی اور نوک دار لمبی چھری،

سوسن پھن دار سیدھی تلوار، چوڑے پھل کی سیدھی تلوار،

صادقی بغیر سینوں کی کمر تک لمبی زرہ[1]

اوپر جن مختلف حربیہ آلات کے نام دیئے گئے ہیں، ان میں سے اکثر کا چلن نہیں رہا، یا بہت کم ہوگیا ہے، لیکن ان کے نام اردو کے ذخیرۂ الفاظ میں محفوظ ہوچکے ہیں، ان ناموں کے علاوہ ان فنون کی بدولت بہت سی دلچسپ اصطلاحات بھی وجود میں آئیں، ان میں سے چند کا ذکر نیچے کیا جاتا ہے،

اندرا، بانکے کے ایک داؤں کا نام،

پھانسی بنوٹ کے ایک داؤں کا نام

جم گھٹ حریف کے وار کو خالی دے کر اس کی پشت کی طرف جھپٹ کر آنے اور گردن پر

---

[1] ظفر الرحمٰن، فرہنگ مذکور، جلد ہشتم۔

جمدھر مارنے کا طریقہ،

دو بچیا، بکنیتی کے ایک داؤں کا نام،

رن سنگھار، حریف کے جسم کے مختلف حصوں پر پے در پے لگائی جانے والی تلوار کی بار ضربیں لگانا،

رومالی کثرت، صرف رومال کی مدد سے حریف کی ضرب سے بچنے کا فن،

حمایل، تلوار کی ضرب جو جسم کو گردن سے ناف تک ترچھا کاٹ دے،

زنجیرہ، حریف سے مقابلے کے وقت تلوار کی ضربوں کا مقررہ قاعدے کے مطابق سلسلہ وار وار،

اس کی مختلف قسمیں ہیں، زنجیرۂ ضرب الجدال، زنجیرۂ ضرب الشدید، زنجیرہ ضرب القتال، زنجیرۂ ظفر پیکر، زنجیرہ فتح نصیب وغیرہ،

سام برن، سیف بازی کی ایک گھائی کا نام،

کانٹا، حریف کو پکڑ کر رانوں کے بیچ میں گانٹھ لینے کا داؤں،

گادمکھ، سیف بازی کا ایک انداز،

گوبار، بنوٹ کا ایک پینترا،

کشتی، کسی زمانے میں ہندوستان کا ایک محبوب فن رہا ہے، بادشاہوں اور امیروں اور رئیسوں کو اس سے بڑی دلچسپی تھی، اور وہ پہلوانوں کی سرپرستی کرتے تھے، ان کی سرپرستی میں کشتی کے دنگل ہوا کرتے تھے، اور جیتنے والوں کو انعام سے سرفراز کیا جاتا تھا۔ کشتی اور دنگل کا سلسلہ آج بھی جاری ہے، اب امراء اور رؤسا کی جگہ عوام اس فن کی سرپرستی کرتے ہیں، اس فن نے جہاں پہلوانوں کی طاقت اور توانائی میں اضافہ کیا ہے، وہیں اردو زبان کے ذخیرۂ الفاظ میں بھی اضافہ کیا ہے، اکھاڑا، دنگل، لنگوٹ، ورزش، کثرت، مگدر، زرزہ، ڈنڑ پیلنا، اینڈنا،

چاروں خانے چت، زمیں پکڑنا وغیرہ عام الفاظ اور محاورے ہیں، اس فن کی بدولت اصطلاحات بھی کثیر تعداد میں بنیں، ورزش یا کثرت اس فن کا پہلا اور اہم ترین ستون ہے، پہلے اسی سے متعلق چند الفاظ اور اصطلاحات نیچے دی جاتی ہیں۔

بیٹھک، ٹانگوں کی ورزش جو ایک خاص طریقے سے کی جاتی ہے،

جوڑی، مگدر،

جوڑی کے ہاتھ، مگدروں کی ورزش،

رومال کے ہاتھ، مگدروں کی ورزش کے خاص طریقے،

لنگر کے ہاتھ، " " "

ملاحی ہاتھ " " "

مور چال، " " "

کژدم انداز، زمین پر اوندھے لیٹ کر، اعضاے بچھو کی شکل بنانے کی کثرت۔

ڈنڑ کے چند اور دلچسپ نام ہیں،

چکر ڈنڈ، ناگ ڈنڑ، شیر ڈنڑ، ہل ڈنڑ، ہنومان ڈنڑ وغیرہ۔

کشتی کی چند دلچسپ اصطلاحات:

بند، پہلے داؤں کا توڑ ہو جانے پر دوسرا اپنا داؤں جس سے حریف پر قابو رہے،

پربند، حریف کے داؤں کا توڑ کرنے کے بجائے جواب میں اپنا داؤں کرنا،

بند کشتی، ایسی کشتی جس میں دونوں پہلوان گتھ جائیں اور داؤں کرنے کے لیے ایک دوسرے کو رگیدتے ہیں،

جوڑ، حریف کے داؤں سے فائدہ اٹھانے کی ترکیب یعنی اس کو اسی کے داؤں

میں پھانس لینے کا پیچ،

چرخ چرخی، حریف کے ہاتھ کو ہاتھ سے پلٹا دینے یا چکرا دینے کا داؤں جس سے وہ گھوم جائے،

دست بند، ایک داؤں کا نام جس میں کہنی کے مقام پر ہاتھ ڈال کر کلائی پکڑتے ہیں، اور حریف بے بس ہو جاتا ہے،

دیوبند، دشمن کش، حریف کے گر جانے پر اس کی ٹانگوں میں ٹانگوں کا پھندا ڈال کر مروڑی دینے کا داؤں،

دھوبی پاٹ، حریف کی ٹانگوں میں سر دے کر کمر پر اندھا اٹھا لینے اور اسے اونچا کر کے پٹک دینے کا داؤں،

صراحی کش، • حریف کی گردن کو ٹانگوں کے اندر لے کر دبانے اور بل دے کر کھینچنے کا داؤں،

قینچ پیچ، حریف کی کمر سے لپٹ کر اس کے ہاتھوں کو قینچی کی صورت پکڑ لینے اور گرا کر وار کرنے کا داؤں،

تیراکی :۔ ہندوستانی لڑکوں اور نوجوانوں کا ایک دلچسپ مشغلہ، قدیم زمانے میں اس کے مقابلے بھی ہوا کرتے تھے، بعض شعراء نے بھی اس کا ذکر کیا ہے، مثلاً نظیر اکبر آبادی کی نظم، آگرے کی تیراکی، تیرنے والے کو تیراک اور پیراک کے علاوہ شناور بھی کہا جاتا ہے، اور پر جل بانک کا ذکر آیا ہے، اس کا تعلق تیراکی سے ہے،

گھوڑ دوڑ :۔ گھوڑے کی سواری قدیم ہندوستان میں رئیسانہ شان کے علاوہ دلیری اور جواں مردی کی بھی نشانی تھی، شہزادوں کو شہسواری کی باقاعدہ تربیت دی جاتی تھی، شہسواروں کے آپس میں مقابلے بھی ہوتے تھے، جو گھوڑ دوڑ کہلاتے تھے، گھوڑ دوڑ ایک شریفانہ اور دلیرانہ قسم کا مقابلہ تھا، انگریزوں کے زمانے میں ریس (RACE) نے اس کی

جگہ لے لی، جو جوے کی ایک قسم ہے۔

شکار:۔ جانوروں اور پرندوں کا شکار آج بھی نوجوانوں کا ایک محبوب مشغلہ ہے۔ اس ضمن میں باز، جرہ، شاہین، عقاب وغیرہ کے علاوہ کتوں کی بھی تربیت کی جاتی ہے شکار کرنیوالا شکاری یا صیاد اپنے دانہ و دام کے لئے مشہور ہے، جال کا لفظ بھی اتنا ہی مشہور ہے، اور اسی سے جال پھیلانا محاورہ بنا ہے، جس کا استعمال عام ہے،

درندوں اور چڑیوں کی لڑائی:۔ آدمی درندوں اور جانوروں کو بھی آپس میں یا ایک دوسرے سے لڑاکر اپنی شجاعت کو تسکین دیتا اور تفریح کا سامان حاصل کرتا ہے، قدیم روما میں اس کا آغاز ہوا، اور بیسویں صدی کے تقریباً وسط تک دنیا کے مختلف ممالک میں اس کا چلن رہا[1] عموماً مندرجۂ ذیل درندے اور جانور آپس میں یا ایک دوسرے سے لڑائے جاتے تھے،

شیر، چیتا، تندوا، ہاتھی، اونٹ، گینڈا، بیل، بھینا، بارہ سنگھا، مینڈھا وغیرہ،

ان کھیلوں کے ضمن میں مخصوص الفاظ یا اصطلاحات بہت کم ملتی ہیں، فیل کے ساتھ آنکس ایک عام لفظ ہے، لڑائی کے میدان کے حلقہ کو ٹھاٹھر کہا جاتا ہے جسے انگریزی میں (Ring) کہتے ہیں،

پرندوں کی لڑائی:۔ درندوں کی لڑائی بادشاہوں، امیروں اور رئیسوں تک محدود تھی، عوام کو اس خونخوار جنگ سے کوئی دلچسپی نہ تھی، لیکن پرندوں کی لڑائی کا شوق امیر و غریب دونوں کو تھا، لکھنؤ میں خصوصاً پرندوں کی لڑائی سے دلچسپی لی گئی، وہاں عموماً مندرجۂ ذیل پرندے آپس میں لڑائے جاتے تھے،

مرغ، بٹیر، تیتر، لوا، گل دم، لال، کبوتر، توتا،[2]

مرغ بازی کا شوق ہندوستان میں عموماً لکھنؤ میں خصوصاً اس قدر عام ہو گیا تھا کہ

---

[1] مولف ظفر الرحمٰن دہلوی، فرہنگ مذکورہ، جلد ہشتم،

شعراء نے بھی اسے موضوعِ سخن بنایا، انشا کی نظم مرغ نامہ خصوصاً بہت دلچسپ ہے۔ اس شوق کی بدولت اردو زبان میں بہت سی اصطلاحات وجود میں آئیں، خود مرغ کی رنگت کے لحاظ سے مندرجہ ذیل قسمیں بنائی گئیں،

پھل سرا، ستیا، تمولیا، جلالاکھا، چتلا، چنیا، بھیلیا، سبزا، طاؤسی، ادوبا، حنایا، بھوریا، لکھوریا، مہندیا، لوزی، کیسری وغیرہ۔[1]

ساخت کے لحاظ سے مرغ کی مندرجہ ذیل قسمیں بنائی گئیں،

پتیل گردنا، پھل سرا (پھول سرا)، تاج ڈھلا، کج کلغا، سخت خاما، سخت پرا، کنول دُمہ، گھر دمہ، گھا گھس وغیرہ،

مرغ بازی کے ضمن میں کچھ دلچسپ اصطلاحات بھی بنیں جن میں چند کا ذکر نیچے کیا جاتا ہے،

اصیل مرغ، گوشت سے بھرا ہوا،

قشقہ، مرغ کے ماتھے پر کلغی کے ابھار کی علامت،

پانی، جب مرغ لڑتے لڑتے تھک جاتے ہیں تو فریقین کی متفقہ رائے سے انھیں تھوڑی دیر کے لئے اٹھا لیا جاتا ہے، یہ اٹھا لینا مرغ بازی کی اصطلاح میں پانی کہلاتا ہے،[2]

بھوئی، مرغ کو پانی کی بھمار دی جاتی ہے، اسے بھوی کہتے ہیں،

مرغ کے تعلق سے دو دو چونچیں ہونا مشہور اور عام محاورہ ہے،

دو دو چونچیں ہونا، مرغ کی ایک ہی ٹانگ، مرغ انداز بھی ایک محاورہ ہے، یعنی وہ لقمہ جس کو چبائے بغیر نگل جائیں، مرغ بانگ نہ دے گا، تو کیا صبح نہ ہوگی، مرغ خانہ ہوگا تو کیا اذان

---

[1] (مولانا) عبد الحلیم شرر لکھنوی، گذشتہ لکھنو، [2] ایضاً، ص ۲۰۶،

نہ ہوگی اور مرغے کی ایک ٹانگ مشہور مثلیں ہیں،

پرندوں میں سب سے دلچسپ لڑائی بٹیر کی ہے، بٹیر کی دو قسمیں ہیں، گھاگھس اور چنگ، بٹیر کو رکھنے کے لئے نفیس کابکیں بنائی گئیں،

بٹیر کی ترقی کے تین دور ہیں، نیا بٹیر جو پہلے پہل مانوس کرکے لڑایا جاتا ہے، اگر وہ بہت سی لڑائیوں میں جیت جاتا ہے تو لڑائی کی فصل ختم ہونے کے بعد اسے پنجرے میں بٹھا دیا جاتا ہے، وہ پرانے پر جھاڑ کے نئے پر نکال لاتا ہے اسے کر بٹھانا کہتے ہیں، دوسرے سال اس کی ترقی کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے، اسے نوکار کہتے ہیں، تیسرا سب سے اعلا دور کریز کہلاتا ہے،[1]

بعض لوگ اپنے بٹیر کو کوئی نشے والی چیز کھلا دیتے ہیں اور وہ دیوانہ وار حریف سے لڑتا اور اسے بھگا کر دم لیتا ہے، اسے کیف کا کھیل کہا جاتا ہے،[2]

بٹیروں کے نام بھی دلچسپ رکھے جاتے تھے، جیسے رستم، سہراب، شہرۂ آفاق وغیرہ،[3]

بٹیر لڑانے والے کو بٹیر باز کہا جاتا ہے، اور بٹیر کی بازی کو بٹیر لڑانا کہتے ہیں،

بٹیر کو پالی میں لانے سے پہلے پانی میں بھگو بھگو کر گھنٹوں ہاتھوں میں دبائے رکھنے سے اس کی وحشت دور ہو جاتی ہے، یہاں تک کہ وہ بولنے اور چونچیں مارنے لگتا ہے، اس عمل کو موٹھیا موٹھ کرنا کہتے ہیں، اس کے بعد دست آور اجزا دے کر اس کا جسم درست کیا جاتا ہے، پھر رات گئے یا آدھی رات کو اس کے کان میں چلا کر "کو" کہا جاتا ہے، اسے کوکنا کہتے ہیں[4] اسے بٹیر کا جگانا بھی کہا جاتا ہے[5]

بٹیر بازی کے ضمن میں ایک اور دلچسپ محاورہ ہے، بٹیر کا بہ جانا، جس سے مراد دانے کی کمی کی وجہ سے بٹیر کی حالت خراب ہو جانا ہے۔

---

[1] مولانا عبدالحلیم شرر لکھنوی، گذشتہ لکھنؤ، ص ۲۱۰، [2] ایضاً ص ۱۱ - ۲۱۰، [3] ایضاً ص ۲۱۱، [4] ایضاً ص ۲۰۹، [5] جلال لکھنوی، سرمایۂ زبان اردو۔

کبوتر کا شوق آدمی کو ہمیشہ سے رہا ہے، اس کی قسمیں بہت زیادہ ہیں، نیچے چند قسموں کے نام لکھے جاتے ہیں،

گرے، گرہ باز، حبری، کابلی، شیرازی، گگی، نسادرہ، جویا، چندن، سبز، مکھی، شستر، طاؤسیے، گل بوٹیے، لگوے، جوگیے، زرچے، گل آنکھ، لال آنکھ، اودے، زردے، کابرے، سیابی، گھگر، تمبوے، پان لال، اگرئی، سرمئی، عنبری، نگسی، کاسنی، لوٹن، مارواڑی، باہو وغیرہ،

کبوتر بازی امرا اور عوام دونوں کے لئے تفریح کا سامان ہونے کے علاوہ اردو شاعری کی رمزیہ علامات میں سے ایک علامت ہے، غزل گو شعرا نے اس کو عاشق کے نامہ بر کی حیثیت دی ہے،

کبوتر نے اردو کو چند محاورے بھی دیے ہیں، مثلاً کبوتر اڑا دینا، کبوتر تباہ ہونا، کبوتر کا گو بجنا، کبوتر مارنا وغیرہ،

دوسرے پرندوں کی لڑائی میں کوئی خاص بات نہیں، لوا، چھوٹے قسم کا تیتر ہے، اور بٹیر سے بھی چھوٹا ہوتا ہے، گل دم بلبل سے ملتا جلتا، لیکن اس سے مختلف پرندہ ہے، اس کی دم کے نیچے ایک سرخ گل ہوتا ہے، اسی لئے اس کا یہ نام پڑا،

توتا عام پرندہ ہے اور اپنی توتا چشمی کے لئے مشہور ہے، توتے کی طرح رٹنا اور رٹ لینا بھی عام محاورہ ہے،

پتنگ بازی:۔ پتنگ بازی ہندوستان کے عوام کا ایک دلچسپ مشغلہ ہے، جدید تہذیب کے اثر سے بھی اس میں کمی نہیں ہوئی ہے، ملک کے ہر گوشے میں اس کا رواج ہے، تماشائی بھی اس سے خاص دلچسپی لیتے ہیں،

پتنگ ترقی کے مختلف مدارج سے گذری ہے، اس کا ابتدائی نام چنگ تھا، پھر وہ تکل کہلائی، اعلیٰ درجہ کی تکل پتنگ کے نام سے مشہور ہوئی، لکھنؤ میں گڈی کی ایجاد ہوئی،

ڈیڑھ کنا جو آگے چل کر کنکوا بن گیا، پتنگ ہی کی ایک شکل ہے۔[1]

پتنگ بازی کے شوق کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ پتنگ کی بیسیوں قسمیں وجود میں آئیں، اور ان کے دلچسپ نام رکھے گئے، نیچے ان ناموں کی ایک منتخب فہرست دی جاتی ہے،

دو پلکا، دو باز (دو رنگے بازوؤں کی پتنگ)، دو بینا، کلیجہ جلی (بیچ کا حصہ سیاہ)، مانگ دار، نعل دار، گنڈیری دار، بگلا (سفید رنگ)، کل دمہ (نیچے کا حصہ سیاہ)، کل سرا، لل دمی، الفن، بمبا، چڑا، بھیڑیا، للپرا، لنگوٹیا، پہاڑیا (بڑی قسم کی پتنگ)، ابلقہ، گلہریا، دودھایا، خربوزیا، دوکونیا، گلسرا، جب، چوگھڑا، ککڑی، کج کلاہ، جمدھر، چاند تارا وغیرہ،

پتنگ کی ساخت کی چند چیزوں کے نام بھی جو خاصے دلچسپ ہیں، حسب ذیل ہیں،

پیندی، بان، جڑا، جھل جھل، بیچی، کانپ، کنے وغیرہ،

پتنگ کی نسبت سے بہت سی اصطلاحات بھی بن گئی ہیں، جن میں سے چند نیچے لکھی جاتی ہیں[2]

پتنگ بڑھانا،	پتنگ کو ہوا میں بلند کرنا،
پتنگ ڈھا دینا،	بڑھے ہوئے پتنگ کو گرا دینا،
پتنگ ڈھا جانا،	پتنگ کا بے قابو ہو کر گر جانا،
پتنگ ملانا،	لڑاتے وقت ایک پتنگ کا دوسرے پتنگ کے برابر کرنا،
دھری پکارنا،	شکست جتانے کی آواز،
کنیا میں لگنا،	پتنگ کا ایک طرف کو جھکنا،
ٹھمکی دینا،	ایک خاص انداز سے پتنگ کی ڈور سے جھٹکے دینا،
ڈال پیچ ہونا،	دو پتنگوں کا باہم لپٹ کر زمین پر گر پڑنا، دو پتنگوں کا آپس میں لپٹ جانا
غبارہ بازی،	شمالی ہندوستان میں کاغذ کے غبارے بنا کر ہوا میں اڑاتے تھے،

[1] مولانا عبد الحلیم شرر لکھنوی، گذشتہ لکھنؤ ص ۲۰۱، ۲۰۳ [2] ڈاکٹر محمد عمر، اٹھارہویں صدی میں ہندوستانی معاشرت ص ۲۴۰ بحوالہ محمد رام مخلص، مرات الاصطلاح

کبھی کبھی ان میں زندہ جانور رکھ کر بھی اڑاتے تھے۔ اس غبارے کو کرم شب چراغ کہا جاتا تھا۔

آتشبازی:۔ آتش بازی جنگی بارود اور اسلحہ کا شاخسانہ ہے۔ لیکن اب محض لہو ولعب یا تفریحی مشغلہ بن کر رہ گئی ہے۔ اس کی اقسام سے اس کی مقبولیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ جیسے آتشبازی دیدۂ ودل کی خوشی کا باعث ہوتی ہے، اس کے نام فردوس گوش ہیں۔ ذیل میں چند نام دیئے جاتے ہیں:

آفتابی مہتابی (مہتاب) سورج مکھی، چندر مکھی، انار، آتشی انار، اڑن انار، آتشی پرکالا، آتشی قلم، اگن (راگنی) بان، اگن بجرا، اگن پنکھ، اگن چرخ، اگن چادر، اگن چکر، اگن چھری، اگن گولا، اگن ہنڈولا، غبارہ، ہوائی برج، جوت، پٹاخا، اڑن پٹاخا، اڑن گولا، تارا منڈل، کلسیا، ہتھ پھول، گلکاری، گھن چکر، چھچھوندر، ہاتھی، مور، ستارے، پھلجھڑی، گگریز، گلنار، جاے جوئے، گھرٹی وغیرہ۔

میر حسن نے اپنی ایک مثنوی "شادی آصف الدولہ" میں روشنی کا سماں دکھانے کے بعد آتشبازی کا نظارہ یوں دکھایا ہے:

بیچ میں جب اس کے چھٹتے تھے انار	نور کی سی لہر تھی فوارہ دار
ہاتھی آتشبازی کے چھٹتے تھے جب	نور کو ظہور تھا نظروں میں تب
مور اس کے اس میں چھوٹے اس نمط	چھوٹتی ہیں جس طرح دریا میں بط
جس کو گھن چکر کہے ہیں وہ نہ تھا	وجد میں آتش کا دل تھا برملا
بسکہ چھٹتے تھے ستارے بے شمار	آسماں کی سی زمیں پر تھی بہار
پھلجھڑی، ہتھ پھول، گگریز اور انار	کرتے جاتے تھے طبق گل کے نثار

جس طرف جاتی تھی واں اپنی نگاہ | جوشِ گلناری سے باقی تھی نہ راہ
نصرتی نے بھی گلشن عشق میں آتش بازی کا سماں دکھایا ہے، جو حسب ذیل ہے،

دیوے نور تے مہ کو مہتاب داغ | سو کاڑے چندر جوت تاریاں کا باغ
ہوایاں کی منڈرے جو چوندھر چھوٹے | ہوا پر سو جا کر ستارے ٹوٹے
نلی اوڑھ بلندی میں ایسا چلے | فلک کی کمر کے سو منکے ڈھلے
گھڑی بازی جب غل کرے جوش کی | ٹلے ہوش افلاک کے گوش کی
دھرے پیچ جب ناؤ سوں گھن چکر | بجک بجلی ہو رہیا گھن چکر

جھولا یا ہنڈولا: ہندوستان میں برسات کا موسم بڑا خوشگوار اور کیف آگیں ہوتا ہے، اس موسم میں لڑکیاں اور عورتیں بڑے شوق اور امنگوں کے ساتھ جھولا جھولتی ہیں، ساون کے مہینے میں خصوصاً جھولے کی جنبش تیز ہو جاتی ہے، کیونکہ اسی مہینے میں ہریالی تیج کا تہوار منایا جاتا ہے، شیر علی افسوس نے جھولا جھولنے کی تصویر اس طرح سے کھینچی ہے "تھم جا بجا گڑے ہوئے، جھولے پڑے ہوئے، ہنڈولے کھڑے ہوئے، ان میں رنگ برنگ کی پوشاکیں پہنے ہوئے سیکڑوں پڑی پیکریں جھولتیاں ہیں، کوئی پینگ چڑھا رہی ہے، کوئی ہنڈولا لگا رہی ہے، کوئی پاؤں جوڑ کے کسی کے ساتھ جھولتی ہے، کوئی کسی کا دل لے کر جھولتی ہے۔[1]

ساون میں بیاہی لڑکیاں عموماً اپنے نیہر آجاتی ہیں (مولانا) محمد حسین آزاد نے "آب حیات"[2] میں مندرجہ ذیل گیت نقل کیا ہے، گیت ایک ایسی لڑکی کی زبان سے ہے جو گویا اپنی سسرال میں ہے اور اب ساون آجانے کی وجہ سے نیہر آنا چاہتی ہے،

اماں میرے باوا کو بھیجو جی | کہ ساون آیا،

---

[1] آرائش محفل ص ۱۴۷ [2] بار دوازدہم ص ۳،

بیٹی، تیرا باوا تو بڈھا ری   کہ   ساون آیا

اماں میرے بھائی کو بھیجو جی   کہ   ساون آیا

بیٹی، تیرا بھائی تو بالا ری   کہ   ساون آیا

اماں میرے ماموں کو بھیجو جی   کہ   ساون آیا

بیٹی، تیرا ماموں تو بانکا ری   کہ   ساون آیا

روزانہ کے کھیل: اوپر جن کھیلوں یا تفریحوں کا ذکر ہوا، وہ ایک مخصوص طبقے سے تعلق رکھنے کے علاوہ وقتی ہیں، یعنی خاص خاص مواقع یا موسم سے تعلق رکھتی ہیں، لیکن بہت سے کھیل ایسے ہیں جو سال کے بارہ مہینے کھیلے جاتے ہیں، اور ہر طبقے میں پسند کئے جاتے ہیں، ذیل میں چند ایسے کھیلوں کے نام دیئے جاتے ہیں، جو گھر سے باہر کھیلے جاتے ہیں، یا دوسرے لفظوں میں مردانہ کھیل ہیں:

گلی ڈنڈا اور کبڈی ہندوستان کے عام کھیل ہیں، دونوں دیہات کے بڑے مقبول کھیل ہیں، ہار جیت دو عام لفظوں کے علاوہ داؤ، بازی، بدنا، بدانا وغیرہ اصطلاحی الفاظ بھی عام ہیں، کبڈی میں پالا اور مرجانا عام اصطلاحیں ہیں، پالا مارنا مشہور اور عام محاورہ ہے جو یہیں سے بنا ہے، کبڈی کھیلتے پھرنا بھی عام محاورہ ہے۔

بعض علاقوں میں کبڈی سے ملتا جلتا ایک کھیل کھیلا جاتا ہے، جسے تو تو کہتے ہیں، یہ بھی اردو میں جذب ہو چکا ہے۔

انگریزوں کے ساتھ کرکٹ، ہاکی، فٹ بال، والی بال، باسکٹ بال، ٹینس وغیرہ آئے یہ سارے نام اردو نے بجنسہ اپنے اندر جذب کر لئے، اور اب یہ اردو الفاظ بن چکے ہیں، ان کھیلوں کے ضمن میں جو اصطلاحی الفاظ انگریزی میں مستعمل ہیں، وہ بھی اردو نے اپنا لئے ہیں، مثلاً مندرجہ

مندرجہ ذیل الفاظ ہر اردو داں کی زبان پر ہیں،

بیٹ، بال، وکٹس، ورتیج، کریز، امپائر، اپیل، بولڈ، کیچ، رن آوٹ، ال، بی، ڈبلو، اوور، باونڈری، فیلڈنگ، فیلڈر، گول، گول کیپر، گوملی، کپتان، رفری، تشٹ، ریکٹ وغیرہ۔

مذکورہ بالا کھیل جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے، گھر سے باہر کھیلے جاتے ہیں، مندرجہ ذیل کھیل گھر کے اندر کھیلے جاتے ہیں،

شطرنج، چوپڑ، پچیسی، نرد، چوسر، گیان چوسر، اٹھا بچیا، لوڈو وغیرہ،

شطرنج مہذب طبقے کا بڑا مقبول کھیل ہے، ایک نقشے پر کھیلا جاتا ہے، جو کاغذ یا کپڑے پر بنا ہوا ہوتا ہے، اسے بساط کہتے ہیں، اسی سے بساط الٹنا محاورہ ہے، جو مشہور اور عام ہے، اس کے لفظی معنی ہیں کھیل ختم ہونا، اور مفہوم ہے دن پھر جانا یا انقلاب آنا، شطرنج کا مہرہ بھی عام محاورہ ہے،

ان کھیلوں میں سے اکثر کو بزم سخن میں بھی جگہ ملی ہے، مصحفی نے شطرنج کو ردیف بنا کر پوری غزل کہی ہے، انشا کا ایک شعر ہے،

ان کے ساجھے میں جو ہم ہارے تو یوں لگے کہنے لاؤ پانسے وہ ادھر کھیلو گے چوپڑ پھر

انگریز اپنے ساتھ ٹیبل ٹینس یا پنگ پانگ لائے۔

بچوں، اور بچیوں کے گھریلو کھیل بھی دلچسپ ہوتے ہیں، اور ان کے نام بھی، ان کی قسمیں بھی زیادہ ہیں، نیچے ان کھیلوں کے ناموں کی ایک منتخب فہرست دی جاتی ہے،

آنکھ مچولی، اٹکن مٹکن، ادن پدن، اروں گھروں، بھوا بھیرا، بھل بھول، جھائیں مائیں، چکر پھیری، چک پھیری، چیل جھپٹنا، چنڈول گدا گر بول، ست گھرا، کالی بیلی ڈلو، کال کلوٹی، شیر بکری، یا باگ بکری، وزیر بادشاہ، کڑوا تیل بلی یا دے پھلیل وہی، بھائیں مائیں، گول گھمائیں راجا کے گھر بیٹا ہوا، پھیری آڑ دکبول آڑے، گیند بازی، چور چھپول، چھلا چھپول وغیرہ،

آخری دو کھیل ایران سے ہندوستان آئے تھے۔

نقل، کرتب وغیرہ: مذکورۂ بالا کھیلوں کے علاوہ جو آپس میں کھیلے جاتے ہیں، آدمی نے اپنی تفریح کے لئے چند اور ذرائع پیدا کئے، مثلاً نقل، لطیفہ گوئی، داستان گوئی وغیرہ، نقال جنھیں بھانڈ بھی کہا جاتا ہے، عموماً نچلے طبقے کی دلچسپی کا سامان فراہم کرتے ہیں، اسی سے ایک کھیل سوانگ اور کٹھ پتلی ہے، جسے شب بازی کہا جاتا ہے، یہ بھی ہندوستان کے عوام کی ایک مقبول چیز تھی، اسی انداز کا ایک اور کھیل تھا جو اب تقریباً ختم ہو چکا ہے، اسے بھگت بازی کہا جاتا تھا جمع باشہ اور فرقہ وار بازی بھی کرتب کا کمال دکھا کر عوام کو خوش کرتے تھے اور اپنا پیٹ پالتے تھے، لطیفہ گوئی کو کسی وقت میں ایک فن کی حیثیت حاصل تھی، لیکن اب اس کا رواج نہیں رہا، داستان گوئی ایران سے ہندوستان آئی اور کافی مقبول ہوئی، دلی کے میر باقر علی اس فن کے آخری استاد تھے، بعض شعراء نے داستان گوئی یا قصہ خوانی کو تلمیح کے طور پر استعمال کیا ہے، مثلاً

ہاں کس طرح وہ قصۂ مشو بر بگل چہ کرد
اے قصہ خواں، ادھوری نہ یہ داستاں چھوڑ
(انشا)[1]

قصہ خواں نیند جو تھوڑی سی بھی آجائے تو دو
جوڑی سونے کے کپڑوں کی تجھے خواب پہ رکھ
(انشا)

بڑے شوق سے سن رہا تھا زمانہ
ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے
(ثاقب لکھنوی)

رقص و سرود: رقص و سرود سے اولادِ آدم کو طبعاً دلچسپی ہے، شادی بیاہ اور خوشی کی دوسری تقریبات کے موقع پر اکثر رقص و سرود کی محفل جمتی ہے، مغلوں کے آخری دور میں بادشاہ جنگ پر جاتا یا امراء شکار کے لئے جاتے تو اسباب طرب ان کے ساتھ ہوتا، شعراء نے بعض امراء کی محفل طرب کا نقشہ کھینچا ہے، مثلاً محمد شاہ کے ایک امیر عمدۃ الملک امیر خاں انجام کی محفل طرب کا نقشہ تاباں نے اس طرح کھینچا ہے،

سدا صحن میں ان کے رہتا تھا رنگ
سدا تھی تو ائے دف و نے و چنگ[2]

---

[1] انشاء اللہ خاں انشا، دریائے لطافت، دردانہ دوم ص ۱۴۲۔ [2] بقیہ اشعار کے لئے دیکھئے دیوان عبدالحی تاباں۔

فنونِ لطیفہ

اولاد آدم میں کم لوگ ملیں ملیں گے جو فنون لطیفہ سے دلچسپی نہ رکھتے ہوں، تعلیم یافتہ طبقے سے لے کر ان پڑھ دیہاتی تک کسی نہ کسی درجے میں ان سے دلچسپی رکھتا اور لطف اندوز ہوتا ہے۔ فنونِ لطیفہ کی کئی قسمیں ہیں، مثلاً موسیقی، مصوری، رقص وسرود وغیرہ اپنی اپنی افتاد طبع کے مطابق ان میں سے کسی ایک سے یا دو سے یا دو سے زاید سے وہ دلچسپی لیتا ہے، چونکہ یہ فنون باقاعدہ فن کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں، اس لئے ان کی اپنی اپنی اصطلاحات ہیں، جو زبان کو مالدار بناتی ہیں، اردو زبان کا خزانہ بھی ان فنون کی اصطلاحات کے جواہر سے خالی نہیں، نیچے ان کا مختصر ذکر کیا جاتا ہے،

موسیقی:

یہ فن نشاطِ روح کا سامان مہیا کرتا ہے اس کی دو قسمیں ہیں، ایک آواز کے ذریعے موسیقی اور دوسری مزامیر کی موسیقی، مزامیر پہلی قسم کی موسیقی میں بھی لازمی طور سے استعمال ہوتے ہیں، مزامیر کی دو قسمیں ہیں، ان کی ایک منتخب فہرست نیچے دی جاتی ہے، مزامیر کے یہ نام ادبی حیثیت سے دلچسپ ہیں،

پکھاوج (پکھواج) مردنگ، ڈھولک، ڈھول، مجیرا، تاشا، دف، دفلی، طبلہ، نوبت، نقارہ، دھونسا، دمامہ، ترہی، قرنا، نفیری، اک تارا، دوتارا، بلبل ترنگ، جل ترنگ، بربط،

چنگ، رباب، بیلا، بین، چکارا، دل ربا، سرود، قانون، قانونچہ، طنبورہ، ستارہ، سارنگی، سرنا، شہنا، شہنائی، بانسری، طاؤس، عود وغیرہ۔

ان مزامیر میں سے بعض کی کئی قسمیں ہیں۔ مثلاً

بین:

مگ بین، مور بین، مہاتی (مہتی) بین، رودرا بین،

ستار:

طاؤس ستار، سر بہار ستار، طرحدار ستار،

انگریزی باجوں نے بھی اہل ہند کو متاثر کیا، مندرجۂ ذیل باجوں کے نام سے ہر اردو داں واقف ہے:

ہارمونیم، پیانو، وائلین، گیتار، بگل وغیرہ،

اردو طائفے کے ساتھ انگریزی بینڈ اور آرکسٹرا بھی اردو میں جذب ہو چکے ہیں۔

شعرا نے بھی مذکورۂ بالا آلاتِ موسیقی کی مدد سے اپنی سجائی ہوئی بزم طرب میں رنگینی و مستی پیدا کی ہے، مثلاً میر حسن نے سحر البیان میں ایک موقع پر یوں جوئے عشرت بہائی ہے،

لگے بجنے قانون و بین و رباب	بہا ہر طرف جوئے عشرت کا آب
لگی تھاپ طبلوں پہ مردنگ کی	صدا اونچی ہونے لگی چنگ کی
کمانچوں کو سارنگیوں کو بنا	خوشی سے ہر اک کی تربیں ملا
لگا تار پر موم مرچنگ کے	ملا سر طنبوروں کے یک رنگ کے
ستاروں کے پردے بنا کر درست	بجانے لگے سب دے جالاک و چست
گئی بین کی آسمان پر کمک	اٹھا گنبدِ چرخ سارا دھمک

فن موسیقی پر نثر اور نظم دونوں میں مستقل کتابیں لکھی گئی ہیں، اس طرح سیکڑوں راگوں، راگنیوں اور پتروں کے نام اردو الفاظ کے ذخیرے میں داخل ہو گئے ہیں، بعض راگوں، راگنیوں اور پتروں کے نام خاصے دلچسپ ہیں، ان کی ایک منتخب فہرست نیچے دی جاتی ہے،

بھیروں، بھیروی، بلاولی، سرستی، دھناسری، ہنڈول، بسنتی، مری راگ، دیپک، راحکلی، میگھ ملار، کافی، للت، ایمن بلاول، بنگلا، ہریاول، انندی، آنند، بسنت، اوجل تارا وغیرہ،

مختلف مزامیر اور متعلقات موسیقی کی بنیاد پر چند محاورے اور مثلیں بھی بن گئی ہیں جیسے

محاورے:

نوبت بجنا، ڈنکا بجنا، ڈنکے کی چوٹ بات کہنا، بے وقت کی راگنی، بے وقت کی بھیرویں، خالی ڈھول پیٹنا، ملھار گانا، چین کی بانسری بجانا وغیرہ،

مثلیں:

بھینس کے آگے بین بجائے بھینس بیٹھی پگرائے، جہاں بجتے ہیں نقارے وہیں ماتم بھی ہوتے ہیں، اپنی اپنی ڈفلی اپنا اپنا راگ وغیرہ،

موسیقی کے متعلقات بھی ادبی حیثیت سے دلچسپی کا باعث ہیں، نیچے چند متعلقات کے نام لکھے جاتے ہیں،

بارہ تالی	مجیرے بجانے والی یا مجیرے بجا کر گانے والی عورتیں،
برگ نواز	جھانجھ بجانے والے جو باجا بجانے والی ٹولیوں میں دوسرے باجوں کے ساتھ بجاتے ہیں،
بھرٹیتیاں	تاشا، نقارہ وغیرہ بجانے کی چوب،
بھائی	دل پسند موسمی گیت،
تارکش	سارنگی یا ستار کے تاروں کی گھونٹیاں،

گھاٹ — طبلے کی آٹھ طنابوں میں سے ہر ایک طناب،

میدان — طبلے کا درمیانی حصہ جس پر ہتھیلی کی تھاپ لگائی جاتی ہے،[1]

موسیقی نے جہاں طرح طرح کے راگ پیدا کئے وہیں ادبی اصطلاحیں بھی بنائیں اور یہ خاصہ عجیب ہیں، مثلاً

توڑا — ناچنے والے کا گت میں تال کے اوپر پیر کے گھنگھرو بجا کر ساز کے ساتھ ہم آہنگ ہونے کا اشارہ،

جھونک، — طبلے پر تھاپ کا خاص اشارہ،

دمہ، ترخٹا (طنطنہ) — نقارے کا دایاں طبل بائیں طبل سے بڑا ہوتا ہے، اس کی آواز کو اصطلاحاً دمہ اور بائیں طبل کی آواز کو ترخٹا کہتے ہیں،

مہرہ — ایک ٹھیکے سے دوسرے ٹھیکے تک طبلے پر ترتیب دار تھاپ،

زیر و بم — نقارے کی جوڑی کا دایاں اور بایاں، سیدھے ہاتھ کی طرف کا طبل بم اور الٹے ہاتھ کی طرف کا طبل زیر،

آس یا جھونک — ساز کے سروں کی مجموعی یا منفرد آواز، ساز کے تاروں کی جھنکار جو چھیڑنے سے پیدا ہو،

بیل — گانے بجانے والے کا انعام جو مقررہ اجرت کے علاوہ دیا جائے،

پردا — ساز کے سر کی آواز کا مقام عموماً اور ہارمونیم یا اسی قسم کے ساز میں سر کا گھر یا ڈھکن خصوصاً پردا کہلاتا ہے،

سایا بجانا، سہانا بجانا، شادیانے بجانا،

شماع — ستار یا سارنگی کی طربوں کی گونج یا جھنکار جو باج کے تاروں کو چھیڑنے سے گونجتی ہے،[2]

---

[1] ظفر الرحمٰن دہلوی، فرہنگ مذکور، جلد چہارم [2] ایضاً،

مصوری:

مصوری دوسرا فن لطیف ہے، جو آدمی کی دلچسپی اور توجہ کا باعث ہے، اس کے ذریعے بھی اردو الفاظ کے ذخیرے میں اضافہ ہوا ہے، ذیل میں مصوری کی چند دلچسپ اصطلاحات دی جاتی ہیں[1]

آسمان — کسی تصویر کا پس منظر،

پروانہ بھر مٹ، — SHAD۔ تصویر میں اس کے کسی حصے کی پرچھائیں، خو خطوں یا رنگ کے اتار چڑھاؤ سے ظاہر کیا جاتا ہے، جس سے وہ حصہ بخوبی واضح ہو جاتا ہے،

پچ پرچھیاں — تصویر کی رنگ آمیزی کے بدنما داغ دھبے جو رنگ کی خرابی یا کسی اور وجہ سے پڑ جاتے ہیں

پچھوڑا، — تصویر کے رنگ کے دھبوں کو درست یا اس کی رنگ آمیزی کرنے والا ماہر شخص،

دو محلا: — ایک چوکٹے میں آمنے سامنے بنی ہوئی دو تصویریں،

زبر دست — مصوروں کا مشقی تختہ یا مقوی جس پر وہ رنگوں کی تیاری کا نمونہ اور تصویر میں بھرنے کی مشق کر کے دیکھتے ہیں،

رنگ گھلانا — تصویر میں رنگ کو یکساں کرنا،

قلم کاری — تصویر میں حسب موقع رنگ بھرنے کا عمل،

گردہ، سیاہ قلم — نہایت باریک مدور اور سنجی خطوں سے تیار کیا ہوا خیالی حلیہ،

---

[1] ظفر الرحمن دہلوی، فرہنگ مذکور، جلد چہارم،

اردو زبان کی چند مزید خصوصیات

اردو زبان کا مکمل ڈھانچا اُس وقت بنا جب ملک کی تہذیب پر ایرانی تہذیب کے اثرات نمایاں اثر ڈال چکے تھے۔ اردو نے بھی یہ اثر قبول کیا، اوپر جو کچھ لکھا گیا ہے، اس میں اس کی وافر مثالیں موجود ہیں، یہاں کچھ مزید مثالیں پیش کی جاتی ہیں،

علمی طبقے میں عربی اور فارسی کا اثر زیادہ تھا، رفتہ رفتہ عوام نے بھی اس اثر کو قبول کیا، مثلاً مندرجۂ ذیل دعائیہ کلمات کا استعمال اب عام ہے،

ا: زندوں کے لئے:

بارک اللہ، جزاک اللہ، کان اللہ، شاباش وغیرہ،

ب: مردوں کے لئے:

مرحوم، مرحوم و مغفور، رحمہ اللہ، رحمۃ اللہ علیہ، رضی اللہ عنہ، رضی اللہ تعالیٰ عنہ، نور اللہ مرقدہٗ، غفرلہٗ، عفی عنہ وغیرہ،

عام الفاظ کا شستہ استعمال:

تہذیب و شائستگی کے زیر اثر ایسے الفاظ کم کم خرچ میں جن کو سن کر طبیعت پر اچھا اثر نہ پڑے یا جس شخص کے متعلق وہ الفاظ استعمال کئے جائیں، ان سے اسے تکلیف پہنچے اس قسم کے الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں، جو طبیعت پر اچھا اثر ڈالتے ہیں، مثلاً،

بیوہ	مالن، سہاگن،
نابینا	حافظ جی، سورداس،
نہایت ناکامیاب،	بختاور،
منحوس،	سبز قدم،
کند ذہن،	خوش فہم،
نامعقول عذر،	عذر لنگ،
حقیر تحفہ،	برگ سبز،
شراب پینا،	پھول پینا،
برص کے داغ،	پھول،

اس کے برعکس بعض اوقات طنزاً اچھے الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں، جیسے

بیت الخلا،	قمارخانہ، قید خانہ،
دختر آفتاب	شراب،
ثالث بالخیر	ولد الزنا،
مبیح خیزے	چور، گرہ کٹ،
نذر،	رشوت،
آب حیات	شراب،
رام رنگی،	شراب،
گل دلار،	طوائف، ارباب نشاط،
صلواتیں سنانا،	گالی دینا،

لن ترانی — ڈینگ،

اوزبک — احمق، پھوہڑ،

نچلے طبقے کی دلجوئی اور دلداری کے لیے شستہ الفاظ تراشے گئے، مندرجۂ ذیل الفاظ ہر خاص و عام کی زبان پر ہیں،

بھنگی — مہتر، حلال خور، جمعدار، پہلوان،

بھنگن — مہترانی، حلال خوری، جمعدارن

حجام — اصلاح ساز، خاص تراش، کملا ٹھاکر،

کمہار — بھگت جی،

دہاتی — چودھری،

بھیک منگا — سائیں،

ایسے الفاظ کے لئے جن کو سن کر کراہیت پیدا ہو شستہ الفاظ گھڑے گئے، مثلاً

سنڈاس — بیت الخلا، طہارت خانہ، ٹٹی، جائے ضرور،

پاخانہ لگنا — حاجت ہونا،

پاخانے جانا — فارغ ہونا،

پیشاب — استنجا،

سنڈاس کے ساتھ قدمچہ اور فیل پایہ بھی شستگی زبان کا ثبوت مہیا کرتے ہیں، فیل پایہ، قدمچے کے سامنے پانی کا لوٹا رکھنے کی ستون کی وضع کی بنی ہوئی جگہ کو کہتے ہیں،

لطافت زبان،

زبان کو تجمر نازک خیالی کہا گیا ہے، اردو میں اس نازک خیالی یا لطافت کی بہت سی

مثالیں ملتی ہیں، مثلاً،

من موہن، موہنی، گلعذار، گل اندام، سیم تن، غنچہ دہن، مہ لقا، مہ جبین، ماہرو، آتش زن،

آفتاب پرست، شہاب ثاقب، در یتیم، سنگ موسیٰ، سنگ یہود، مجمع موسیقی، شہر خموشاں وغیرہ۔

مندرجہ ذیل آتش بازیوں کے نام بھی لطافت زبان کا اچھا نمونہ پیش کرتے ہیں،

آفتابی، مہتابی، ستارے، سورج مکھی، چندر مکھی، انار، آتشی انار، پھلجھڑی، گلناری، گلکاری،

گلریز، ساون بھادوں، گل دوپہر، مرغ آتش خوار، مرغ آتش زن، ہوائی برج وغیرہ۔

مندرجہ ذیل پرندوں کے نام بھی لطیف ہیں،

مرغ زریں، سبز ک، سرخاب، بلبل، گندم، شتر مرغ، سیمرغ، شاہین، شہباز، طاؤس، ہزار داستاں،

قمری، کبک، سدا سہاگن، نیل کنٹھ، ڈومنی (بہت شور مچانے والی مٹیالے رنگ کی چڑیا) وغیرہ،

مندرجہ ذیل لفظوں کی لطافت اور ساتھ ہی معنویت جاذب توجہ ہے،

برباد، بادپا، ام الخبائث، انبساط، تلاطم، گلبانگ، گلخن، جگر گوشہ، سحر حلال، کہکشاں،

قوس قزح، لولوئے فلک (زہرہ) تہذیب، مہذب، ہری چگ وغیرہ،

بعض الفاظ اس قدر جامع اور معنی خیز ہوتے ہیں، کہ انھیں سنتے ہی پورا مفہوم سمجھ میں

آجاتا ہے، مثلاً گرد گھنٹال، حرفت باز، دلال، نانگ، شاطر عیار، خدائی فوجدار، وغیرہ بقول

احمد دین" بعض اوقات ایک ہی لفظ میں بے رحمی کا ایک مکمل ضابطۂ عمل منضبط ہوتا ہے، مثلاً

ٹکٹکی، شکنجہ، پھانسی، سولی، چار میخ اور سنگسار۔

آدمی کی بعض صفات اور کاموں کے مختلف درجات ہوتے ہیں، اردو زبان نے درجات

کے فرق کو ملحوظ رکھا ہے، جیسے چور، اچکا، اٹھائی گیرا، جیب کترا (گرہ کٹ) ڈاکو، ڈکیت، قزاق،

راہ زن، ٹھگ، سوس، نقب زن، خسیس، بخیل اور لئیم میں جو فرق ہے وہ اہل نظر سے پوشیدہ

نہیں، قسم اور حلف میں بھی نمایاں فرق ہے اور اس کے استعمال میں اہل قلم احتیاط برتتے ہیں، اختراع اور ایجاد کا فرق بھی اہل علم پر واضح ہے، اختراع میں اجزا کا وجود موہوم ہوتا ہے، ایجاد میں مختلف اجزائے موجودہ کو یکجا کر کے ایک نئی چیز بنائی جاتی ہے، اختراع کبھی کبھی من گھڑت کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے، متقابل اور متضاد کے فرق سے بھی اہل علم واقف ہیں، متقابل اشیا ایک دوسرے کی معاون ہو سکتی ہیں، متضاد اشیا باہم منافی ہیں، مثلاً شیرینی اور ترشی متقابل ہیں، اور محبت اور نفرت متضاد، مرتد اور کافر یا ارتداد اور کفر کا فرق بھی اہل علم نے ہمیشہ ملحوظ رکھا ہے، شجاعت اور تہور، دلیر اور بہادر وغیرہ کا فرق بھی اہل نظر پر واضح ہے،

اردو کی خصوصیات میں سے ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ بعض الفاظ بعض چیزوں کے ساتھ مخصوص ہیں، پنڈت برج نرائن دتاتریہ کیفی نے اس کی بہت سی مثالیں لکھی ہیں، نیچے ان میں سے چند مثالیں نقل کی جاتی ہیں:

خاص جانوروں کے بچوں کے خاص لفظ:

میمنا	بکری کا بچہ
برہ،	بھیڑ کا بچہ
پاٹھا	ہاتھی کا بچہ
پٹھا	الو کا بچہ
پلا	کتے کا بچہ
بلونگڑہ	بلی کا بچہ
بچھیرا (بچھیری)	گھوڑی کے بچے،
بچھڑا (بچھیا)	گائے کے بچے،

کٹڑا (کٹڑی)	بھینس کے بچے،
چوزا	مرغی کا بچہ،
ہرنوٹا (چکارا)	ہرن کا بچہ
سپنولا	سانپ کا بچہ
گھٹیا	[illegible] کا بچہ

خاص اجتماعوں کے لئے خاص لفظ:

طلبہ کی جماعت،

رندوں کا حلقہ،

بھیڑوں، بکریوں کا ریوڑ، گلا،

مدمکھیوں کا جھلڑ،

ستاروں کا جھرمٹ یا جھومر،

جہازوں کا بیڑا،

ہاتھیوں کی ڈار،

کبوتروں کی ٹکڑی،

درختوں کا جھنڈ،

اناروں کی کنج،

بدمعاشوں کی ٹولی،

سواروں کا دستہ،

ٹڈی دل، چیونٹی دل،

انگور کا گچھا،

گیہوں کی گٹھل،

ریشم کا لچھا،

مزدوروں کا جتھا،

فوج کا پرا،

لکڑیوں کا گٹھا،

روٹیوں کی تھئی،

کاغذوں کی گڈی،

خطوں کا طومار،

کلابتوں کی گنجی،

بالوں کا گچھا،

پانوں کی ڈھولی،

امریاں — آموں کا بڑا باغ،

فالیز — خربوزے یا کھیرے ککڑی کا بڑا کھیت[1]،

خاص شخصوں یا جانوروں کے لئے خاص الفاظ:

بادشاہ کا محل، بیگموں کا حرم، رانیوں کا رنواس، فوج کی بارک، رشی کا آشرم، صوفی کا حجرہ فقیر کا تکیہ یا کٹیا، بھلے مانس کا گھر، غریب کا جھونپڑا، بھیڑوں کا چھتا، لومڑی اور گیدڑ کا بھٹ، پرندوں کا گھونسلا، چوہے کا بل، سانپ کی بانبی، فوج کی چھاؤنی، مویشی کا کھڑک، گھوڑے کا تھان[2]۔

---

[1] دیکھیے، بار دوم ص ۳۔ ۱۰۱ [2] ایضاً، ص ۱۰۵۔

اوپر مختلف مناسبتوں سے مختلف مقامات پر بہت سی دلچسپ اصطلاحات دی جا چکی ہیں، یہاں صرف ایک پیشے، چوری، ڈکیتی، ٹھگی وغیرہ کی اور اصطلاحات دی جاتی ہیں، اس قدر گرا ہوا پیشہ لیکن اردو زبان نے یہاں بھی شائستگی کا دامن نہیں چھوڑا،

آنسو توڑ، ٹھگوں کا شگونی کلمہ، مراد بے موسم بارش، بد شگونی کی علامت،

اتار چڑھاؤ، چوروں کی اصطلاح، چوری سے پہلے سب طرح کی ہوشیاری اور دیکھ بھال،

ایک ناؤ، ٹھگوں کی اصطلاح، ہم برادری،

بھلکی، " " " سورج،

اترتی بھلکی، " " " ڈوبتا سورج،

بھول، چوروں کی اصطلاح، پوشیدہ اور سنسان جگہ جو چوری کے مشورے کے لئے منتخب کی جائے وہاں عام طور سے نشان کے طور پر پھول بنا دیا جاتا ہے،

جھڑاون، موقعِ واردات سے ٹھگوں کی فراری

چٹائی، رشوت،

سندری، دیا سلائی،

مرگ مال، ہرنوں کی ڈار دیکھنے کا شگون[1]

تاریخی الفاظ:

اردو میں بڑی تعداد میں ایسے الفاظ استعمال ہوتے ہیں جن کی تاریخی اہمیت ہے، اس اہمیت کو سمجھ لینے سے ان کا مفہوم واضح طور سے سمجھ میں آتا ہے، ایسے الفاظ کی تعداد خاصی ہے، نیچے چند الفاظ مثالاً لکھے جاتے ہیں،

---

[1] ظفر الرحمن دہلوی، فرہنگ اصطلاحات پیشہ وراں،

ہجرت، مدینہ، یار غار، غار حرا، مشائین، راجپوت، رام کہانی، دسہرہ، دیوالی، ترک تازی، مرہٹہ گردی، سکھا شاہی، وہابی، شیعہ، رافضی، خارجی، اہل قرآن، اہل حدیث، وہابی، احمدی، احرار، انتہا پسند، اعتدال پسند، نوشیروانی انصاف، چوہدری، راستبازی وغیرہ۔

مذکورہ بالا الفاظ اردو میں کثرت سے استعمال ہوتے ہیں، اور اپنے لغوی معنی سے ہٹ کر کبھی کبھی تشبیہ اور استعارے کے طور پر بھی استعمال ہوتے ہیں۔

مقامات کے تاریخی نام :

اردو میں ایسے مقامات کے نام بھی بڑی تعداد میں ملتے ہیں، جن کی تاریخی اہمیت ہے، خود ہمارے ملک کا نام بھارت اس اہمیت کا حامل ہے، مندرجۂ ذیل شہروں کی تاریخی اہمیت سے ہر اردو داں واقف ہے :

احمد آباد، اکبر آباد، تغلق آباد، شاہجہاں آباد، اورنگ آباد، احمد نگر، جون پور، مظفر پور، پرتاب گڈھ۔

ضلعوں اور شہروں کے نام :

ضلعوں اور شہروں کے نام مختلف بنیادوں پر رکھے گئے اور ہندوستان کی مختلف زبانوں سے تعلق رکھتے ہیں، لیکن بیشتر نام ایسے ہیں، جن کا اردو سے قریبی تعلق ہے، اور ان میں اردو کی شگفتگی اور دلکشی پائی جاتی ہے، مثلاً مندرجۂ ذیل نام :

ہزاری باغ، موتیہاری، چپارن، نینی تال، مرشد آباد، عظیم آباد، رائے بریلی، مظفر نگر، پنچ محل، فرخ آباد، برہان پور، دہرہ دون، بلند شہر، چالیس پرگنہ وغیرہ۔

قصبوں اور دیہاتوں کے نام :

قصبوں اور دیہاتوں کے نام کا بھی وہی حال ہے جو ضلعوں کے نام کا ہے، اردو سے قریبی تعلق

رکھنے والے نام بھی بڑی تعداد میں ملتے ہیں، جیسے،

نظام آباد، مینہ نگر، لال گنج، پھول پور، انجان شہید، خلد آباد، فرید آباد، عظمت گڑھ، بھلی شہر، دریاباد، ملیح آباد، سیتاپور، خداداد پور وغیرہ،

راستوں اور محلوں کے نام :-

قدیم زمانے میں عموماً کسی رئیس، حرفت، اہل حرفہ وغیرہ کے نام پر یا کسی اور خصوصیت کے لحاظ سے نام رکھے جاتے تھے، مثلاً مندرجۂ ذیل نام ملک کے مختلف شہروں میں ایک زمانے سے پائے جاتے ہیں،

چوک سعد اللہ خاں، امین آباد چوک، گلی قاسم جان، کوچۂ قابل عطار، کوچۂ پنڈت، جوہری بازار، گلی فروشوں کی منڈی، سبزی منڈی، دال منڈی، کٹڑا گاڑی بانان، محلہ چوڑی گران، سورتی محلہ، قالین گنج، لال کنواں، حوض قاضی، مغل سرائے، فرنگی محل، چورنگی، سورتی بازار، حسن آباد، حسینی باغ، خسرو باغ، انار کلی، کشمیری دروازہ، مہالکشمی وغیرہ،

انگریز اور انگریزی کے زیر اثر جو نام رکھے گئے، انھیں بھی اردو نے اپنے اندر جذب کر لیا، مثلاً مندرجۂ ذیل نام اردو میں بے تکلفی سے استعمال ہوتے ہیں،

الفنسٹن روڈ، جیکب سرکل، کرافورڈ مارکیٹ، سرکلر روڈ، یونی ورسٹی روڈ، ریلوے روڈ، نجار اہل، پیلے ہاؤس، پارسی کالونی، ہندو کالونی، مٹن اسٹریٹ، زکریا اسٹریٹ، شادمان مارکیٹ وغیرہ

جدید ترین نام کچھ اس انداز کے ملتے ہیں،

محسن آباد، خیریت آباد، چار قندیل، چار مینار، شارع قائد اعظم، الفلاح وغیرہ،

ہندی کے زیر اثر مندرجۂ ذیل قسم کے نام رکھے جاتے ہیں، جو اردو میں بھی مستعمل ہیں،

بہادر شاہ ظفر مارگ، نیتاجی سبھاش چندر مارگ، لال بہادر شاستری مارگ، رفیع احمد قدوائی مارگ وغیرہ،

بعض اشیا کے نام ان کے موجد کے نام پر:

بہت سی چیزوں کے نام ان کے موجد کے نام پر رکھے گئے اور وہ آج تک اسی نام سے مشہور ہیں، مثلاً،

اشرفی، اشرف ایک بادشاہ تھا،

سارنگی، محمد شاہ کے دربار کے ایک موسیقار سارنگ دیو کی ایجاد ہے،

زرجعفری، علم کیمیا کے ایک ماہر جعفر کے نام سے منسوب ہے،

بورانی، ہارون الرشید کی بیگم بوران کے نام سے منسوب ہے،

نورمحلی پلاؤ، نورجہاں بیگم کی جدت طبع کا نتیجہ ہے،

رضائی، محمد رضا نے بنائی تھی،

طفیلی، کوفے کا ایک شاعر طفیل بلا بلائے دعوتوں میں چلا جاتا تھا،

نادری حکم، نادر شاہ کے دبدبے کی طرف اشارہ ہے،

سلیم شاہی، ایک خاص وضع کی جوتی، جو شاہزادہ سلیم یعنی اکبر شاہ ثانی کی طرف منسوب ہے،

بزاخفش، اخفش ایک نحوی تھا، وہ کبھی کبھی اپنی بکری کے سامنے نحو کے مسائل بیان کیا کرتا تھا، یہ لفظ احمق کے معنی میں استعمال ہوتا ہے،

آدمیوں کے نام:

مسلمانوں میں لڑکوں اور لڑکیوں کے نام رکھنے میں عموماً دو باتوں کا خیال رکھا جاتا ہے، ایک یہ کہ وہ مبارک ہوں، اسی لئے یہ نام یا تو اللہ کی عبدیت یا اس کی کسی خصوصیت کے ساتھ ہوتے ہیں یا کسی پیغمبر یا بزرگ کے نام پر ہوتے ہیں، دوسرے یہ کہ وہ کانوں کو بھی خوشگوار معلوم ہوں، بعض اوقات تاریخ کی کسی اہم یا اچھی شخصیت کے نام پر بھی رکھے جاتے ہیں، یہ ہندوؤں کے یہاں بھی تقریباً یہی نقطۂ نگاہ ہے، یہ نام بھی ہمارے بلند اور شستہ تمدن کی عکاسی کرتے ہیں، ذیل میں

مثلاً چند نام دئے جاتے ہیں،

عبدالعزیز، عبدالرحمٰن، عبیدالرحمٰن، عبادالرحمٰن، بذل الرحمٰن، خلیل اللہ، محمد، احمد، مصطفٰے،

بلال، معاذ، عزیز، حسن، حسین، زین العابدین، جنید، بشر، بابر، ہمایوں، کامران، شاہجہاں وغیرہ

مذکورہ بالا ناموں کے علاوہ ہندوستان میں مرکب نام رکھنے کا بہت چلن ہے، مندرجۂ ذیل

نام یہاں بہت عام ہیں،

اقبال احمد، شمیم احمد، شوکت علی، مشتاق حسن، ذاکر حسین، علی محمد، علی احمد، محمد علی، محمد احمد،

محمود الحسن، محفوظ الحق، عتیق النبی وغیرہ،

عرب میں کنیت کا رواج قدیم زمانے سے ہے، جیسے رسول پاک کی کنیت ابوالقاسم تھی،

یا حضرت علیؓ کی کنیت ابوالحسن تھی، ہندوستان میں یہ کنیت اسم میں تبدیل ہو گئی اور یہاں

اس قسم کے نام رکھے جانے لگے،

ابوالقاسم، ابوبکر، ابوالحسن، ابومحمد، ابوذر، ابوالحسنات، ابواللیث، ابوالفتح، ابوتراب،

ابوہریرہ وغیرہ،

عرب میں کنیت کے علاوہ لقب کا بھی استعمال ہے، ہندوستان میں یہ لقب بھی اسم میں

تبدیل ہو گیا، مثلاً مندرجۂ ذیل ناموں سے ہر اردو داں واقف ہے،

حمید الدین، فرید الدین، محی الدین، نظام الدین، صباح الدین، عماد الدین، رفیع الدین،

صلاح الدین، ظہیر الدین، نصیر الدین، معین الدین، ضیاء الدین وغیرہ۔

ہندو مردوں کے نام:

ایشور داس، تلسی داس، ہری رام، رام چندر، لکشمن، کرشن، ہری کرشن، پرتاب، منوہر،

رام منوہر، دیا نراین، ودیا چرن، پریم چند وغیرہ،

ہندو مسلم اتحاد اور یگانگت نے ہندوؤں میں کچھ نئے انداز کے نام پیدا کئے، جیسے ہماری زبان کے مشہور محقق مالک رام صاحب کا نام ہے، اس انداز کے چند نام نیچے لکھے جاتے ہیں،

آفتاب رام، اقبال نرائن، اقبال سنگھ، بخشش سنگھ، نواب رائے، گلاب چند وغیرہ،

مسلمان عورتوں کے نام:

خدیجہ، آمنہ، عائشہ، فاطمہ، رقیہ، آسیہ، بلقیس، سارہ، سائرہ، ہاجرہ، مریم، زینب، زینت، زبیدہ، وغیرہ مسلمان عورتوں کے عام نام ہیں، کچھ ایرانی تہذیب کے زیر اثر اور کچھ افسانوی ادب سے متاثر نورجہاں، ناہید، شہربانو، گلنار، نیلوفر، درشہوار، کنیز فاطمہ، راحت جہاں، مسرت جہاں، مہ جبیں، پروین، دلشاد، فرحت، طلعت، ارجمند، افشاں، شمع، شمشاد، نجم السحر، نور الصباح وغیرہ نام رکھے جاتے ہیں،

ہندو عورتوں کے نام:

مندرجۂ ذیل نام اردو کے لئے اجنبی نہیں ہیں،

پاربتی، گوری، سیتا، دروپدی، لکشمی، شانتی، کسم، مایا، مدھوری، اوشا، پشپا، کمن وغیرہ

القاب:

آدمی میں اپنی ذات کو نمایاں کرنے کا جذبہ ہے، اس جذبے کے تحت وہ اپنے آپ کو کسی بڑی ہستی یا قبیلے یا خاندان سے منسوب کرتا ہے، مسلمانوں میں عموماً مندرجۂ ذیل القاب استعمال ہوتے ہیں،

سیدوں کے القاب:

ہاشمی، حسنی، حسینی، عابدی، جعفری، رضوی، نقوی، کاظمی، زیدی، واسطی وغیرہ۔

شیخ کے القاب:

قریشی، صدیقی، فاروقی، عثمانی، انصاری، ایوبی، زبیری وغیرہ،

مغل:

نام سے پہلے مرزا (میرزا) اور آخر میں حسبی و نسبی لقب استعمال کرتے ہیں، مثلاً، تیموری، تازک، ترکمان، قزلباش وغیرہ،

پٹھان:

نام کے آگے خان یا خان زادہ استعمال کرتے ہیں اور قبیلے کا نام اصل نام کے بعد، جیسے،
آفریدی، بنگش، درانی، شیرانی، شیروانی وغیرہ،

انگریزی اثر سے لقب کا استعمال:

انگریزی اثر سے یا انگریزی انداز کے لقب یا (SIRNAME) جو استعمال ہوتے ہیں، ان سے بھی اردو کا دامن خالی نہیں ہے، یہ القاب مختلف نوعیتوں کے ہوتے ہیں، عموماً باپ دادا کے پیشے اور وطنیت کے لحاظ سے ہوتے ہیں، مثلاً،
ڈاکٹر، انجینیر، پٹیل، نائک، ماسٹر، فقیہ، قاضی، بدایونی، دادرکر، بیام والا وغیرہ،

صنعتوں اور اہل حرفہ کے نام:

صنعتوں اور اہل حرفہ کے نام بھی اردو میں دلچسپ انداز کے مستعمل ہیں، مندرجۂ ذیل ناموں میں شائستگی اور زبان کی لطافت دونوں دیکھی جا سکتی ہیں،

زردوزی، چکن دوزی، معماری، میناکاری، منبت کاری، ملمع کاری، کاشی کاری، صیقل گری، سبزی فروشی، سادہ کاری، سواد کاری، سیم بافی، سوزن کاری کاشی کاری، سنگ تراشی، علاقہ بندی، گل فروشی، ماہی گیری، پنجہ بندی، رمالی، منجمی، قصہ خوانی، داستان گوئی، عطر ساز، آئینہ ساز، تھوک فروش، خردہ فروش، زرکار، ساہوکار، قلعی گر وغیرہ،

اردو میں انگریزی کے الفاظ:

اردو میں انگریزی الفاظ بڑی تعداد میں استعمال ہوتے ہیں۔ یہ الفاظ خالص انگریزی بھی ہیں اور انگریزی میں یورپ کی مختلف زبانوں سے بھی آئے ہیں۔ اور پر مختلف سلسلوں سے کافی الفاظ شامل اور کئے جا چکے ہیں۔ ذیل میں ان کی چند مزید مثالیں دی جاتی ہیں۔

یونانی الاصل الفاظ:

ٹیلیفون، گراموفون، فوٹو، مائکروفون، مونوگرام، نمونیا، ہپناٹیزم، ملیریا، مکینکل وغیرہ۔

لاطینی الاصل الفاظ:

الکشن، آپریشن، پکچر، پائپ، جونیر، سینیر، ایجنٹ، بس، ڈیکٹر، ٹن، ریفری، سرکس، فیکٹری، کانگریس، کانفرنس، کمیٹی، منٹ، ووٹ، وائسرائے وغیرہ۔

یونانی الاصل لاطینی الفاظ:

ڈراما، سین (SEENE)، کیمرا، کورس، تپائی، انچ وغیرہ۔

پرتگیزی اصل کے الفاظ:

الفانسو (آم) اناس، آیا (خادمہ)، بتام (بٹن) الپین، الماری، پپیا، توپیا، پاؤ، پادری، چابی، سونا، صابن، کمرا، کاجو، گرجا، گودام، میز، نیلام وغیرہ۔

ڈچ اصل کے الفاظ:

بلگ، ڈرم، گیس، گولف، وگی، برینڈی وغیرہ۔

جرمن اصل کے الفاظ:

ڈرل (کپڑا)، ٹول (کپڑا)، بریک، مگ، مسمریزم، ٹب، پیکٹ، سوچ وغیرہ۔

اطالوی اصل کے الفاظ:

آپرا، پیانو، پورٹیکو، سوڈا، لاٹری، راکٹ، لاوا، فاسیزم، ملیریا، انفلوئنزا، گبرڈین، (کپڑا) وغیرہ،

اسپینی اصل کے الفاظ:

سیگار، چاکلیٹ، ٹماٹر، فرم، کمپنی، کاگ، لانچ وغیرہ،

چند مزید الفاظ:

چند اور الفاظ جو خالص انگریزی ہیں یا مختلف ذرائع سے انگریزی میں آئے ہیں، اور اردو میں بکثرت استعمال ہوتے ہیں، حسب ذیل ہیں،

اسکاؤٹ، بیگ، ٹفن، لفٹ، کیتلی، کیک، ٹرام، جرسی، ڈائری، ٹرسٹ، فنڈ، فریم، ٹائپ رائٹر، فاؤنٹن پن، بال پن، جگ، پریس، پرنٹنگ پریس، پرمٹ، پاسپورٹ، ویزا، گیٹ، گسٹ ہاؤس، پینگ گسٹ، رائلٹی، لائسنس، لائبریرین، اسسٹنٹ لائبریرین، بس کنڈکٹر، کمپاؤنڈر وغیرہ،

مراجع و مآخذ

۱۔ آزاد، مولانا محمد حسین، آب حیات، لاہور، شیخ مبارک علی، بار دوازدہم،

۲۔ آمنہ نازلی، مرتبہ، عصمتی دسترخوان، دہلی، نیو تاج آفس،

۳۔ ابوالفضل، آئین اکبری، لکھنؤ مطبع منشی نول کشور، ۱۸۸۱ء و ۱۸۸۲ء،

۴۔ احمد دین، سرگذشت الفاظ،

۵۔ افسوس، شیر علی، آرائش محفل، دہلی، انجمن ترقی اردو ہند، ۱۹۴۵ء

۶۔ امیر مینائی، امیر احمد، امیر اللغات، حصہ دوم، آگرہ، مطبع مفید عام، ۱۸۹۲ء

۷۔ جہانگیر و میرزا محمد ہادی، تزک جہانگیری، لکھنؤ، مطبع منشی نول کشور،

۸۔ خلیق احمد نظامی، اوراق مصور، دہلی، شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، ۱۹۷۲ء

۹۔ سید احمد خاں، سر، آثار الصنادید، کان پور، نامی پریس، ۱۹۰۴ء

۱۰۔ سید احمد دہلوی، رسوم دہلی، رام پور، کتاب کار، پبلیکیشنز، ۱۹۶۵ء

۱۱۔ سید احمد دہلوی، فرہنگ آصفیہ، لاہور، مطبع رفاہ عام پریس، جلد اول، ۱۹۰۸ء
جلد دوم، ″ ″ ″ ″ ۱۹۰۸ء

۱۲۔ شرر لکھنوی، مولانا عبدالحلیم، گذشتہ لکھنؤ، نئی دہلی، مکتبہ جامعہ، ۱۹۷۱ء،

۱۳۔ صباح الدین عبدالرحمٰن، سید، ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی جلوے، اعظم گڑھ، دارالمصنفین

۱۴ - ظفر الرحمٰن دہلوی، مولوی، فرہنگ اصطلاحات پیشہ وراں، دہلی، انجمن ترقی اردو ہند، جلد اول ۱۹۳۹ء

" " " " دوم، ۱۹۴۰ء

" " " " " " سوم، ۱۹۴۰ء

" " " " " " چہارم، ۱۹۴۱ء

" " " " " " پنجم، ۱۹۴۱ء

" " " ششم، ۱۹۴۲ء

" " " " " " ہفتم، ۱۹۴۳ء

" " " " " " ہشتم، ۱۹۴۴ء

۱۵ - عبدالقیوم، ترقی زراعت، الہ آباد، ہندوستانی اکیڈمی، ۱۹۳۱ء

۱۶ - علی لطف، میرزا، گلشن ہند،

۱۷ - فیض الدین، منشی، بزم آخر، دہلی، دانش محل، طبع چہارم، ۱۹۴۵ء

۱۸ - کیفی، پنڈت برج نرائن، ا، تاتریہ، کیفیہ، کراچی، انجمن ترقی اردو پاکستان، بار دوم، ۱۹۵۰ء،

۱۹ - معین الدین احمد ندوی، مولانا شاہ، ادبی نقوش، لکھنؤ، ادارہ فروغ اردو، ۱۹۶۰ء،

۲۰ - ملا واحدی، میرے زمانے کی دلی، کراچی گلڈ، انجمن کتاب گھر، نقش ثانی،

۲۱ - میر، میر تقی میر، نکات الشعراء، اورنگ آباد، انجمن ترقی اردو، ہند، طبع ثانی، ۱۹۳۵ء،

۲۲ - نصیر الدین ہاشمی، دکنی کلچر، لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۳ء،

۲۳ - نیر الحسن، نور اللغات، لکھنؤ، نیر پریس، حصہ اول، ۱۹۲۴ء،

" دوم، ۱۹۲۶ء

" سوم، ۱۹۲۹ء

اشاعت العلوم پریس " چہارم، ۱۹۳۱ء

۲۴ - وحیدہ نسیم، اردو زبان اور عورت، دہلی، تاج پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۶۴ء

دار المصنفین کی ادبی کتابیں

مولانا شبلی کے سلسلۂ شعر العجم کے علاوہ جو پانچ حصوں پر مشتمل ہے دار المصنفین کی دوسری ادبی کتابیں یہ ہیں،

۱- شعر الہند اوّل : قیمت : ۲۰-۰۰

۲- شعر الہند دوم : " ۱۸-۰۰

۳- گلِ رعنا، ولی سے لیکر حالی واکبر تک کے اردو شعراء کا بہت مکمل تذکرہ (مولفہ مولانا سید عبد الحئی) قیمت ۲۲-۰۰

۴- اقبال کامل، اقبال کے کلام کی خوبیوں کی تفصیل کے ساتھ اُن کی شاعری کے اہم موضوعات، فلسفۂ خودی، فلسفۂ بیخودی وغیرہ کی تشریح، (مولفہ مولانا عبد السلام ندوی)، قیمت ۱۶-۰۰

۵- انتخابات شبلی: شعر العجم اور موازنہ کا انتخاب (مرتبہ مولانا سید سلیمان ندوی) قیمت ۱۰-۰۰

۶- کلیاتِ شبلی اردو قیمت ۵-۰۰

۷- مکاتیب شبلی اوّل و دوم قیمت ۱۲ و ۱۰ روپیہ

۸- مقالات عبد السلام: مولانا عبد السلام ندوی کے چند ادبی و تنقیدی مضامین اور تقریروں کا مجموعہ قیمت ۲۱

۹- مقالاتِ احسان: اعظم گڈھ کے مشہور ادیب و نقاد و شاعر مرزا احسان احمد علیگ وکیل کے ادبی و تنقیدی مضامین کا مجموعہ، قیمت -،

۱۰- شعر العجم حصہ پنجم: اس میں فارسی زبان کی عشقیہ، صوفیانہ اور اخلاقی شاعری پر تنقید و تبصرہ ہے، قیمت ۱۰-۰۰

۱۱- غالب مدح وقدح کی روشنی میں: غالب پر اب تک جو کچھ لکھا جاچکا ہے، اس پر ناقدانہ تبصرہ، قیمت اوّل ۲۰-۰۰ قیمت دوم ۱۵-۰۰ (مولفہ: سید صباح الدین عبد الرحمن)

۱۲- مرزا مظہر جانجاناں: مرزا مظہر جانجاناں کے سوانح خیالات و کمالات کے ساتھ ان کی تمام تصانیف کا تعارف اور اُن کے فارسی و اردو کلام پر تبصرہ، مولفہ جناب عبد الرزاق قریشی، قیمت: ۱۲-۰۰

منیجر دار المصنفین